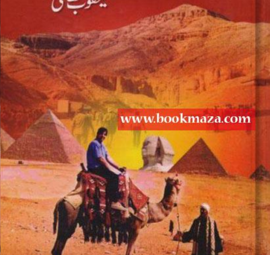
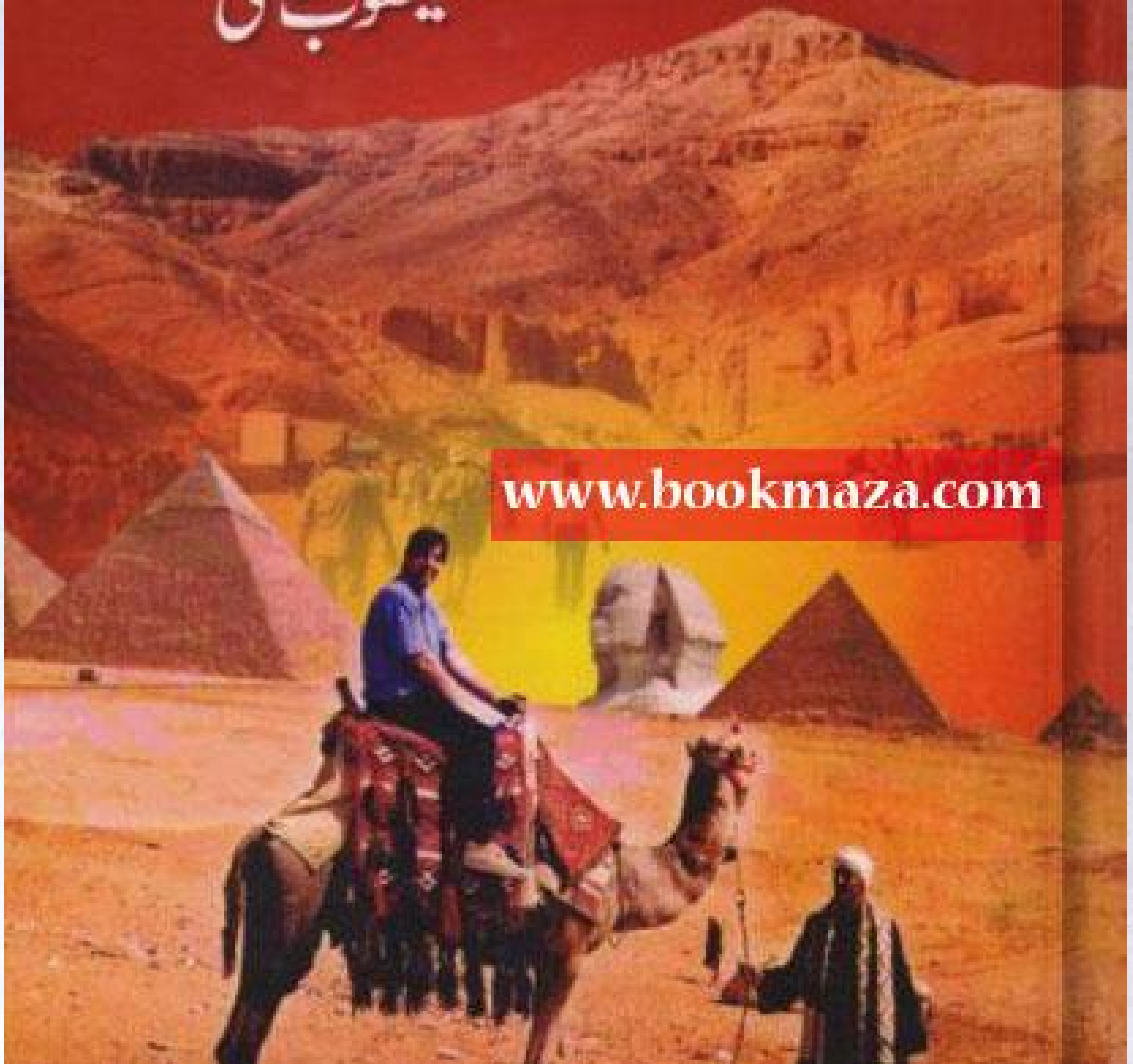
مصر کا بازار

(سفرنامہ)

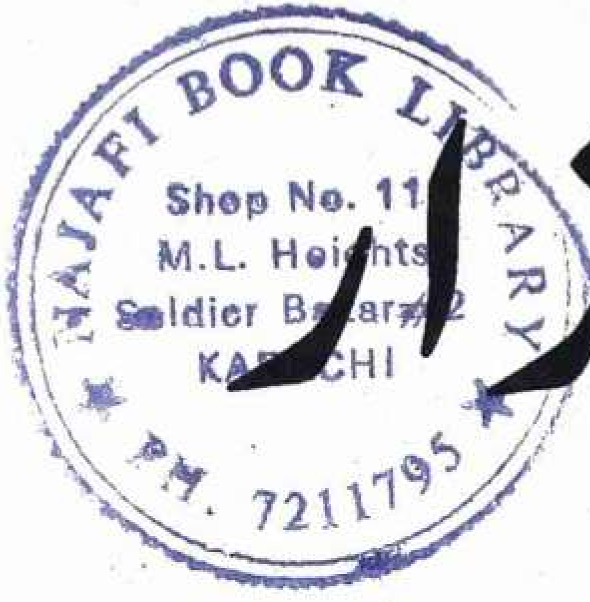
یعقوب نظامی





نگارشات پبلشرز

حبیب ایجوکیشنل سنٹر 38- مین اردو بازار لاہور | 24- مزنگ روڈ' لاہور
فون 7240593 فیکس 042-5014066 | فون 7322892 فیکس 042-7354205
e-mail:nigarshat@yahoo.com
www.nigarshatpublishers.com



مصر کا بازار

(سفرنامہ)

یعقوب نظامی

نگارشات پبلشرز

حبیب ایجوکیشنل سنٹر 38-مین اردو بازار لاہور | 24- مزنگ روڈ' لاہور
فون 7240593 فیکس 042-5014066 | فون 7322892 فیکس 042-7354205
e-mail:nigarshat@yahoo.com
www.nigarshatpublishers.com

نام کتاب: مصر کا بازار

مصنف: یعقوب نظامی

ناشر: آصف جاوید

برائے: نگارشات پبلشرز

24- مزنگ روڈ، لاہور

PH:0092-42-7322892 FAX:7354205

فرسٹ فلور، حبیب ایجوکیشنل سنٹر، 38- مین اردو بازار لاہور

PH:0092-42-5014066 FAX:7354205

مطبع: المطبعۃ العربیہ لاہور

سال اشاعت: 2007ء

قیمت: =/300 روپے

بِسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

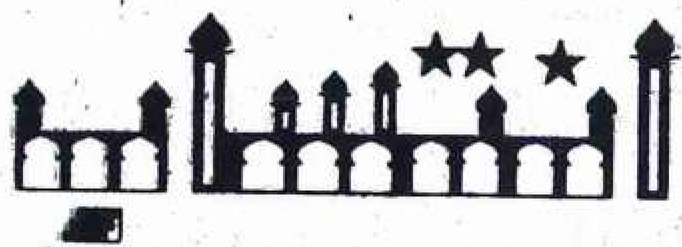
ترتیب



اَوَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ
کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ وَکَانُوۡۤا
اَشَدَّ مِنۡہُمۡ قُوَّۃً وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیُعۡجِزَہٗ مِنۡ
شَیۡءٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الۡاَرۡضِ اِنَّہٗ
کَانَ عَلِیۡمًا قَدِیۡرًا ۝

کیا یہ لوگ زمین میں کبھی چلے پھرے نہیں ہیں کہ انہیں اُن لوگوں کا انجام نظر آتا جو اِن سے پہلے گزر چکے ہیں اور ان سے بہت زیادہ طاقت ور تھے؟ اللہ کو کوئی چیز عاجز کرنے والی نہیں، نہ آسمانوں میں نہ زمین میں۔ وہ سب کچھ جانتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

(سورہ فاطر آیات 44)



میرا گھر میری جنت کی ملکہ شمیم

اور

آنگن میں کھلے رنگ برنگے پھول

نفیسہ، شمائلہ، سعدیہ اور بیٹے خرم

کے نام

جو میری ''آوارہ گردی'' کے دوران سب سے

زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔

پھر وادی فاراں کے ہر ذرے کو چمکا دے
پھر شوق تماشا دے ، پھر ذوق تقاضا دے
محروم تماشا کو پھر دیدہ بینا دے
دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے

(علامہ اقبال)

سفر وسیلہ ظفر

دنیا بہت خوبصورت ہے۔ اس میں میدان، پہاڑ، صحرا، جنگل، شاداب وادیاں، برف پوش پربت، ہرے بھرے کھیت، رنگ برنگے پھول، چشمے، جھرنے، آبشاریں، دریا، جھلیں، گلیشیرز اور سمندر ہیں۔ دنیا کے جتنے رنگ ہیں اتنے ہی رنگوں کے اس میں لوگ آباد ہیں۔ جن کی تہذیب تمدن، مذہب، خیالات، بول چال، کھانا پینا، رہن سہن ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ممکن ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں متعدد بار انسانوں کو تلقین فرمائی کہ چل پھر کر دنیا دیکھو۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ!

سیاحت کا مشغلہ سب سے مہنگا ہے۔ جس میں ڈھیر ساری دولت، اچھی صحت، موافق حالات اور مخلص دوستوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے دوست جو ہمہ یاراں دوزخ کیلئے ہر وقت تیار رہتے ہوں۔ اگر خوش قسمتی سے یہ سب کچھ میسر آجائے تو پھر سیاحت کا مزہ دوبالا ہوجاتا ہے۔

انسان کی فطرت میں سیاحت کا عنصر کسی نہ کسی شکل میں موجود ہوتا ہے۔لیکن حالات آڑے آتے رہتے ہیں۔میری طرح خوش نصیب لوگ بہت کم ہیں۔جنہیں اللہ تعالیٰ سیاحت کیلئے مواقعے اور غیبی مدد دیتے رہتے ہیں۔ اگر آپ نے میرا سفرنامہ ''پیغمبروں کی سرزمین'' پڑھا ہے۔تو یقیناً آپ کو ایسے مواقعے اور اُن کا پس منظر معلوم ہوگا۔

جب میں سیاحت کیلئے رخت سفر باندھتا ہوں تو ساتھ ایک قلم اور ڈائری ضرور رکھ لیتا ہوں۔تا کہ جو کچھ میں دیکھوں یا محسوس کروں اُسے قلم بند بھی کرتا جاؤں۔ہوسکتا ہے میری طرح سیاحت کے لاکھوں دلدادہ جو کسی وجہ سے اپنی خواہشات کو پورا نہیں کر پاتے وہ میری نظر سے دیکھی ہوئی چیزوں کو اپنے گھر بیٹھے بٹھائیں پڑھ کر لطف اٹھائیں۔سفرنامہ پڑھنے کے بعد اگر مصر دیکھنے کی خواہش میں شدت آئے تو میں یہ سمجھوں گا کہ میرا سفر اور سفرنامہ دونوں کامیاب رہے۔

اور ہاں...... اگر زندگی میں کبھی مصر جانے کا موقع ملا اور اُن مقامات کو دیکھا جنہیں میں نے اس سفرنامہ میں بیان کیا ہے تو مجھے ضرور یاد کیجئے۔

یعقوب نظامی
بریڈفورڈ انگلستان

جمعرات یکم مارچ 2007ء

M.Y.Nizami
257 Legrams Lane
Bradford, England U.K
BD7 2EJ
Tel: 01274 522658
yaqubnizami@hotmail.com



یعقوب نظامی

یعقوب نظامی انگلستان کے شہر بریڈفورڈ میں آباد ہیں۔ کشمیری اور پاکستانی ہونے کے ساتھ ساتھ اب برطانوی شہری بھی ہیں۔غم روزگار کیلئے مانچسٹر سٹی کونسل میں ڈپٹی مینیجر کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ ان کی بیگم شمیم نظامی بریڈفورڈ کالج میں انگریزی کی پروفیسر ہیں۔ بیٹی نفیسہ نظامی ہڈرزفیلڈ یونیورسٹی میں اور شمائلہ بریڈفورڈ کالج میں جبکہ سعدیہ اور بیٹا خرم گرینج سکول بریڈفورڈ میں پڑھتے ہیں۔

یعقوب نظامی کا آبائی گاؤں سلواہ ہے۔ جو مقبوضہ کشمیر ضلع پونچھ کی تحصیل مہنڈر میں ہے۔ان کی پیدائش دوران ہجرت تتہ پانی ضلع کوٹلی کے مقام پر ہوئی۔ بچپن سلواہ میں گذرا۔ ان کے والد مولوی محمد اسماعیل جید عالم دین تھے۔ جبکہ ان کے بڑے بھائی ایوب صابر میرپور میں وکالت اور صالح متین صدر معلم ہیں۔ چھوٹا بھائی ڈاکٹر یوسف طارق گوجرانوالہ میں ڈینٹل سرجن ہیں۔ جبکہ ان کے بھتیجے پروفیسر الیاس ایوب میرپور ڈگری کالج میں انگریزی پڑھاتے ہیں۔

یعقوب نظامی کی دیگر تصنیفات

- ☆ پاکستان سے انگلستان تک
- ☆ پیغمبروں کی سرزمین
- ☆ انگلستان میرا انگلستان
- ☆ ایک صدی کی بات

زیر مطالعہ سفرنامہ کے بعد یعقوب نظامی برطانیہ، فرانس، بلجیم، جرمنی، سوئزرلینڈ، اٹلی اور سپین کی سیاحت کر چکے ہیں۔ جن کی یادیں عنقریب کتابی شکل میں دستیاب ہونگی۔



دکھلایئے لے جا کے اُسے مصر کا بازار
لیکن کوئی خواہاں نہیں واں جنسِ گراں کا

برطانیہ سے مصر براستہ اٹلی

پڑھو فارسی بیچو تیل

القاعدہ اور بم

بے ذائقہ کھانا

امریکی وزارت خارجہ

برطانیہ سے مصر براستہ اٹلی

ایک دن میں اپنے دفتر بیٹھا دفتری امور نبٹا رہا تھا۔ کہ ہمارے دفتر کے شعبہ صومالیہ کے ایک افسر محمد بکاری میرے پاس تشریف لائے اور کہا: ''نظامی صاحب! مصر کے دارالحکومت قاہرہ میں میرا ذاتی فلیٹ ہے۔ جو میرے بیوی بچوں کے تصرف میں تھا۔ اب بچے مستقل برطانیہ آ چکے ہیں۔فلیٹ خالی ہے۔ میں مصر جا کر وہ فلیٹ فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ جس کے لئے مجھے چار ہفتے کی رخصت چاہئے!......اور ہاں اگر آپ مصر کی سیاحت کرنا چاہیں تو میرے ساتھ چلیں مجھے آپ کی میزبانی کر کے دلی خوشی ہوگی۔''

مصر کی سیاحت کی پیشکش پر میرے بچپن کی خواہشات نے سر اٹھایا۔ میرے دل میں فرعون، اہرام مصر، ابوالہول، قارون کے خزانے، حضرت موسیٰ، حضرت یوسف، دریائے نیل، قلوپطرہ، صحرائے سیناء اور کوہ طور کو دیکھنے کا شوق موجیں مارنے لگا۔

وہ جو کہتے ہیں اندھا کو کیا چاہئے دو آنکھیں۔ مجھے اور کیا چاہئے تھا۔ اپنے بچپن کے خوابوں کا ملک مصر جس میں مفت رہائش اور عربی بولنے والا ایک اچھا ترجمان۔ اس کے علاوہ موسم بھی ایسا تھا جس میں مصر کی سیاحت سے حقیقی لطف اٹھایا جا سکتا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے بکاری کے ساتھ مصر جانے کا پروگرام بنالیا۔

محمد بکاری کا آبائی وطن صومالیہ ہے۔ یہ صومالیہ کے علاقہ براوا میں پیدا ہوئے۔ یوں صومالی اور براوا زبانیں ان کی مادری زبانیں ہیں۔ صومالیہ کافی عرصہ اطالوی کالونی رہا۔ چنانچہ

اطالوی زبان انہیں غلامی کے تحفہ میں ملی۔ مسلمان ہونے اور ملک یمن کے ساتھ قریبی گہرے تعلقات کی بناء پر عربی زبان پر مکمل عبور ہے۔ لیبیا اور سعودی عرب میں برسر روزگار رہنے کی وجہ سے انہیں عربی زبان میں مزید نکھار پیدا کرنے کا موقع ملا۔ اور اب انگلستان میں عرصہ سے مقیم ہونے اور ملازمت کرنے سے انگریزی بھی فرفر بولتے ہیں۔ مختلف زبانوں پر عبور ہونے کے علاوہ انتہائی اچھے انسان اور باعمل مسلمان ہیں۔

بکاری کے ساتھ مصر جانے کا وعدہ کیا تو مجھے اپنے دوست یاد آنے لگے جو اکثر میرے شریک سفر رہتے ہیں۔ ویسے بھی دوستوں کے بغیر سفر کا مزہ نہیں۔ سیر وسفر کے دوران نت نئی نئی باتیں تبصرے، ہنسی مذاق، کھانا پینا اکیلے میں کچھ جچتا نہیں۔ اور پھر میں اس بات کا بڑا قائل ہوں کہ ''یاراں نال بہاراں''۔ اسی خیال سے میں نے اپنے دوستوں میں سے یعقوب آزاد اور منیر حسین کا انتخاب کیا۔ ہر دو میرے جگری یار ہیں اور طبعیت کے بھی باغ و بہار۔ یعقوب آزاد بریڈفورڈ میں ایک الیکٹریکل فیکٹری میں انجینیئر ہیں۔ سیر و سیاحت کے دلدادہ ہیں۔ اور اپنے شوق کی خاطر سفر پر جانے کے بہانے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ میں نے انہیں فون پر اپنے نیک ارادوں سے آگاہ کیا۔ تو انہوں نے کہا: ''بتاؤ کب چلنا ہے؟ یعنی میری پیشکش سے قبل ہی انہوں نے اپنے آپ کو شریک سفر کر لیا تھا۔ یہ جواب میری توقع کے مطابق تھا۔ پھر میں نے منیر حسین کو فون کیا۔ منیر حسین بریڈفورڈ ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں ایجوکیشن ویلفیئر آفیسر ہیں۔ غم روزگار کے ساتھ ساتھ انہوں نے فوٹوگرافی کا غم بھی پال رکھا ہے۔ اس شوق کی تکمیل کیلئے سفر کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے گذشتہ سفر اٹلی کے دوران وہ ہمارے ہم سفر تھے اور ہم نے انکی مدبرانہ تجاویز پر عمل کرتے ہوئے سیاحت سے خوب لطف اٹھایا تھا۔ منیر حسین کو فون کر کے اپنے اور آزاد صاحب کے مصر جانے سے آگاہ کیا تو انہوں نے اپنے مخصوص لہجہ میں کہا۔

''بادشاہو! مصر کے خواب تو میں بچپن سے دیکھتا آرہا ہوں۔ اور اب آپ جائیں اور ہم نہ جائیں ایسے بھی حالات نہیں۔ آپ اپنی ڈائری نویسی کا فکر کریں اور فوٹوگرافی کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دیں۔ اور ہاں اس بار کھانے پینے کا بھی زیادہ فکر نہ کرنا۔ مصر اسلامی ملک ہے سنا ہے وہاں کھانے حلال، چٹ پٹے اور وافر مقدار میں ملتے ہیں۔''

اختتام ہفتہ ہمارے ''اتحاد ثلاثہ'' کی میٹنگ ہوئی جہاں بیٹھے بیٹھے ہم نے انٹرنیٹ پر

برطانیہ سے مصر آنے جانے کی ہوائی جہاز کی نشستیں بک کروا کر اپنے میزبان محمد بکاری کو مطلع کر دیا۔ کہ ہمارے سفر کا آغاز 25 فروری 2006 بروز ہفتہ مانچسٹر کے ہوائی اڈہ سے ہوگا۔

25 فروری بروز ہفتہ ایک ابر آلود اور ٹھنڈا دن تھا۔ دن کے ایک بجے ہمارے ایک عزیز عمران رزاق ہمیں مانچسٹر کے ہوائی اڈہ پر پہنچانے کیلئے گاڑی لیکر آ گیا۔ عمران ہمارے ہم سفر منیر حسین کے بھانجے ہیں۔ برطانیہ میں پیدا ہوئے یہاں سے گریجویشن کے بعد آج کل ایک برطانوی بنک میں منیجر ہیں۔ راستہ میں یعقوب آزاد کے گھر رکے تو وہ پہلے ہی اپنے سامان کے ساتھ تیار بیٹھے تھے۔ بریڈفورڈ سے مانچسٹر کا سفر ایک گھنٹہ کا ہے۔ جو زیادہ تر ہم نے موٹر وے ایم 62 کے ذریعے طے کیا۔ راستے میں پینا ئین کی پہاڑیوں کے اوپر اولڈہم اور دامن میں راچڈیل کا قصبہ آتا ہے۔ ہم پینائین کی پہاڑیوں میں پہنچے تو دیکھا برف نے ہر چیز کو اپنی سفید چادر میں لپیٹ رکھا ہے۔ برف سے لطف اندوز ہوتے، باتیں کرتے ہم ڈھائی بجے مانچسٹر کے ہوائی اڈہ پر پہنچے۔

مانچسٹر ہوائی اڈہ کا ایک منظر

ہم ہوائی اڈہ کے اندر گئے تو یوں محسوس ہوا جیسے یہ اجڑا اجڑا سا ہے۔ سوچا کسی غلط ٹرمینل پر آ گئے ہیں۔ چونکہ ہم جب بھی اپنے کسی عزیز واقارب کو ہوائی اڈہ پر چھوڑنے یا لینے آتے ہیں تو ہوائی اڈہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوتا ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کی رائے لی تو یعقوب آزاد بھی میرے ہم خیال تھے لیکن منیر حسین بولے بادشاہو! ہم غلط ٹرمینل پر نہیں بالکل سو فیصد صحیح جگہ ہیں۔ ہمیں ہنگامے اس لئے نظر نہیں آ رہے ہیں چونکہ آج پی آئی اے کی کوئی فلائیٹ نہ تو جا رہی ہے اور نہ آ رہی ہے۔ یہ رونق میلے اور ہنگامے ہمارے لوگوں کے دم سے ہوتے ہیں۔ ہم اس طرح کے بااخلاق ہیں کہ ایک مسافر کو الوداع کہنے پندرہ بیس افراد آ جاتے ہیں۔ یہی حالت کسی کو خوش آمدید کہتے وقت ہوتی ہے۔ ہوائی اڈہ پر جانا ہمارے لوگوں کیلئے تفریح ہو جاتی ہے۔ جب کے انگریز بڑی خاموش طبع قوم ہے۔ انکے سفر پر روانہ ہونے یا واپس آنے کی خبر بعض اوقات انہیں خود نہیں ہوتی۔ جس دن جانا ہوتا ہے اپنا سامان اٹھا کر کسی ٹیکسی یا پبلک ٹرانسپورٹ کے ذریعے ہوائی اڈہ پر چلے جاتے ہیں۔ اور پھر جہاز میں بیٹھ کر اپنی منزل کی

طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔منیر حسین کی اس بات میں کچھ وزن تھا۔

ہم یوں ہی باتیں کر رہے تھے کہ دیکھا ایک قوی ہیکل انسان بڑے بڑے سبز پھولوں والی چیتری قمیض پہنے دوڑتا ہوا ہماری طرف آ رہا ہے۔اُسے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی سانڈ ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ میں سے نکلا تو درختوں کے پتے اُس کے جسم کے ساتھ چپک گئے۔یعقوب آزاد نے دیکھا تو کہنے لگے نظامی صاحب! ''خیر ہو یوں لگتا ہے جیسے کوئی گینڈا دوڑتا ہوا آپ کی طرف آ رہا ہے۔'' میں نے غور سے دیکھا تو وہ سانڈ تھا نہ گینڈا بلکہ ہمارے میزبان بکاری تھے۔مجھے گلے لگا کر اس زور سے دبایا کہ میری سانسیں بند اور آنکھیں ٹمٹمانے لگیں۔چہرے پر زردی دیکھ کر منیر حسین گھبرائے اور پانی کی تلاش میں دوڑ لگانے والے تھے کہ بکاری نے مجھے چھوڑ کر منیر حسین کو اُسی خلوص اور جذبہ کے ساتھ گلے لگایا اور پھر یہی حشر ہمارے ساتھی یعقوب آزاد کے ساتھ کیا۔

منیر حسین اور یعقوب آزاد بکاری سے پہلی بار مل رہے تھے۔لیکن ملاقات کا یہ منظر کچھ یہی تاثرات دے رہا تھا جیسے یہ بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔بکاری نے ہماری ملاقات اپنی بیگم زینب بداوی اور بیٹے صالح بکاری سے کروائی۔زینب مجھے ایک سنجیدہ سمجھدار اور باہمت خاتون نظر آئیں۔صالح بھی چاق و چوبند تھا۔جس نے بتایا کہ وہ مانچسٹر میں فٹ بال کا کوچ ہے۔بکاری نے بیگم اور بیٹے کو خدا حافظ کہنے کے بعد اپنا سامان اٹھا کر کندھے پر رکھا اور ہاتھ میں میرا سوٹ کیس اٹھا کر کہنے لگا باس Boss آؤ۔کونٹر پر سامان چیک کرواتے ہیں۔میں نے بکاری کو سمجھایا باس دفتر میں ہوتے ہیں۔دفتر سے باہر ہم دوست اور بھائی ہیں۔اور پھر یہاں سامان اٹھانے کا یہ طریقہ نہیں جو آپ نے اپنایا ہوا ہے۔یہ ٹرالیاں کس کام کی؟ بکاری نے میری بات سنی ان سنی کر دی اور سیدھا کونٹر پر جا کر سامان رکھا۔مسافر زیادہ نہیں تھے۔اطالوی ائرلائین کے عملہ نے ہمارے سامان کو اپنی حفاظت میں لیا اور ہمیں بورڈنگ کارڈ جاری کر دیئے۔سامان سے فارغ ہوئے تو ہوائی اڈہ کے کیفے ٹیریا میں جا گھسے۔

چائے پینے کے بعد بکاری نے کہا میں عصر کی نماز ادا کرنے مسجد جا رہا ہوں۔یعقوب آزاد بھی ان کے ساتھ نماز ادا کرنے چلے گئے۔میں اور منیر حسین نے باہمی مشورہ سے فیصلہ کیا کہ ہم منزل پر پہنچ کر نماز قضاء ادا کریں گئے۔

میں اور منیر حسین کیفے ٹیریا میں بیٹھے چائے پیتے باتیں کرتے اور سفر کی منصوبہ بندی کرتے رہے۔ میں نے خدشہ ظاہر کیا کہ :'' بکاری کے ساتھ یعقوب آزاد اور آپ کی پہلی ملاقات ہے۔ ممکن ہے اجنبیت کی وجہ سے آپ سفر سے بھر پور لطف اندوز نہ ہوسکیں۔'' منیر حسین بولے:'' بادشاہو آپ میرا فکر نہ کریں میں ہر حالت اور ہر کسی کے ساتھ خوش باش وقت گزار سکتا ہوں۔ ہمیں یعقوب آزاد کی فکر ہے۔'' ہم یہی باتیں کر رہے تھے کہ دیکھا بکاری اور یعقوب آزاد ایک دوسرے کے گلے میں بازو ڈالے ایک دوسرے کو حاجی حاجی پکارتے، ہنستے کھیلتے چلے آرہے ہیں۔ منیر حسین بولے:'' ایسے لگتا ہے کہ اس نمازی گروپ کا ایکا ہو چکا ہے۔ اب انشاء اللہ ہمارا سفر اچھا اور خوشگوار گذرے گا۔''

چائے کی میز پر ہم نے سفر کے کچھ قواعد مقرر کیے۔ فیصلہ ہوا کہ یعقوب آزاد ہمارے وزیر خزانہ ہونگے۔ جو سیاحت کے دوران تمام اخراجات کی ادائیگی کرتے رہیں گے۔ اور اختتام سفر اپنے اپنے حصے کے پیسے ادا کر دیئے جائیں گے۔ تا کہ کسی ایک ساتھی پر زیادہ مالی بوجھ نہ پڑے۔ منیر حسین کو شعبہ فوٹوگرافی اور سفر کے دوران ہم سب کو صراطِ مستقیم پر چلانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ پاسپورٹ، ٹکٹ، فالتو کیش اور بنکوں کے کارڈ میرے حوالے کیے گئے۔

سیاحت کے دوران تیسری دنیا میں یورپی سیاحوں کے پاسپورٹ اور نقدی چوری ہونے کے بڑے امکان ہوتے ہیں۔ اس موقع پر منیر حسین نے ایک دو واقعات کا حوالہ دیا اور پھر اپنی گوری منیجر کے تجربات سے جب ہمیں آگاہ کیا کہ مصر میں کچھ لوگ ایشیائی رنگت کے برطانوی باشندوں کو اغوا کر لیتے ہیں۔ ان کے پاسپورٹ اور نقدی چھین کر سیاحوں کو قتل اور برٹش پاسپورٹ پر کسی مصری کا فوٹو لگا کر اسے یورپ بھیج دیتے ہیں۔ یعقوب آزاد نے منیر حسین کی سنجیدگی کو توڑتے ہوئے از راہ مذاق کہا کہ ویسے بھی ہمارے نام یعقوب ہیں جو مسلمانوں میں ہر دلعزیز ہیں۔ ایسے میں ہم ''یعقوبوں'' کو اور زیادہ خطرہ ہے۔ منیر حسین یہ بات سن کر اور سنجیدہ ہو گئے۔ میں زیر لب مسکراتا اور یعقوب آزاد اور منیر حسین کی حفاظتی تدابیر پر مبنی گفتگو سنتا رہا۔

پڑھو فارسی بیچو تیل

ہم باتیں کر رہے تھے کہ اعلان ہوا'' خواتین وحضرات اٹلی کے شہر میلان جانے کیلئے

الاطالیہ ائیر لائین کی فلائیٹ تیار ہے۔ مسافروں سے گزارش ہے کہ وہ ہوائی جہاز میں تشریف لے چلیں۔'' ہم اٹھے اور اپنے مختصر سے دستی سامان کے ساتھ جہاز میں جا بیٹھے۔ اطالوی ہوائی کمپنی کا یہ جہاز درمیانے سائز کا تھا۔ جس میں پچاس ساٹھ مسافروں کی گنجائش تھی۔ جمبو جیٹ جس میں چار سو کے قریب قریب مسافر ہوتے ہیں کی نسبت یہ جہاز بہت ہی چھوٹا تھا۔ شام کے چار بجکر چالیس منٹ پر جہاز نے اُڑان لی۔ جہاز فضاء میں پہنچا تو نازک اندام اطالوی فضائی میزبان لڑکیوں نے مسافروں کی مشروبات اور ہلکے پھلکے کھانوں سے تواضع شروع کردی۔ جو نازنین ہماری تواضع پر معمور تھی وہ اس قدر جاذب نظر با اخلاق اور ہنس مکھ تھیں کہ اُسے خراماں خراماں چلتے دیکھ کر منیر حسین نے سرگوشی کرتے ہوئے مجھے رازدارانہ انداز میں بتایا کہ:'' بادشاہ ہو...... اس اطالوی مٹیار کی میزبانی کی بدولت ہمارے کرایے کی رقم پوری ہوگئی۔ باقی سفر تو ہم مفت میں کررہے ہیں۔'' ہمیں منیر حسین سے اتفاق تھا۔ مجھے تو یہ نازنین فرنگ میر درد کا چلتا پھرتا شعر معلوم ہوتی تھیں:

صورتوں میں خوب ہوں گی شیخ گو حور بہشت
پر کہاں یہ شوخیاں یہ طور یہ محبوبیاں

اطالوی فضائی میزبان لڑکی واقع غضب کی تھی۔ ہمیں اُس وقت شدید جھٹکا لگا جب یہ نازنین فرنگ بکاری کے ساتھ بڑے محبوبانہ انداز میں بل کھا کھا کر اور ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی۔ منیر حسین نے گفتگو کا موضوع معلوم کرنے کی خاطر اُدھر کان لگائے تو مایوسی کے عالم میں بولے'' بادشاہ ہو یہ دونوں اطالوی زبان میں باتیں کررہے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے منیر حسین نے ایک لمبی آہ بھری اور کہا کاش ہم بھی بچپن میں فارسی کی جگہ اطالوی زبان پڑھتے تو آج کام آتی۔ ہمیں فارسی کے تاریک مستقبل کا اُس وقت بھی علم تھا جب لڑکے بڑے زور زور سے نعرے لگایا کرتے تھے کہ '' پڑھو فارسی بیچو تیل''۔

ہم ایک دوسرے سے نظریں بچاتے چھپ چھپا کر اطالوی میزبانوں سے نظریں ملاتے، آپس میں ہنستے، قہقے لگاتے اور بکاری کی خوش قسمتی پر دل میں کڑھتے رہے۔ اسی کشمکش میں دو گھنٹے کا سفر یوں گزر گیا جیسے ہم چند لمحے ہی جہاز میں بیٹھے ہوں کہ حکم آ گیا'' سیٹ بیلٹ

باندھ لیجئے۔ جہاز اٹلی کے تجارتی شہر میلان میں اُترنے والا ہے''۔ جہاز نے فضاء میں ایک چکر لگایا اور ابر آلود موسم میں بخیریت میلان کے ہوائی اڈہ پر اُتر گیا۔

اٹلی کا ہوائی اڈہ

اٹلی کی سیاحت ہم کوئی چار سال پہلے کر چکے تھے۔ اُس وقت میلان کا ہوائی اڈہ کچھ اجڑا اجڑا سا تھا لیکن آج یہاں بڑی رونقیں تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے دنیا جہاں کا حسن اس جگہ جمع ہے۔ حسن زن سے سارا ماحول معطر، خوشگوار اور رومان میں ڈوبا ہوا تھا۔ اپنے عزیزوں کو خوش آمدید کہنے والے انہیں گلے لگاتے اور پھر ہنستے قہقہے لگاتے ہوئے جا رہے تھے۔ میلان میں ہمیں جہاز تبدیل کرنا تھا۔ اگلے جہاز کے انتظار میں ہم نے دو گھنٹے ہوائی اڈہ کی پرفیوم کی دکانوں پر گزار دیئے۔ جی بھر کر اپنے کپڑوں کو پرفیوم سے معطر کیا۔ منیر حسین کہنے لگے: ''نظامی صاحب مفت کا مال قاضی کو بھی حلال۔ آپ قاضی تو نہیں لیکن مولوی صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ ممکن ہے آپ کیلئے بھی یہ حلال ہو لیکن ہمارا کیا ہوگا؟'' میں نے انہیں تسلی دی کہ یہ پرفیوم سب کیلئے حلال ہے چونکہ یہ خریداروں کیلئے رکھا گیا ہے تاکہ وہ اسے استعمال کریں اگر جی چاہے تو خرید لیں ورنہ اپنی اپنی راہ لیں۔

ہم ہوائی اڈہ پر یوں ہی گھوم پھر کر دل پشوری کر رہے تھے کہ کہ اعلان ہوا کہ: ''قاہرہ جانے والی فلائیٹ تیار ہے۔ جہاز پر سوار ہونے کیلئے مسافر گیٹ نمبر 32 پر پہنچ جائیں''۔ مسافر اٹھے اور قطار میں کھڑے ہوگئے۔ گیٹ پر ایک اطالوی لڑکی کاغذات دیکھتی اور مسافروں کو اندر جانے کی اجازت دے رہی تھی۔ مانچسٹر سے میلان تک سفر کرنے والے زیادہ تر مسافر سفید فام تھے۔ لیکن اس بار مسافروں کی اکثریت مصری تھی۔ مصریوں کی رنگت ایشیائیوں خصوصاً پاکستانیوں سے ملتی ہے۔ صرف انکے نقش و نگار موٹے اور بال گنگریلے ہوتے ہیں۔ مصری خواتین نے سر ڈھانپے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں سامان اٹھائے بچوں کے ساتھ قطاروں میں کھڑی تھیں۔ امیگریشن کی ضروری کاروائی کے بعد ہمیں ایک بس میں بیٹھا کر اطالوی ہوائی کمپنی کے ایک اور جہاز میں سوار کیا گیا۔ یہ جہاز پہلے کی نسبت قدرے بڑا تھا۔

القاعدہ......اور بم

امریکہ میں گیارہ ستمبر 2001ء کے واقعہ کے بعد فضائی مسافروں کی بڑی چھان بین

ہوتی ہے۔ اگر مسافر مسلمان ہو تو پھر سیکورٹی حکام اور زیادہ کڑی نظر رکھتے ہیں۔ غالباً آج بھی کچھ ایسا ہی مسئلہ تھا۔ قاہرہ جانے والی اس فلائیٹ میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ جب جہاز اڑنے لگا تو معلوم ہوا ایک مسافر نے اپنا سامان بک کروایا لیکن خود غائب ہو گیا ہے۔ ایسے میں سیکورٹی کے احکام متحرک ہو گئے۔ جہاز میں بیٹھے سفید فارم انگریزوں اور میموں نے ''القاعدہ اور بم'' کے شک میں آپس میں کھسر پھسر شروع کر دی۔......

اطالوی سیکورٹی احکام نے ہوائی اڈہ کی خاک چھان ماری۔ آخر ایک بنچ پر انہیں ایک گورا شراب کے نشے میں مست خراٹے بھرتے ملا۔ جسے انہوں نے جگانے کی کوشش کی تو وہ شراب کے نشہ بلکہ عالم مدہوشی میں سیکورٹی والوں پر برس پڑا۔ دھینگا مشتی اور مار کھانے سے اُسے جب تھوڑا ہوش آیا تو معلوم ہوا یہ وہی صاحب ہیں جن کا سامان تو قاہرہ جانے کیلئے جہاز میں موجود ہے لیکن گورا صاحب خود نشے کی حالت میں کسی اور دنیا میں گھوم رہے ہیں۔ دو تین سیکورٹی والوں نے اُسے اپنی گرفت میں رکھ کر جہاز کے عملے کے حوالے کیا۔ مسافروں نے گم شدہ مسافر کو دیکھا تو سفید چمڑی دیکھتے ہوئے ''القاعدہ اور بم دھماکوں'' کی باتیں کرنے والے سفید فام مسافروں نے خاموشی اختیار کرتے ہوئے سر نیچے کر لیے۔ انگریز کی یہی خوبی ہے کہ اپنی ناکامی پر اکڑنے کی بجائے سر نیچا کر لیتے ہیں۔ اس دھینگا مستی میں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ یوں جہاز وقت مقررہ سے ایک گھنٹہ تاخیر سے نو کی بجائے رات دس بجے روانہ ہوا۔

بے ذائقہ کھانا

جہاز فضاء میں پہنچا تو فضائی میز بانوں نے کھانے میز پر لگانے شروع کر دیئے۔ پہلے ایک ٹمیار آئی جس نے کچھ مخصوص نشستوں پر کھانے لگائے۔ منیر حسین نے تجسس کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس بے ترتیب میز بانی کا اتہ پتہ معلوم کیا تو معلوم ہوا جن مسافروں نے حلال کھانے کا کہہ رکھا تھا انہیں سب سے پہلے حلال کھانا فراہم کیا گیا۔ ہم نے بھی حلال کھانے کیلئے کہا تو فضائی میز بان لڑکی نے ٹکا سا جواب دیا کہ آپ نے پہلے ہمیں نہیں بتایا تھا۔ ہم نے بڑی دلیلیں دیں کہ بکنگ کے وقت ہم نے حلال کھانے کے خانے میں نشان لگایا تھا لیکن وہ اطالوی بی بی نہ مانی۔ مجبوراً ہمیں مچھلی اور سبزیوں پر مشتمل کھانا کھانا پڑا۔ یہ بے ذائقہ سا کھانا تھا جس سے پیٹ بھرنا مطلوب تھا ورنہ کھانے والی اس میں کوئی بات نہیں تھی۔ ہم نے بے دلی

سے پیٹ بھرا اس دوران ہمارے ساتھی یہی کہتے رہے کہ قاہرہ جا کر سب سے پہلے اطالوی ائرلائین کو اس کی شکایت کریں گے لیکن قاہرہ گئے تو وہاں فراعنہ کی دنیا میں اس قدر گم ہوئے کہ کھانے کی شکایت کرنا ہی بھول گئے۔

امریکی وزارت خارجہ

جہاز میں مجھے منیر حسین کے ساتھ نشست ملی۔ ہمارے دائیں ہاتھ تین نشستوں پر ایک امریکی لڑکی جس کے دائیں بائیں دونوں طرف خوب ہٹے کٹے اُس کے بوائے فرینڈ بیٹھے تھے۔ وہ امریکی لڑکی بڑی چالاکی اور مکاری سے دونوں بوائے فرینڈز کو خوش رکھے ہوئے تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ امریکی وزارت خارجہ کی تربیت یافتہ لڑکی ہے جو بھارت اور پاکستان کو بایک وقت اور ایک ساتھ مختلف طریقوں سے انکے دل بہلانے کا سامان مہیا کرتی ہے۔ منیر صاحب کا تبصرہ مجھ سے کافی مختلف تھا وہ دونوں جوانوں کی قسمت پر رشک اور امریکی لڑکی کے حوصلے کے پس منظر میں کچھ اس قسم کے تبصرے کر رہے تھے جنہیں لکھنا مناسب نہیں۔ بس یاروں کی محفل میں سن کر قہقے ہی لگائے جاسکتے ہیں۔

قاہرہ کا ہوائی اڈہ

ہمارا جہاز مصر کے مقامی وقت کے مطابق صبح چار بجے قاہرہ کے ہوائی اڈہ پر اُترا۔ امیگریشن کے مرحلے سے قبل ہم ڈیوٹی فری شاپنگ ایریا سے گزرے تو بکاری ایک دکان کے اندر گیا۔ دکاندار سے عربی میں کوئی بات کی پھر اُس سے بیس ڈبے بینسن اینڈ هیجز سگریٹ خریدے۔ ہمارے استفسار پر بکاری نے بتایا کہ ہر مسافر کو پانچ ڈبے بغیر ڈیوٹی ادا کیے لے جانے کی اجازت ہے۔ ایک ڈبہ کی قیمت پانچ پونڈ ہے۔ جبکہ برطانیہ میں اس ڈبے کی قیمت پچاس پونڈ ہے۔ اس کا مطلب ہے بکاری نے چلتے چلتے ہمارے ناموں پر بھی اچھا بھلا مال کمالیا تھا۔

ہوائی اڈہ پر ہم نے ایک بنک سے پندرہ پندرہ ڈالر کے ٹکٹ خریدے جنہیں اپنے پاسپورٹوں پر ثبت کیا تو امیگریشن آفیسر نے اُس پر مہر لگا کر سب سے پہلے مجھے داخلے کی اجازت دی۔ میں دوسری طرف جا کر کھڑا ہو گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو میرے تینوں ساتھی کھڑے ہیں اور امیگریشن احکام بار بار کمپیوٹر پر کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جب سارے مسافر

جا چکے تو بڑی جانچ پڑتال کے بعد ہمارے ساتھیوں کو جانے کی اجازت دی۔ یعقوب آزاد کی رائے تھی کہ ہم دونوں کے نام ایک ہیں جب امیگریشن والوں نے یعقوب نظامی کو جانے کی اجازت دی تو دوسرے یعقوب آزاد تھے۔ چنانچہ انہیں ہم نام ہونے پر شک تھا۔ منیر حسین کی رائے میں یہ امریکہ کے عالمی آرڈر کا نتیجہ ہے۔ کہ جب تک کسی مسافر کی امریکہ کلیرنس نہیں دیتا اُس وقت تک تیسری دنیا کے ممالک اپنے ہی باشندوں کو تنگ کرتے رہتے ہیں۔

ہوائی اڈہ سے باہر نکلے تو دیکھا بائیس چوبیس سال کا ایک لمبا سانولہ سلونا نوجوان ہمارے انتظار میں کھڑا تھا۔ بکاری نے ہماری آمد کی اُسے اطلاع کر دی تھی۔ تعارف پر معلوم ہوا کہ اس کا نام ھمام ہے اور آبائی وطن یمن ہے۔ بچپن کے کچھ سال صومالیہ میں گزارے اور اب جوانی کے دن قاہرہ میں گزار رہا ہے۔

ھمام نے ہمیں اپنی گاڑی میں بٹھایا اور آدھے گھنٹے میں محمد بکاری کے گھر ''الرحاب سٹی'' پہنچا دیا۔ یہ جگہ قاہرہ کے ہوائی اڈہ سے کوئی بیس کلو میٹر دور ہے۔ صبح کے پانچ بج چکے تھے۔ میں اور منیر حسین نے ایک کمرے پر قبضہ کیا اور لمبی تان کر سو گئے۔ یعقوب آزاد اور بکاری کے حصے میں الگ الگ کمرے آئے۔ بستر پر لیٹے تو لیٹتے ہی خواب خرگوش کے مزے لینے لگے۔ جب آنکھ کھلی تو صبح کے دس بج چکے تھے۔



مصر کی پہلی جھلک

روٹی کباب

ٹریفک کا سیلاب

بخشیش

ناصر سٹی

مصر کی پہلی جھلک

پروگرام کے مطابق آج 26 فروری 2006 ہمارے آرام کا دن تھا۔ ہم اٹھے غسل کیا نئے کپڑے پہن کر افریقہ کے صحرا کا تصور ذہن میں رکھ کر باہر نکلے تو حیران ہوئے۔ علاقہ انتہائی صاف ستھرا سڑکیں پختہ اور یورپی معیار کے مطابق جن پر باقاعدہ مارکنگ تھیں۔ جگہ جگہ زیبرا کراسنگ یعنی پیدل سڑک عبور کرنے والوں کیلئے راستے، بس سٹاپ اور وہاں مسافروں کیلئے انتظار گاہیں۔ سڑکیں دو طرفہ جن کے درمیان خوبصورت پھول بوٹے۔ مجھے یہ شہر اسلام آباد کی طرح نظر آیا۔ ہم نے علاقہ گھوم کر دیکھا تو معلوم ہوا یہ ایک مکمل شہر ہے۔ جس کا نام الرحاب سٹی ہے۔ شہر کے چاروں طرف حفاظتی دیوار اور شہر میں داخل ہونے کے لئے چھ گیٹ۔ جن پر سیکورٹی کا عملہ چوبیس گھنٹے ڈیوٹی دیتا ہے۔ یہ سب کچھ مقامی لوگوں کی حفاظت کے پیش نظر کیا جاتا ہے۔ شہر کے اندر زندگی کی تمام سہولیات موجود۔ انتہائی صاف ستھری مارکیٹس جن میں ضروریات زندگی کی ہر چیز موجود۔ مساجد، مدرسے، سکول اور کالج موجود ہیں۔ برطانیہ، امریکہ اور فرانس نے اپنے اپنے تعلیمی ادارے بھی اس شہر میں قائم کیے ہوئے ہیں۔ جہاں مقامی طلباء بھاری فیس دیکر مغربی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

شہر میں خوبصورت پارک جن میں رنگ برنگے پھول، اور اُن پھولوں کے درمیان مصری نوجوان اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گھومتے پھرتے، باتیں کرتے قہقے لگاتے نظر آئے۔ کچھ بڑی عمر کے لوگوں کو بھی دل پشوری کرتے دیکھا۔ یہ شہر جدید ترین ہے جس میں بنگلے، فلیٹ اور عام لوگوں کے مکان تھے۔ لوگ مہذب اور بڑے رکھ رکھاؤ والے تھے۔ بڑے ادب سے پیش آتے۔ لوگوں کی زندگی میں ایک سلیقہ نظر آیا۔ یورپ سے ملتا جلتا۔

روٹی کباب

یوں ہی گھومتے شہر کو دیکھتے ظہر کا وقت ہوگیا۔ ہم مقامی مسجد میں گئے جہاں گذشتہ دو دنوں کی نمازیں ایک ساتھ ادا کیں۔ نماز کے بعد کھانا کھانے ایک ہوٹل میں جا بیٹھے۔ ہوٹل کے خدمتگاروں سے منیجر تک سب عربی زبان میں باتیں کرتے تھے۔ ایسے میں بکاری نے ہماری ترجمانی کے فرائض سنبھال لیے۔ کھانے کیلئے بکاری نے دو کلو کباب، روٹیاں اور چاول کا آرڈر دیا۔ میں نے حیران ہوکر پوچھا:

بکاری صاحب کیا عربی میں درجن کو کلو کہتے ہیں؟

بکاری نے جواب دیا: ''نہیں۔''

میں نے پوچھا تو پھر آپ نے دو کلو کباب کا جو آرڈر دیا اس کا کیا مطلب ہے؟

بکاری نے جواب دیا: ''دو کلو کا مطلب دو کلو ہے۔''

میں نے وطن عزیز پاکستان میں کباب کھانے کے لئے درجن دو درجن کے حساب کا بتایا تو بکاری نے زور کا قہقہ لگاتے ہوئے کہا: ''نظامی صاحب یہ مصر ہے جہاں کے لوگ بہت ''پیٹو'' ہیں۔ انہیں درجن دو درجن کا حساب نہیں آتا۔ یہ کلو دو کلو گوشت کھانے کے عادی ہیں۔ مصر میں کباب کھانے ہوں تو درجن کی بجائے کلو میں آرڈر دیں۔''

حکم کی تعمیل میں خدمت گار نے میز پر کھانے لگانے شروع کر دیئے۔ کباب، چانپ، روسٹ گوشت، روٹیاں، طرح طرح کے سلاد، چاول۔ اتنے سارے کھانے دیکھ کر یعقوب آزاد بولے: ''نظامی صاحب یہاں کھانے کی بڑے عیاشی ہے وہ اٹلی والی بات نہیں جہاں سینڈوچ کے بغیر کھانے کو کچھ نہیں ملتا تھا۔'' منیر حسین بولے بادشاہ ہو: ''میں نے برطانیہ میں آپ کو نہیں بتایا تھا کہ مصر میں کھانے پینے کی فکر نہ کرنا۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھو کہ یہ سلاد بالکل نہیں کھانا چونکہ میری منیجر گذشتہ سال مصر آئی تھی۔ اُس نے جی بھر کے سلاد کھایا تو دوسرے دن پیچش کی بیماری میں مبتلا ہوگئی۔ تحقیق کی تو پتہ چلا اہل مصر سلاد کو دریا نیل کے پانی میں دھوتے ہیں۔ یہ پانی حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق ٹھیک نہیں۔ اس لئے سلاد مت کھانا۔''

میں نے منیر حسین کی رائے کی قدر کی اور اُن سے آنکھیں چرا کر چوری چوری تھوڑا

سلاد کھایا۔ آزاد صاحب نے منیر حسین کی سننے کی بجائے اپنے دل کی سنی اور ضرورت کے مطابق سلاد کھایا۔ محمد بکاری ہماری زبان نہیں سمجھتا تھا اور اگر سمجھتا بھی تو اُسے ہماری ہدایت پر عمل بھی نہیں کرنا تھا چونکہ وہ افریقی تھا اور افریقہ میں دریائے نیل کو بڑی اہمیت ہے۔ اسی لئے دانا لوگ مصر کو ''تحفہ نیل'' قرار دیتے ہیں۔

نیل کا تحفہ مصر تو تھا ہی ہمیں اُس کے تحفہ میں جو سلاد ملا وہ بکاری نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ دو تین پلیٹیں ہڑپ کر کے ایک ٹرے کباب، چھ روٹیاں، دو پلیٹ چاول کھا کر زور کا ڈکار مار کر الحمدللہ کہہ کر میز کا جائزہ لیا۔ تو بچ جانے والے چند کباب اور سلاد کا آخری لقمہ کھا کر ویٹر Waiter کو بلا کر بل مانگا۔ جس نے 75 مصری پونڈ مانگے۔ یہ برطانوی ساڑھے سات پونڈ بنتے تھے۔ اور پاکستانی حساب سے کوئی آٹھ سو روپے۔ بل دیکر ہم بہت خوش ہوئے کہ یہاں کھانا وافر بھی ہے اور سستا بھی۔ اگر برطانیہ میں اتنا اور ایسا کھانا کھاتے تو یقیناً ایک سو پونڈ جو پاکستانی دس گیارہ ہزار روپے بنتے ہیں ادا کرنے پڑتے۔ ہمارے وزیر خزانہ یعقوب آزاد نے بل ادا کیا۔ اور ویٹر کو اچھا خاصا ٹپ دیکر خوش کیا۔

ٹریفک کا سیلاب

آج کا دن اگرچہ آرام کا تھا۔ لیکن سارے ساتھی تروتازہ اور پُرشکم تھے۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ قاہرہ کی ایک جھلک دیکھ لی جائے۔ بکاری نے ایک ٹیکسی کو روکا اور ڈرائیور سے عربی میں کچھ پوچھا۔ جواب ملنے پر بکاری نے لا لا لا کرتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ تھوڑی تکرار کے بعد بکاری نے ہمیں ٹیکسی میں بیٹھنے کو کہا۔ ہم ٹیکسی میں بیٹھے تو بکاری نے بتایا: ''ڈرائیور نے شہر تک چلنے کے ساٹھ مصری پونڈ مانگے تھے۔ میں نے تکرار کیا تو معاملہ بیس مصری پونڈ میں طے ہو گیا''۔ اس سودے پر مجھے وطن عزیز کی یادیں آنے لگیں۔ جہاں سودے بازی اور تکرار کرتے کرتے انسان بعض اوقات کافی وقت ضائع کر دیتے ہیں۔ ساتھیوں نے فیصلہ کیا کہ مصر میں یورپی سٹائل نہیں بلکہ پاکستانی سٹائل سے کام چلانا ہوگا۔ یعنی سودے بازی!

ٹیکسی نے الرحاب سٹی سے قاہرہ کی طرف رخ کیا تو دیکھا جگہ جگہ نئی نئی عمارتیں بلکہ الرحاب کی طرز پر نئے شہر آباد کیے جا رہے ہیں۔ قاہرہ اصل میں مختلف شہروں کا مجموعہ ہے۔ جس میں قدیم اور جدید شہر سب ملکر قاہرہ کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ راستے میں آرمی کا زیر تعمیر ہیڈ

کوارٹر دیکھا۔ جس کے ارد گرد دیوار اور ہر پانچ سو گز پر اونچے برج پر آرمی کے جوان رائفلیں لیے ڈیوٹی دیتے دیکھے۔ اسی طرح صحرا کے درمیان تعمیر ہونے والے جدید شہروں کے بیچوں بیچ ٹیکسی فراٹے بھرتی ہمیں ناصر سٹی لے آئی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ہمیں ایک بڑی شاہرہ پر اُتار دیا۔

ہمیں اس شاہرہ کی دوسری طرف جانا تھا۔ شاہرہ کا جائزہ لیا تو یہ گاڑیوں کا سمندر تھا۔ پوری سڑک گاڑیوں سے مکمل طور پر بھری ہوئی تھی۔ لیکن ڈرائیور بے ترتیبی سے بغیر دوسروں کی پروا کیے گاڑیاں اِدھر اُدھر سے دوڑاتے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں تھے۔ گاڑیاں قدرے پرانی تھیں۔ ایسا رش تو پاکستان کے شہر لاہور کی مال روڈ پر بھی نظر نہیں آتا۔ لیکن یہ شاہرہ مال روڈ لاہور سے بڑی تھی۔ زیبرا کراسنگ موجود تھے۔ لیکن یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ڈرائیوروں کو زیبرا کراسنگ کا علم ہی نہیں۔ ہمیں سڑک پار کرنے میں بڑی پریشانی ہوئی۔ بکاری ، میں اور یعقوب آزاد کسی نہ کسی طرح سڑک عبور کر کے دوسری طرف پہنچ گئے۔ لیکن منیر حسین جو یورپی قواعد کے مطابق اس انتظار میں تھے کہ پیدل چلنے والوں کے بھی حقوق ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کسی ڈرائیور کو ترس آجائے۔ لیکن یہاں مصر میں ٹریفک کی حد تک پیدل چلنے والوں کے حقوق میں نے پامال ہوتے دیکھے۔

منیر حسین نے انتظار میں آدھا گھنٹہ لگا دیا کہ ممکن ہے کوئی معجزہ رونما ہو اور گاڑیاں رک جائیں لیکن جب ایسا نہ ہوا تو بکاری واپس گئے اور منیر حسین کو اپنے پہلو میں لیکر سڑک عبور کروائی۔ جب بکاری منیر حسین کے ہاتھ پکڑ کر سڑک عبور کروا رہے تھے تب مجھے اپنا گاؤں اور اس کے ساتھ بہتے نالے کی یادیں آنا شروع ہوئیں۔ جب ساون بھادوں میں مقامی نالے میں طغیانی آتی تھی تو میرے تایازاد بھائی جو طاقت ور اور دراز قد تھے ہاتھوں میں ڈانگ رکھ کر ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کر اس طغیانی کو عبور کیا کرتے تھے۔ مجھے یہاں گاڑیوں کا سیلاب نظر آیا۔ سڑک کو پار کیا تو منیر حسین نے فیصلہ سنا دیا کہ بادشاہو! آئندہ میں نے کبھی بھی پیدل سڑک عبور نہیں کرنی ہے۔ اور اس ملک کا ٹریفک کا نظام دنیا کے تمام ممالک سے بدترین ہے۔'' یعقوب آزاد نے منیر حسین کی دلجوئی کرتے ہوئے انہیں ٹیشو پیپر دیا تا کہ وہ پسینہ خشک کریں۔ اور پھر انہیں ایک اچھے سے کیفے ہاؤس میں لے جا کر تازہ مالٹے کا جوس پلا کر تازہ دم کیا۔

بخشیش

جوس پی کر ہم چل پھر کر مصر کی رونقیں دیکھنے لگے۔ اس بڑی شاہرہ کے دونوں طرف بڑے بڑے اونچے فلک بوس پلازے تھے۔ دائیں بائیں بازار تھے پاکستان اور بھارت کی طرز پر۔ چند ایک مانگنے والے نظر آئے لیکن ان کا مانگنے کا طریقہ مختلف تھا۔ ایک عورت ٹیشو پیپر لوگوں کو مفت میں پیش کرتی تھی جو لے لیتا وہ اُس کی ہتھیلی پر کچھ سکے رکھ دیتا۔ ایک صاحب ہاتھ میں ایک ٹوٹی ہوئی عینک لیے لوگوں سے اُس کی مرمت کیلئے پیسے مانگ رہے تھے۔ وہ کچھ عرصہ ہمارے ساتھ ساتھ چلتا اور پیسے مانگتا رہا۔

جب یعقوب آزاد نے اُسے کہا کہ میرے ساتھ آؤ میں تمہاری عینک مرمت کروا دوں تو وہ بھاگ گیا۔ جس کا مطلب واضح تھا کہ وہ صاحب عینک کی مرمت کیلئے نہیں بلکہ عینک کی آڑ میں بھیک مانگ رہے تھے۔ اِس کے بعد چند دوسری جگہوں کے علاوہ مانگنے والے نظر نہیں آئے۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ مصر کے معاشی حالات بہتر ہو رہے ہیں۔ اکا دکا مانگنے والے تو ولایت میں بھی نظر آ جاتے ہیں۔

ناصر سٹی

ہم ناصر سٹی میں گھومتے پھرتے ''سٹارسٹی شاپنگ سینٹر'' پہنچے۔ یہ سینٹر ہلٹن ہوٹل کے ساتھ ہے۔ سینٹر کے باہر سیکورٹی تھی۔ ہم ٹورسٹ تھے ہمارے پاسپورٹ دیکھ کر ہمیں اندر جانے کی اجازت دی۔ جبکہ بہت سے غریب باہر کھڑے للچائی ہوئی نظروں سے اندر جھانکتے اور پتہ نہیں دل ہی دل میں اندر کے کیسے کیسے خواب دیکھتے مایوسی کے ساتھ گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ شاپنگ سینٹر صرف اور صرف امیروں کیلئے ہے جہاں غریبوں کا داخلہ ممنوع ہے۔

شاپنگ سینٹر کے مین گیٹ کے ساتھ فرعونی دور کے مجسمے نصب تھے۔ ان میں سے کچھ فراعنہ کے خدا ابوالہول کے ہم شکل تھے۔ جنہیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ آج بھی اہل مصر اپنے آباؤ اجداد سے بڑے مرغوب ہیں اور دور فراعنہ سے ابھی تک باہر نہیں نکلے۔

یہ شاپنگ سینٹر انتہائی جدید اور صاف ستھرا تھا۔ جس میں گھومتے پھرتے یورپی سیاح

اور مصر کا امیر طبقہ شاپنگ میں مصروف تھا۔ کئی منزلوں پر مشتمل اس سینٹر کے اندر بھی سیکورٹی والے بڑے متحرک تھے۔ ہمارے ساتھی منیر حسین نے کیمرہ نکال کر جب فوٹو اُتارنے شروع کیے تو سیکورٹی والوں نے منع کر دیا۔ پتہ نہیں کیوں؟

یہاں ایک کویتی بنک سے برطانوی پونڈوں کے عوض مصری پونڈ لیے۔ ایک برطانوی پونڈ کے دس مصری پونڈ ملے۔ اس کا مطلب ہے ایک مصری پونڈ پاکستان کے بارہ روپے کے برابر ہے۔ دکانداروں نے ہر چیز اعلیٰ معیار کی بڑے سلیقے اور قرینہ سے سجائی ہوئی تھیں۔ گاہک بھی بڑی سنجیدگی اور متانت سے خریداری میں مصروف تھے۔ ہم نے چیزوں کے نرخ دیکھے تو برطانیہ کی نسبت بہت ہی رعایت تھے۔ لیکن پاکستان کے مقابلے میں بہت مہنگے تھے۔ ہم نے سفر کے دوران استعمال کیلئے چند چیزیں خریدیں اور پھر ایک کیفے ہاؤس میں چائے پینے بیٹھ گئے۔ مصر میں لوگ بغیر دودھ کے چائے پیتے ہیں۔ ہم نے پہلے دن چائے میں دودھ لیا لیکن کوئی مزہ نہیں آیا پھر ہم نے بھی مقامی لوگوں کی طرح قہوہ نما چائے بغیر دودھ کے پینی شروع کر دی۔

کیفے ہاؤس میں بیٹھ کر میں آتے جاتے لوگوں کا جائزہ لیتا رہا۔ میں نے دیکھا مصری جوان لڑکے لڑکیاں بزرگ خواتین وحضرات سب کے سب یورپی لباس میں ملبوث تھے۔ فرق یہ تھا کہ لڑکیوں اور عورتوں نے سر ڈھانپ رکھے تھے۔ یورپی لوگوں کی طرح یہ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ میرے ہم وطنوں کی طرح نہیں کہ خوبصورت لڑکی دیکھی تو اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ بلکہ بعض تو ہا...... ہو...... کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہاں مصر کا حسن اپنے عروج پر تھا ُلیکن کوئی بھی نظر بھر کر انہیں دیکھتا نہیں تھا۔

کیفے ہاؤس میں ھمام نامی ڈرائیور بھی آ گیا۔ رات کو اسی نے ہمیں ہوائی اڈہ سے گھر پہنچایا تھا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ جب تک ہم مصر میں رہیں گے گاڑی ہمارے ساتھ ساتھ رہنی چاہئے تاکہ ہم زیادہ سے زیادہ سیاحت آرام کے ساتھ کر سکیں۔ ھمام کے ساتھ ہمارا معائدہ ہوا کہ ہم ایک دن کے اسے پچیس برطانوی پونڈ جو ڈھائی سو مصری پونڈ اور تقریباً چھبیس سو پاکستانی روپے بنتے تھے ادا کریں گئے۔ ہمارے لئے یہ سودا بہت ہی سستا تھا۔ اُتنے پیسے برطانیہ میں تو ایک ٹرپ میں ہی ٹیکسی والا لے لیتا ہے۔ گاڑی میں پٹرول ہمیں ڈلوانا تھا۔ لیکن مصر میں تو پٹرول

سمجھو مفت ہی ملتا ہے۔ ایک برطانوی پونڈ کے پانچ گیلن۔ جن کی برطانیہ میں مالیت پچیس پونڈ بنتی ہے۔ حمام کے ساتھ معاہدہ طے پانے کے بعد اس نے ہمیں اپنی گاڑی میں بیٹھا کر گھر پہنچایا اور فیصلہ ہوا کہ دوسرے دن صبح سات بجے یہ ہماری رہائش گاہ پر آ جائے گا جہاں سے ہم نے سیر کا باقاعدہ آغاز کرنا ہے۔



قاہرہ میں کیا دیکھا

مزار امام شافعیؒ

جامعہ الازہر

قلعہ صلاح الدین ایوبی

دریائے نیل کی سیر

قاہرہ میں کیا دیکھا

مصر کا دارالحکومت قاہرہ ہے۔ یہ شہر کب آباد ہوا؟ یہ بتانا مشکل ہے۔ عام خیال یہی ہے کہ اس شہر کی بنیاد 969ء میں خلیفہ المعزالدین نے رکھی تھی۔ لیکن قاہرہ کے اردگرد بکھری تاریخ کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطہ پانچ ہزار سال سے آباد ہے۔ موجودہ شہر کے پہلو گیزہ میں آج بھی اہرام، ابوالہول اور اس کے اردگرد میلوں بکھرے کھنڈرات انسان کی موجودگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ آج سے ساڑھے چار ہزار سال پہلے جب اہرام تعمیر ہو رہے تھے۔ تب وہاں کام کرنے والے لاکھوں محنت کش یقیناً اسی خطہ میں رہتے تھے۔ جن کے رہنے کیلئے یہاں بستیاں بسائی گئی ہوں گی۔ اور شہر کی پشت پر مقطم نامی پہاڑ سے پتھر کاٹ کاٹ کر اہرام تعمیر کیے جاتے رہے تھے۔ فرعون خود اور ان کے امراء موجودہ شہر سے پندرہ میل دور دریائے نیل کے کنارے ممفیس کے مقام پر اپنے دارالحکومت میں رہتے تھے۔

قاہرہ ایک شہر کا نام نہیں بلکہ مختلف بستیوں اور شہروں کا مجموعہ ہے۔ رومن حکمرانوں نے قاہرہ قدیم میں ایک قلعہ اور شہر کے اردگرد دیوار تعمیر کروائی تھی۔ یہ قلعہ بالکل اُسی جگہ تھا جسے آج کل بلاان کہتے ہیں۔ بعد میں اس علاقہ پر عیسائیوں نے قبضہ کرلیا۔ اور ایک میل کے اندر اندر بیس گرجا گھر تعمیر کر ڈالے۔ اُن میں سے پانچ اب بھی موجود ہیں۔ عیسائی علما کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم جب بیت اللحم فلسطین سے مصر آئیں تو اسی علاقہ میں اُن کا قیام رہا۔

یہودی علماء کے دعویٰ کے مطابق قاہرہ قدیم میں واقع سینگاگ والی جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش ہے۔ حضرت عمرو ابن عاص نے جب 641ء میں مصر فتح کیا تو انہوں نے افریقہ میں پہلی مسجد کی بنیاد اسی علاقہ میں رکھی تھی۔ جو آج بھی موجود ہے۔ اس طرح کے بہت سے تاریخی واقعات اس بات کو تقویت دیتے ہیں کہ یہ شہر دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ایک ہے۔ اور اس کی سنگ بنیاد کی تاریخ 969ء یقیناً درست نہیں ہے۔ کچھ ماہر مصریات کا خیال ہے کہ یہ شہر دور فراعنہ میں چھٹی صدی قبل مسیح میں آباد ہوا تھا۔

مصر کی تاریخ بڑی پرانی ہے۔ اس پر 3000 ق م سے 341 ق م یعنی 2659 سال تک فراعنہ کی حکومت رہی۔ فراعنہ کو جب زوال آیا تو یونانیوں نے ملک پر قبضہ کر کے 302 سال تک حکومت کرتے رہے۔ پھر رومن آئے جنہوں نے 30 ق م سے 638ء تک حکومت کی۔ رومن حکمرانوں کو مسلمانوں نے 640ء میں شکست دیکر مصر پر قبضہ کیا۔ اور پھر 1517ء تک مسلسل نو سو سال تک عرب مملوک مصر کے حکمران رہے۔ 1517ء میں عثمانی سلطنت کا آغاز ہوا جس کا خاتمہ 1882ء میں ہوا۔ اس دوران چار سال کیلئے 1797ء سے 1801ء کے دوران فرانس نے مصر پر حکومت کی۔ 1882ء میں برطانیہ نے مصر پر قبضہ کیا۔ برطانیہ نے 1922ء میں مصر کو محدود آزادی دی۔ برٹش راج کے دوران 1892ء سے 1922ء تک عباس حلمی اقتدار میں شریک رہا۔ عباس حلمی کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا فہد اول برسر اقتدار آیا۔ جس کی حکومت 1936ء میں ختم ہوئی۔ پھر کنگ فاروق کی باری آئی۔ جسے 1952ء میں ناصر نے معزول کر کے ملکی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لی۔ 1970ء میں ناصر فوت ہوئے تو انور سادات نے حکومت سنبھالی۔ 1981ء میں انور سادات کو جب گولی مار کر قتل کیا گیا تب سے حسنی مبارک مصر پر حکومت کر رہے ہیں۔

مصر کی آبادی چھ کروڑ ہے۔ ملک میں صدراتی نظام حکومت ہے۔ منتخب ارکان کی ایک اسمبلی بھی ہے۔ جس کے 458 ممبر ہیں۔ دس ممبر صدر مملکت نامزد کرتا ہے باقی 448 ممبران کو عوام منتخب کرتے ہیں۔ صدر کو اسمبلی منتخب کرتی ہے اور ہر چھ سال کے بعد ریفرنڈم کے ذریعے صدر کی معیاد کی تجدید ہوتی ہے۔ اسمبلی کے علاوہ دو سو دس ممبران کی مجلس شوریٰ بھی ہے۔ جس کا کام حکومت کو مشورے دینا ہے۔

اہل مصر اپنے ملک کو ''اُم دنیا'' کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور قاہرہ اُم دنیا کا صدر مقام ہے۔ ''اُم دنیا'' کا خطاب دینے کا مطلب غالباً یہی ہوسکتا ہے کہ یہ شہر دنیا کی سب سے قدیم تہذیب کا گہوارہ ہے۔ اہل مصر اُس وقت ترقی کی شاہرہ پر گامزن تھے جب دنیا تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جب دنیا پتھر کے دور میں تھی تب اہل مصر پتھر کے دور کو خدا حافظ کہہ کر دھات کی دنیا میں داخل ہو چکے تھے۔ دریائے نیل کے اردگرد کھیتی باڑی کا جدید ترین نظام متعارف ہو چکا تھا اور مصر کے کاریگر جن میں سنگ تراش، معمار، بت ترش سے لیکر آرکیٹیک تک سب کے سب اپنے عروج پر تھے۔ جن کے فن کو آج بھی لوگ اہرام اور ابوالہول کی شکل میں دیکھ کر بے ساختہ اُن عظیم کاریگروں کے ہنر کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ اُن کاریگروں کا ذکر تھوڑا آگے چل کر۔

آیئے پندرہ ملین آبادی کے شہر قاہرہ کو جو افریقہ اور مشرق وسطیٰ کے تمام شہروں سے بڑا ہے اور جہاں افریقی، عربی اور یورپی کلچر آپس میں گتھم گتھا نظر آتے ہیں کو ذرا قریب سے گھوم پھر کر دیکھیں۔

مزار امام شافعیؒ

قاہرہ کی سیاحت کا آغاز ہم نے قدیم شہر میں واقع حضرت امام شافعیؒ کے مزار سے کیا۔ یہ مزار قدیم شہر میں دارالسلام کے علاقہ میں ہے۔ ہماری گاڑی ایک بڑی شاہرہ صلاح سلیم سٹریٹ جو رنگ روڈ کی مانند ہے پر چلتے چلتے دائیں طرف شاہرہ امام شافعی پر مڑی تھوڑا چلنے کے بعد دوبارہ دائیں ہاتھ مڑ کر ایک محلّہ میں داخل ہوئی۔ محلے کے مکان قدرے خستہ حال اور بعض کو سیمنٹ کی بجائے مٹی سے لیپ کیا ہوا تھا۔ گلیاں تنگ بالکل وطن عزیز کے دیہاتوں کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ مکانوں کے اردگرد چاردیواری تھی۔ اور گیٹ پر لکڑی کے بوسیدہ دروازے تھے۔ جن کے ساتھ لوہے کے زنجیر لٹک رہے تھے۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی نہ کوئی اندر موجود ہے۔ ورنہ گھر سے باہر جاتے وقت ہر کوئی تالہ لگا کر نکلتا ہے۔ محلّہ میں ایک پرچون کی دکان بھی دیکھی۔ دکاندار ایک بوڑھا مصری تھا۔ جو دکان کے باہر بیٹھا دستی پنکھے سے مکھیاں اڑا رہا تھا۔ کچھ بچے بھی دیکھے جنہوں نے دکان سے ٹافیاں خریدیں اور وہاں ہی کھڑے کھا رہے تھے۔

بچوں کے کپڑے میلے، پاؤں سے ننگے اور ناک بہہ رہے تھے۔ بعض بچے بہتے ناک اپنی قمیض کی آستین سے صاف کر رہے تھے۔ کچھ بہتی ناک کے ساتھ ساتھ میٹھی ٹافیوں کو بھی نگل رہے تھے۔ ان بچوں کے علاوہ گلیاں سنسان تھیں۔ البتہ چند ایک آوارہ کتے گلیوں میں دم دبائے بھاگ رہے تھے۔

ہماری گاڑی گلیوں سے گزرتی ہوئی آخر دائیں ہاتھ مڑ کر محلہ شافعی کی جامع مسجد کے سامنے رک گئی۔ یہ مسجد امام شافعی تھی۔ جس کے اندر امام صاحب ابدی آرام فرما رہے ہیں۔ ہم صبح دس بجے وہاں پہنچے۔ مسجد بند تھی لیکن امام صاحب کے مزار کے دروازے لوگوں کیلئے کھلے تھے۔ باہر چند بوڑھی عورتیں اور مرد روایتی مصری لباس پہنے بیٹھے تھے۔ جو ہمیں دیکھ کر ہماری طرف لپکے اور بخشیش کا تقاضا کرنے لگے۔ یہ لوگ ہمیں مستحق نظر آئے۔ ہم نے توفیق کے مطابق اُن کی خدمت کی۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہی مانگنے والے اِدھر اُدھر سے اچانک اس طرح نمودار ہوئے جس طرح برسات میں مینڈک نکلتے ہیں۔ مجھے یہاں مینڈکوں کے ٹرانے کی بجائے بخشیش بخشیش کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک بڑا موٹا مسٹنڈا فقیر جس نے میلے رنگ کا ایک لمبا عربی لباس پہنا ہوا تھا۔ اپنے سے قدرے کمزور لوگوں کو روک کر خود آگے بڑھنے کی کوشش میں تھا۔ اس دوران جب ایک پستہ اور مڑیل چوسلے منہ والا بھکاری اس دیوہیکل موٹے کی ٹانگوں کے نیچے سے گزر کر ہماری طرف دوڑا تو پیچھے سے اُس موٹے مسٹنڈے فقیر نے غراتے ہوئے اُسے دبوچ کر یوں گھسیٹا جس طرح چیتا لومڑ کو پکڑ کر گھسیٹتا ہے۔

دوسری طرف موٹی موٹی عورتوں کا ایک غول بھی عربی لباس میں بخشیش کی تگ ودو میں دھینگا مشتی کرتے ہوئے ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ عورتیں اس قدر موٹی تھیں کہ ایک دوسرے کو سہارا دیکر چلتی تھیں۔ اِن فربا عورتوں کو دیکھ کر میں سوچنے لگا۔ اللہ تعالیٰ عظیم و برتر ہیں۔ جو اس مخلوق کو رزق دیتے ہیں۔ اللہ میاں نے اگر خوراک رسانی کا کام ہماری طرح کے انسانوں کے ذمہ لگا دیا ہوتا تو ممکن ہے ہم ایسے لوگوں کو دیکھ کر کب کے ہمت ہار گئے ہوتے۔ اس وقت ہمیں ان موٹی عورتوں کی خوارک کی فکر نہیں تھی بلکہ فکر یہ تھی کہ اِن لوگوں سے نبٹا کیسے جائے۔ حالات کی نزاکت کے پیش نظر ڈرائیور ھمام کو کچھ نقدی دیکر یہ ذمہ داری لگائی کہ وہ ان لوگوں کی دادرسی کریں۔

ہم ایک کونے میں دبکے کھڑے تھے کہ عربی لباس میں ملبوس ایک مجاور مزار کے اندر سے نکل کر ہماری طرف لپکا۔ میں نے غور سے دیکھا تو بغیر ڈاڑھی کے بڑی بڑی مونچھوں والے اس ہٹے کٹے بندہ خدا جس نے غالباً کافی دنوں سے نہ تو غسل کیا اور نہ منہ دھونے کی زحمت کی تھی۔ چنانچہ اس ''بے وضو امام'' نے آگے بڑھ کر ہماری رہنمائی شروع کر دی اور ہمیں امام شافعیؒ اور وہاں قرب و جوار میں دوسری قبریں دکھانی شروع کر دیں۔ ہم نے فاتحہ خوانی کی۔ اور مزار کے اندرونی حصہ کا جائزہ لیا تو یہ ایک پرانی، بوسیدہ اور اپنے دور کی بے مثال اور باوقار عمارت تھی۔ بدلتے زمانے کے ساتھ ساتھ اس کی مرمت اور تزئین کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ امام شافعیؒ کی قبر عرب کی روایتی قبروں کی طرح زمین سے کوئی پانچ فٹ اونچی تھی جس پر سبز چادریں بچھی تھیں۔ فرش پر قدرے پرانا کارپٹ تھا۔ دیواروں، فرش اور مزار پر دھول نمایاں طور پر نظر آ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کے مجاوروں کو اپنی بخشیش سے تعلق ہے ان کا امام صاحب اور انکے مزار سے کوئی قلبی تعلق نہیں۔ اور نہ ان لوگوں نے امام صاحب کی تعلیمات سے استفادہ کیا۔ اگر ان لوگوں کا امام صاحب سے قلبی لگاؤ ہوتا تو مزار کو قدرے بہتر حالت میں رکھتے۔ مزار کے باہر صحن اور گلیوں میں بھی خاک اڑتی نظر آ رہی تھی۔ یہ دیکھ کر میں سوچنے لگا کہ کیا امام شافعیؒ کے بارے میں علامہ اقبال کی دعا بھی قبول نہیں ہوئی:

سبز بادا خاک پاک شافعیؒ
عالمے سرخوش تاک شافعیؒ

(ترجمہ: اے خاک پاک شافعی تو سرسبز و شاداب رہے۔ تیرے چشمہ علم سے ایک عالم مستفید ہو رہا ہے)۔

جب میں مزار کے اندر گھوم پھر کر اس کی زیارت کر رہا تھا۔ تب میرے ذہن میں امام صاحب کی زندگی کے اہم واقعات گھوم رہے تھے۔ ابوعبداللہ محمد بن ادریس الشافعیؒ کا شجرہ نسب ہاشمی قریش خاندان سے ملتا ہے۔ ان کا نام ابوعبداللہ محمد بن ادریس الشافعیؒ تھا۔ ان کی پیدائش فلسطین کے علاقہ غزہ کے اسقلان نامی گاؤں میں ہوئی۔ 150 ہجری میں امام شافعیؒ پیدا ہوئے تو اُسی سال امام ابوحنیفہ فوت ہوئے۔ جب امام شافعیؒ کی عمر دو سال تھی تب ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ یوں انہیں آبائی وطن مکہ معظّمہ بھیج دیا۔ جہاں ان کی پرورش عین اسلامی ماحول میں

ہوئی۔عرب کی روایات کے مطابق تیر اندازی اور گھوڑا سواری سیکھی۔ یہ بڑے اچھے تیرانداز تھے۔ بچپن میں یتیم ہونے کی بناء پر انتہائی غربت تھی۔ ماں کیلئے باقاعدہ تعلیم کے اخراجات پورے کرنے مشکل تھے۔علم کی پیاس بجھانے کی خاطر مسجد کے باہر بیٹھ کر درس و تدریس سنتے رہتے تھے۔ چونکہ باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کیلئے پیسے نہیں تھے۔ایک دن ایک استاد نے انہیں دیکھ کر اندر بلایا اور باہر بیٹھنے کی وجہ پوچھی۔ امام صاحب نے صاف صاف سارے حالات بتائے اور پھر اس دوران جو سبق زبانی یاد کرلیا تھا وہ بھی سنا دیا۔اس پر استادمحترم نے سر پر دست شفقت رکھتے ہوئے اُن کی فیس معاف کرتے ہوئے اُنہیں باقاعدہ مدرسے میں داخل کرلیا۔امام صاحب جس مدرسے میں خود پڑھتے تھے وہاں اپنے سے کم عمر بچوں کو پڑھا کر گھریلو اخراجات پورے کرتے تھے۔ سات سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کرلیا تھا۔دس سال کی عمر میں انہیں فتویٰ مالکی یاد ہوگیا۔ پھر حدیث اور فقہ کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے تو اس قدر فقہ میں عبور حاصل کیا کہ جب یہ پندرہ سال کی عمر کو پہنچے تو ایک دن ان کے استادمحترم مسلم ابن خالد الزنگی جو مفتی مکہ بھی تھے نے فرمایا: ''ابوعبداللہ تم فتویٰ جاری کرو۔اب تم اس قابل ہو چکے ہو''۔

علم کی پیاس بجھانے کی خاطر سفر کا آغاز کیا۔ پہلے مدینہ منورہ گئے جہاں امام مالک سے دس سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔ امام مالک امام شافعی جیسے غریب طلباء کے مالی اخراجات اپنی جیب سے پورا کرتے تھے۔179 ہجری میں امام مالک کی وفات کے بعد آپ مکہ تشریف لے گئے۔ اس دوران آپ کو یمن کے شہر نجران میں جج مقرر کیا گیا۔ جہاں پانچ سال جج رہے۔ پھر گورنر یمن سے ایک مسئلہ پر اختلاف ہوا۔جس نے آپ کو گرفتار کر کے عراق میں خلیفہ ہارون رشید کے پاس بھیج دیا۔ ہارون رشید علم دوست تھا جس نے آپ کو باعزت بری کر دیا۔ پھر شام سے ہوتے ہوئے واپس مکہ معظمہ آئے۔ کچھ عرصہ بعد دوبارہ بغداد گئے جہاں تین سے چار سال بسر کیے۔ پچاس سال کی عمر میں بغداد سے مصر آئے اور قاہرہ میں آ کر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ امام شافعی قرآن اور حدیث کو دوسری تمام باتوں پر فوقیت دیتے تھے۔امام غزالی لکھتے ہیں کہ امام شافعی فرمایا کرتے تھے کہ:

''اگر ایک صحیح حدیث موجود ہو تو میرا عقیدہ اُس کے مطابق ہے۔اگر آپ یہ محسوس کریں کہ جو کچھ میں کہہ رہا

ہوں وہ حدیث کے خلاف ہے تو تم میری بات کی بجائے

حدیث پر عمل کرو۔‘‘

امام شافعیؒ کی مشہور زمانہ تصنیف ’’رسالہ‘‘ ہے۔ یہ انتہائی مستند کتاب ہے۔ جب سلطان صلاح الدین ایوبی نے مصر فتح کیا تو امام شافعی کی تعلیمات پر عمل کروایا۔ اور الازہر کے سربراہ کیلئے لازمی قرار دیا کہ اُن کا تعلق امام شافعی کے مسلک سے ہو۔ آج بھی الازہر کے امام کا مسلک شافعی ہے۔

جب میں گھوم پھر کر امام صاحب کے مزار کو دیکھ رہا تھا تب یعقوب آزاد اور محمد بکاری وہاں قریب ہی نفل ادا کرنے میں مصروف تھے۔ اور منیر حسین یہ تمام مناظر کیمرے کی آنکھ میں بند کر رہے تھے۔ امام صاحب کی قبر کے قریب امام وکیع اور امام ابواللیث ثمر قندی کے مزار ہیں۔

امام شافعی 30 رجب 204 ہجری بمطابق 819 عیسوی بروز جمعہ 58 سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ جنازے میں ان کے بیٹے ابوحسن محمد اور عثمان بھی شریک ہوئے۔ فوت ہونے سے قبل امام صاحب نے بتایا کہ: ’’میں نے گذشتہ سولہ سال سے کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ چونکہ زیادہ کھانے سے انسان کا دل سخت اور نیند کا غلبہ ہوتا ہے۔ ایسے میں مذہبی فرائض کی ادائیگی میں سستی لائق ہو جاتی ہے۔‘‘ امام صاحب کا مزار ایوبی دور کے سلطان ملک الکمال نے 608 ہجری بمطابق 1211 عیسوی کو تعمیر کروایا تھا۔

ہم نے مزار کے مجاور کے ساتھ چند تصویریں بنوائیں اور مجاور کی مٹھی گرم کر کے امام صاحب کے مزار سے باہر آ گئے۔ باہر نکلے تو دیکھا موٹی موٹی عورتیں، مرد اور بچے ہمارے انتظار میں یوں بیٹھے ہوئے تھے جس طرح گدھ مردے کے انتظار میں ہوتے ہیں۔ یہ پروفیشنل گداگر ہمیں دیکھتے ہی ہماری طرف دوڑے۔ بھلا ہو بکاری اور حمام کا جنہوں نے عربی میں انہیں کچھ سمجھایا اور ہمیں اپنی تحویل میں رکھ کر کار میں بیٹھا کر اندر سے شیشے اور دروازے بند کر دیئے۔ یوں میں سوچتا ہوا مزار سے رخصت ہوا کہ یہ لوگ اپنا پیٹ پالنے کیلئے تو امام شافعیؒ کے مزار کا سہارا لیتے ہیں لیکن امام صاحب کی تعلیمات سے بالکل ناآشنا ہیں ورنہ یہ بھیک مانگنے کی بجائے علم حاصل کر کے دنیا میں باعزت زندگی گزارتے۔

بادشاہوں کے مزار

امام شافعی کے مزار سے نکلے تو میں نے خواہش ظاہر کی کہ اگر ہو سکے تو گاڑی کسی جگہ کھڑی کر دیں تا کہ میں پیدل چل کر محلے کے لوگوں سے باتیں کروں اور مصر کی حقیقی زندگی کو ذرا قریب سے دیکھوں۔ میری فرمائش پر ھمام نے محلہ میں گاڑی کھڑی کرنے کی کوشش کی لیکن گلیاں تنگ تھیں جس کے لئے وہ مناسب جگہ کی تلاش میں تھا کہ اُسے چند پولیس والے ایک بڑے گیٹ کے سامنے کھڑے نظر آئے۔ ھمام نے اُن سے پوچھا کہ یہ کون سی عمارت ہے۔؟ پولیس نے بتایا کہ یہ ملوک کے مزارات ہیں۔ ہم نے گاڑی کھڑی کی اور اندر چلے گئے۔ یہ مصر کے مسلمان بادشاہوں کے مزارات تھے۔ بڑے بڑے کمروں میں اونچی اونچی قبروں پر بڑے بڑے کتبے نصب تھے جس پر اُن ملوک کی تفاصیل لکھیں ہوئی تھیں۔ اس میں ایک ہی خاندان کے تمام حکمرانوں اور انکی بیگمات کی اجتماعی قبریں تھیں۔ یہ پاشا حکمرانوں کے مزار تھے۔ ان کے جدامجد محمد علی پاشا جو البیپا کے باشندے تھے۔ ان کی پیدائش میسوڈونیا میں ہوئی۔ یہ برطانوی فوج میں افسر تھے۔ محمد علی کو 1892ء میں مصر میں تعینات کیا گیا۔ پھر مغرب نے اپنے مخصوص ایجنڈے پر عمل کرتے ہوئے محمد علی کو مصر کا بادشاہ قرار دیکر مصر کو سلطنت عثمانیہ سے الگ کروا دیا۔ پاشا حکمرانوں کا آخری فرماں روا کنگ فاروق تھے جن کی حکومت کو 1952ء میں جمال عبدالناصر نے ختم کر کے ملکی مسند پر خود قبضہ کر لیا تھا۔

یہاں تمام مزارات محمد علی پاشا اور اُس کے جانشینوں کے تھے۔ یہاں اسماعیل پاشا کی قبر بھی تھی جس نے مصر کے شہر اسماعیلیہ کی بنیاد رکھی تھی۔ ابراہیم پاشا اور مصطفے پاشا بھی یہاں آرام فرما رہے ہیں۔ ان مزارات کے ساتھ ایک بڑے ہال میں چوبیس قبریں تھیں۔ گائیڈ نے بتایا کہ یہ اُن معززین کی قبریں تھیں جو محمد علی پاشا کے خلاف تھے چونکہ محمد علی پاشا مصر کو سلطنت عثمانیہ سے الگ کر رہا تھا۔ 1811ء میں محمد علی پاشا نے اپنے اِن چوبیس مخالفین کو دوستی کا پیغام بھیج کر قاہرہ کے قلعہ میں کھانے کی دعوت دی۔ دعوت کے بعد جب وہ جانے لگے تو قلعہ کے مین گیٹ پر سب کو قتل کروا دیا۔ جب گائیڈ مجھے یہ بتا رہا تھا تب میں سوچ رہا تھا کہ ظلم ڈھانے میں سب بادشاہ برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

حیرت کدہ

مملوک کے مزار پر گائیڈ نے بتایا کہ اس علاقہ کا نام دارالسلام ہے۔ یہ شہر کا قدیم محلّہ ہے۔ یہاں کے لوگ اس قدر قدامت پرست ہیں کہ فراعنہ کی طرح آج بھی اپنی میتوں کو اہرام میں رکھتے ہیں۔ یہ سن کر میں چونکا تو گائیڈ نے کہا یہ بالکل ٹھیک بات ہے۔ آپ کو اس محلے اور اُن کے باہر بیٹھے لوگ نظر آتے ہیں حقیقت میں قبرستان میں رہتے ہیں۔ اس محلّہ کے ہر مکان کے تہہ خانے میں ایک کونہ میتوں کیلئے مخصوص رکھا جاتا ہے۔ جب خاندان میں کسی کی موت واقع ہو جائے تو میت کو گھر کے تہہ خانے کے اُس قبر نما کمرے میں رکھ کر اُسے بڑے بڑے پتھروں کی سلوں سے بند کر دیا جاتا ہے۔ جس طرح قبر میں میت رکھ کر اوپر تختے رکھ کر مٹی ڈال دی جاتی ہے۔ جب کسی اور کی موت واقع ہوتی ہے تو اُس قبر نما کمرے کو کھول کر اُس میں دوسری میت بھی رکھ کر اُسے پھر بند کر دیا جاتا ہے۔ کچھ گھروں کے صحن میں بھی مردوں کو دفن کر دیتے ہیں۔ یہ بات سن کر مجھے بڑی تجسس ہوئی۔ چنانچہ میں نے ڈرائیور ھمام کو کہا کہ مجھے کسی ایک گھر کے اندر جا کر یہ سب کچھ دیکھنا ہے۔ ھمام نے حامی بھر لی۔ چنانچہ اسی گلی میں بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے سے ھمام نے عربی میں بات کی جس نے ہاں میں سر ہلایا تو ھمام نے کہا آپ اُتر کر اس بابا کے گھر جا کر دیکھ آئیں ۔ ہم آپ کا انتظار کرتے ہیں۔ میرے دوستوں میں سے کسی کو بھی اِن مردوں سے ملنے کا شوق نہیں تھا۔ چنانچہ وہ گاڑی میں بیٹھے رہے اور میں بابا کے ساتھ اُس کے گھر کے اندر گیا۔ اور دیکھا کہ لوگ مکان میں عام زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہنستے کھیلتے دوڑتے ناچتے اور سوتے ہیں اور گھروں کے تہہ خانوں اور صحن میں اُن کے بزرگ ابدی آرام فرما رہے ہیں۔ یہ بات میرے لئے ''حیرت کدہ'' تھی۔

گھر میں موجود ایک نوجوان نے مجھے بتایا کہ: '' قاہرہ میں اس طرح کے پانچ قبرستان ہیں۔ جن میں تقریباً پانچ ملین لوگ رہتے ہیں۔ ان قبرستانوں میں رہنے والے لوگ قاہرہ کے عام باشندوں کی نسبت نرم دل اور ایک دوسرے سے تعاون کرنے والے ہیں۔ یہ وہی قبرستان ہیں جہاں مسلمان فاتح اپنے شہیدوں کو دفن کیا کرتے تھے۔ ان میں فاطمی، عباسی، ایوبی، مملوک اور عثمانی سب ہی شامل ہیں۔ ہم لوگ انہیں قبرستان نہیں بلکہ زندگی بسر کرنے والی

جگہ سمجھتے ہیں۔ چونکہ قاہرہ میں مکانوں کی قلت ہے۔ روز بروز آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس جگہ کو چھوڑ دیں۔ چونکہ یہاں کیڑے مکوڑے، مچھر اور مکھیوں کی بہتات ہے۔ لیکن جب تک ہمیں حکومت کی طرف سے مناسب گھر نہیں ملتے ہم گلیوں میں رہنے کی بجائے اس قبرستان میں رہنا پسند کریں گئے''۔

یہ بات میں نے دوستوں کو بتائی تو منیر حسین بولے بادشاہو! ''ہمارے شہر ڈڈیال میں ایک صاحب نے قبرستان کے قریب مکان بنوایا تو گاؤں کی خواتین اُسے سمجھاتی تھیں کہ بھائی صاحب ایسا نہ کریں۔ یہ نہ ہو کہ مکان بن جائے اور قریبی قبرستان کی روحیں رات کو آ کر تمہیں تنگ کریں۔ لیکن یہاں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے زندہ لوگ اپنے مردہ رشتہ داروں کی روحوں سے گدگدی کرتے ہیں۔''

کچھ لوگ اس علاقہ سے جدید شہر میں منتقل ہو چکے ہیں اُن کے مکان خالی ہیں۔ لیکن اپنے آباؤ اجداد کی قبروں کی بدولت وہ انہیں فروخت نہیں کرتے۔ ایسے مکان سنسان ہیں۔ سنا ہے شہر کے آوارہ لڑکے اور لڑکیاں رات کو ایسے مکانوں میں گھس کر تنہائی میں پتہ نہیں کیسی کیسی رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ ویسے مجھے اس علاقہ میں بہت بے رونقی نظر آئی۔ علاقہ بالکل سنسان تھا جس میں چند بوڑھوں کے سوا مجھے کوئی بھی نظر نہیں آیا۔

دارالسلام کے علاقے میں قاہرہ کے حقیقی باشندوں کو دیکھنے اور ملنے کا موقع ملا۔ یہ لوگ غریب ہیں لیکن اپنی قدیم تہذیب وتمدن کے امین ہیں۔ ان کے لباس اور طرز زندگی مصری ہے۔ جب میں اس قدیم شہر میں گھوم رہا تھا تب مجھے لاہور کا بھاٹی گیٹ بار بار یاد آ رہا تھا۔ جہاں لاہور کے اصل اور قدیمی باشندے آباد ہیں۔ قاہرہ کے باشندوں کی اکثریت نے اپنا مصری لباس، طرز زندگی بدل کر یورپی طرز زندگی اختیار کر لی ہے جس سے اصلی مصری تہذیب غائب ہے۔ اور میرے جیسے سیاح تو ہر ملک میں اُن کی تہذیب وتمدن اور ملک دیکھنے جاتے ہیں ورنہ ہم یورپی لباس دیکھنے ولایت سے وہاں کیوں جاتے۔

حضرت زینبؓ کا مزار

مصری قبرستان سے نکل کر ہم دارالسلام کے علاقہ میں محلّہ زینبیہ گئے۔ مقامی لوگوں

کا دعویٰ ہے کہ یہاں حضرت امام حسینؓ کی ہمشیرہ حضرت زینب اور صاحبزادی حضرت نفیسہؓ مدفن ہیں۔ ہم نے گاڑی پارک کی اور مزار کے اندر چلے گئے۔ مزار پر اہل تشیع حضرات کی اکثریت تھی۔ میں نے مزار پر حاضری دی لیکن میرا دل نہیں مانتا تھا کہ اہل بیت یہاں تک آئے۔ مجھے یاد آیا ابھی کچھ عرصہ پہلے جب میں شام کے دارالحکومت دمشق گیا تو وہاں قریب ہی زینبیہ کے علاقہ میں حضرت زینبؓ کے مزار پر بھی حاضری دی تھی۔ تاریخی لحاظ سے مجھے شام والا مزار حقیقی نظر آتا ہے۔ چونکہ دمشق بہت عرصہ اسلامی دارالخلافہ رہا۔ اور پھر واقعہ کربلا کے بعد یزیدی فوجیں آل رسولؐ جن کی قیادت حضرت زینبؓ فرما رہی تھیں کو قیدی بنا کر دمشق لے آئے تھے۔

قاہرہ میں حضرت زینبؓ کے مزار سے تھوڑا دور یہودیوں کا سینگاگ ہے۔ جس کے بارے میں یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ فراعنہ کے زمانے میں یہاں بنی اسرائیل آباد تھے۔ یہاں ہی حضرت موسیٰ نے جنم لیا تھا۔ فرعون وقت کے خوف سے حضرت موسیٰ کی ماں نے بچے کو ایک ٹوکری میں رکھ کر دریائے نیل میں بہا دیا تھا۔ میرے خیال میں یہودیوں کا یہ دعویٰ غلط ہے۔ اگر یہودیوں کی بات سچ مانی جائے تو قاہرہ شہر کے اس مقام سے دریا نیل ڈیلٹا کی طرف بہتا ہے۔ جدھر قریب ترین کوئی بھی شاہی محل نہیں تھا۔ البتہ جدھر سے دریا بہہ کر آتا ہے اُس طرف ممفس کے مقام پر شاہی محلات تھے۔ ظاہر ہے ٹوکری دریا میں الٹی بہہ کر محلات کی طرف نہیں جاسکتی تھی۔ ٹوکری کو دریا کے بہاؤ کے ساتھ ہی بہنا تھا۔ ایسے میں یہودیوں کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قاہرہ میں پیدائش کا دعویٰ غلط ثابت ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بنی اسرائیل قاہرہ کی بجائے مصر کے شمالی علاقہ ڈیلٹا میں آباد تھے۔ حضرت موسیٰ اسی علاقہ میں پیدا ہوئے اور پھر ڈیلٹا میں فرعون رعمیس کے محل میں پرورش پاتے رہے۔

جامعہ الازہر

حضرت زینب کے مزار سے نکل کر ہم دن کے بارہ بجے دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹی الازہر پہنچے۔ گاڑی کار پارک میں کھڑی کی۔ تو سڑک پر کھڑا ایک پولیس مین میری طرف لپکا اور بغل گیر ہو کر فوٹو بنوایا۔ فوٹو بنواتے وقت وہ اس قدر خوش تھا کہ اُس کے دانتوں پر تازہ تازہ

کھائی ہوئی نسوار کے نشان واضح نظر آ رہے تھے۔ مجھے تو یہ اپنے وطن کے خان صاحب ہی معلوم ہوتے تھے۔

جس دن ہم الازہر پہنچے اُس سے ایک ہزار چھتیس سال قبل 971ء میں اس عظیم درسگاہ کی بنیاد خلیفہ المعز الدین اللہ کے ایک فوجی کمانڈر گوہر السکلی نے رکھی تھی۔ حضور اکرمؐ کی چہیتی صاحبزادی حضرت فاطمہ الزہرا کے نام کی مناسبت سے اس درسگاہ کا نام ''الازہر'' رکھا۔ دوسال کے اندر اندر مسجد تعمیر ہوئی۔ مصر میں یہ فاطمی دور تھا۔ چنانچہ بہت عرصہ یہاں فاطمی عقیدہ کے مطابق تعلیم دی جاتی رہی۔ جب سلطان صلاح الدین ایوبی برسراقتدار آئے تو انہوں نے فاطمی تعلیم کا خاتمہ کر کے حنفی، شافعی، حنبلی اور مالکی عقیدہ کے مطابق تعلیم جاری کروائی۔ آغاز میں الازہر کی حیثیت ایک مدرسے کی تھی۔ لیکن یہاں کے تعلیمی نصاب اور علمی سرگرمیوں کی جہاں جہاں تک خبر پہنچی وہاں وہاں سے طالب علموں نے دنیا کی اس عظیم درسگاہ کا رخ کیا۔

جامع الازہر کے فارغ التحصیل علماء اپنے ناموں کے ساتھ الازہری کا اضافہ کرتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صاحب الازہر یونیورسٹی کے علمی خزانے لوٹ چکے ہیں۔ آغاز میں باقاعدہ امتحان بھی نہیں ہوتے تھے۔ مقررہ مدت پوری کرنے والے کو سند دے دی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب ہم الازہر سے باہر نکلے تو یعقوب آزاد نے منیر حسین کو ''الازہری'' کا خطاب عطا کیا۔ اور مصر میں قیام کے دوران وہ منیر حسین کو الازہری کے نام سے پکارتے رہے۔

جب ہم الازہر پہنچے اُس وقت لوگ نماز ظہر کیلئے مسجد کی طرف جا رہے تھے۔ طلباء بھی درس و تدریس ترک کر کے مسجد کی طرف رواں دواں تھے۔ ہم وضو کیلئے مسجد کے اُس دروازے سے باہر نکلے جہاں کسی زمانے میں حجام بیٹھا کرتے تھے۔ روایت ہے۔ جب کوئی طالب علم الازہر میں داخلہ لینے آتا تھا۔ تو اُسے علم کی دولت سے مالا مال کرنے سے قبل بالوں کی دولت سے محروم کیا جاتا تھا۔ یوں جب لہراتی زلفوں کی جگہ ''ٹنڈ'' چمکارے مارتی تو پھر اُسے مدرسے میں داخل ہونے کی اجازت دی جاتی تھی۔ ہم اُسی حجام والے دروازے سے باہر نکلے وضو کیا اور بغیر ''ٹنڈ'' کروائے مسجد میں آ کر نماز ظہر ادا کی۔ اگر زمانہ قدیم ہوتا تو ممکن تھا سر منڈواتے منڈواتے ہماری نماز قضا ہو جاتی۔ نماز کے بعد یعقوب آزاد حیران ہو کر میرے پاس

آئے اور کہنے لگے" نظامی صاحب دیکھا ہے۔امام صاحب کی ڈاڑھی برائے نام ہے۔جب کہ میں تو یہ خیال لیے یہاں آیا تھا کہ الازہر کے امام وطلباء کی لمبی لمبی ڈاڑھیاں ہونگی۔اور وہ خشک اور کڑوے مزاج کے مولوی ہونگے" میں نے آزاد صاحب کو بتایا کہ میرے خیالات بھی آپ سے مختلف نہیں تھے۔ لیکن یہاں آکر حیرت ہوئی کہ مصری اور پاکستانی الازہریوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ ہمارے ہم وطن الازہری اپنے مصری بھائیوں کی جگہ بھی ڈاڑھیاں رکھتے اور اُن کی مکمل حفاظت کرتے ہوئے امیر مینائی کے اس شعر کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں کہ:

خنجر پڑے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

نماز کے بعد جو طلباء دیر سے مسجد پہنچے انہوں نے اپنی الگ نماز ادا کی۔میں نے دیکھا ایک بیس سالہ نوجوان جو بغیر ڈاڑھی کے تھا کی امامت میں دوسروں نے نماز ادا کی۔

ہم نے گھوم پھر کر مسجد دیکھی۔لیکن مسجد کی شہرت اور وسعت اسقدر جامع ہے کہ ایک بار دیکھنے سے جی نہیں بھرتا۔ہم نے فیصلہ کیا کہ جمعہ کے دن ہم دوبارہ یہاں آئیں گے۔چنانچہ پروگرام کے مطابق 3 مارچ 2006ء کو نماز جمعہ کی ادائیگی کیلئے دوبارہ الازہر گئے۔الازہر پہنچے تو پولیس کی بکتر بند گاڑیاں قطار میں کھڑی اور پولیس کی ایک بھاری نفری سڑک پر گشت کر رہی تھی۔ہم نے سوچا کچھ گڑبڑ ہے۔لیکن نمازی بلا جھجک اندر جا رہے تھے۔ہم بھی اندر چلے گئے۔ قدیم مسجد کے صحن میں محراب سے تھوڑی دور ہمیں جگہ مل گئی۔اُس وقت صبح کے پونے بارہ بجے تھے۔ ایک صحت مند قاری صاحب تلاوت قرآن پاک فرما رہے تھے۔تلاوت میں بے حد مٹھاس اور حلاوت تھی۔

ٹھیک بارہ بجے محراب کے قریب اندر کی طرف سے دروازہ کھلا اور چھ فٹ کے لمبے چست اور باوقار ایک صاحب مسجد میں داخل ہوئے۔جن کے سر پر ٹوپی اور چہرے پر برائے نام ڈاڑھی تھی۔یہ مسجد کے امام وخطیب شیخ الازہر ڈاکٹر محمد سید طنطاوی تھے۔شیخ الازہر کی آمد پر قاری صاحب نے تلاوت ختم کی اور تخت پوش سے اُتر کر نیچے پہلی صف میں بیٹھ گئے۔اور امام صاحب محراب کے قریب ایک دس فٹ اونچے ممبر پر سیڑھیوں کے سہارے چڑھے جہاں ایک

کرسی پر بیٹھ کر خطاب کیا۔ خطاب کا موضوع قرآن کی روشنی میں عورت کو طلاق دینے کے احکامات تھے۔ خطبہ کے بعد امام صاحب نے وہاں بیٹھے بیٹھے دعا مانگی۔ اور پھر نماز کی امامت فرمائی۔ نماز کے دوران سب نمازی بڑی اونچی آواز میں آمین کہتے تھے۔ نماز جمعہ کے بعد کسی کی نماز جنازہ ادا ہوئی۔ امام صاحب کا خطبہ الازہر کے اخبار میں اُسی دن عربی اور انگریزی میں شائع ہوا تھا۔

نماز کے بعد مسجد کے بڑے صحن میں اخوان المسلمین کا ایک اجتماع ہوا۔ جنہوں نے بلند آواز میں نعرہ تکبیر اللہ اکبر کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ آہستہ آہستہ نمازی وہاں جمع ہوگئے۔ خواتین کے حصے سے عورتیں بھی آکر اس اجتماع میں شامل ہوگئیں۔ ایک صاحب نے کھڑے ہوکر تقریر کی۔ جس کا موضوع آج کے مسلمان اور اُن کے مسائل تھے۔ تقریر کے دوران وقفہ وقفہ سے لوگ ''ایک خدا اور ایک قرآن...... امریکہ مردہ باد'' کے نعرے لگا رہے تھے۔ اسی طرح فلسطین، عراق، افغانستان اور کشمیر کے مسلمانوں کی آزادی کے نعرے بلند ہوئے۔ امریکہ اور ہندوستان نے مسلمانوں کے جن علاقوں پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔ کی پرزور الفاظ میں مزمت کی گئی۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے کسی عرب ملک میں کشمیر کے حوالے سے بات چیت سنی۔ ورنہ ہمیں اکثر عربوں سے یہ شکایت ہی رہی کہ انہیں کشمیر کے مسلمانوں کا کوئی فکر نہیں۔ مقررین نے اس بات پر بھی زور دیا کہ آج امتِ مسلمان کا شیرزاہ بکھرا ہوا ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ہم آپس میں اتفاق اتحاد اور یکجہتی پیدا کریں۔ میں نے یہ بات سنی تو مجھے روزنامہ جنگ کے شاعر انور شعور یاد آئے:

تقاضا کر رہا ہے وقت ہم سے
کہ ہم پیدا کریں بازو میں قوت
مگر سب سے بڑی قوت ہے اپنی
مسلمانان عالم کی اخوت

احتجاج میں شامل الازہر کے چند طلبا سے مجھے ملنے کا موقع ملا۔ جن سے میں نے اس عظیم درس گاہ کے بارے میں جو بات چیت کی جو میرے لئے بڑی سودمند ثابت ہوئی۔ طلباء نے بتایا کہ الازہر یونیورسٹی کے کیمپس قاہرہ کے علاوہ مصر کے تمام صوبوں میں موجود ہیں۔ بلکہ

ایک کیمپس فلسطین کے علاقہ غزہ میں بھی ہے۔قاہرہ میں الازہر کے مین کیمپس میں جو فیکلٹی ہیں اُن میں اسلامی تعلیم کے ساتھ ساتھ، شریعت، اسلامک اینڈ عرب سٹڈی، تبلیغ اسلام، کامرس، ترجمہ، عربی زبان، سائنس، کیمیا، شعبہ دندان، طب، انجینیئر نگ اور زراعت کی تعلیم دی جاتی ہے۔خواتین کے لئے الگ فیکلٹی ہے۔ جنہیں اسلامک اور عربی سٹڈی، کامرس، طب اور سائنس کی تعلیم دی جاتی ہے۔ملک کے دوسرے صوبوں میں جہاں جہاں الازہر کے کیمپس ہیں وہاں وہاں خواتین کے الگ شعبہ جات موجود ہیں۔اس وقت الازہر میں پچیس ہزار سے زائد طلباء وطالبات پچپن فیکلٹی میں زیر تعلیم ہیں۔یوں ہر سال ہزاروں اسلامی سکالر، اعلیٰ معیار کے ڈاکٹرز، انجینیئر اور فزیشن فارغ التحصیل ہوتے ہیں۔ پی ایچ ڈی اور دوسرے تحقیقی کاموں کے لئے سہولیات موجود ہیں۔ اس عظیم درس گاہ میں پچاسی ممالک کے طلباء زیر تعلیم ہیں۔ جن کا کوٹہ دس فیصد سے زیادہ نہیں۔

الازہر کا سربراہ ''شیخ الازہر'' کہلاتا ہے۔جن کی معاونت کے لئے ڈپٹی شیخ الازہر، ڈائریکٹرز اور فیکلٹی کے ڈین موجود ہوتے ہیں۔شیخ الازہر اس عظیم درس گاہ کے چیئرمین بھی ہیں۔جو سپریم کونسل کی میٹنگ بلاتے ہیں۔

الازہر کی سپریم کونسل بھی موجود ہے۔ جس کے پچاس ممبر ہیں۔یہ کونسل اس عظیم درسگاہ کی مستقبل کی منصوبہ بندی کرتی رہتی ہے۔کونسل کا سربراہ سیکریٹری جنرل ہوتا ہے۔جس کا کام فنی، مالی اور انتظامی نظام کے بارے میں منصوبہ بندی کرنی ہے۔یہ منصوبے تیار کر کے سپریم کونسل کے اجلاس میں پیش کرتے ہیں۔ کونسل میں سیکرٹری کے علاوہ بہت سے اسسٹنٹ سیکرٹری بھی موجود ہیں۔

الازہر میں 1967ء سے قرآن پاک کی پرنٹنگ کیلئے قرآن ہاؤس قائم ہے۔ 1929ء سے الازہر کا میگزین بھی باقاعدگی کے ساتھ جاری ہوتا ہے۔ جس کی اشاعت بارہ ہزار ہے۔ الازہر کا کتب خانہ دیکھنے کے لائق ہے۔ یہ 1897ء میں قائم ہوا۔ جس میں اس وقت مختلف موضوعات پر 595,668 کتابیں ہیں۔ دوسری کتب کے علاوہ بیس ہزار نادر کتب بھی موجود ہیں۔ اِن میں قرآن پاک کے قدیمی نسخے جو خطِ کوفی، خطِ فارسی اور نسخ میں لکھے ہوئے ہیں۔ کچھ کتابیں سونے سے لکھی ہوئی ہیں۔ بعض پر خوبصورت نقش نگاری بھی ہے۔ الازہر میں زیر تعلیم طلباء اور سکالرز کا مرکز یہی لائبریری ہے۔ جہاں طلباء کتابیں پڑھتے، ادھار

لیتے اور بعض نادر نسخوں کی فوٹو کاپیاں کرتے نظر آتے ہیں۔

الازہر کا ایک شعبہ اسلامک مشن کہلاتا ہے۔ جس کا کام دنیا بھر کے ممالک میں الازہر کے علماء اور سکالر کی ضروریات کا جائزہ لینا ہے۔ جن جن ممالک میں پہلے سے الازہری خدمات انجام دے رہے ہیں اُن کے معاہدوں کی تجدید کا بندوبست کرنا ہے۔ ان کے علاوہ دنیا کے اسلامک سینٹر، ادارے اور دوسری آرگنائزیشن سے رابطے کر کے اُن کی ضروریات کے مطابق الازہر کے فارغ التحصیل سکالرز کو وہاں بھیجنا ہے۔

مسجد امام حسین

نماز ادا کرنے کے بعد ہم نے الازہر کے سامنے اُس شاہرہ کو عبور کیا جہاں زمانہ قدیم میں الازہر میں زیر تعلیم طلباء سر شام سڑک کے دونوں کناروں پر کھڑے ہو جاتے تو شہر کے مخیر حضرات انہیں کھانا دیتے تھے۔ کھانا عموماً دو دونوں کیلئے پانچ خشک روٹیاں پر مشتمل ہوتا تھا۔ جنہیں طالب علم خشک ہی کھا جاتے یا پھر نمک مرچ کے ساتھ۔ بعض اوقات روٹی کے ساتھ سالن بھی مل جاتا تھا۔ یوں طلباء پیٹ بھرتے اور دینی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ہم اس شاہرہ کو عبور کر کے مسجد امام حسینؓ کی طرف چل پڑے۔ مقامی روایات کے مطابق 1153ء میں حضرت امام حسینؓ علیہ السلام کا سر مبارک یہاں دفن کیا گیا تھا۔ سر مبارک کو کہاں سے لا کر دفن کیا گیا اس بارے میں مقامی لوگ اور مورخ دونوں خاموش ہیں۔ البتہ مزار کے اوپر ایک انتہائی خوبصورت مسجد ہے۔ جو دیکھنے کے قابل ہے۔ واقعہ کربلا 682ء میں پیش آیا تھا۔ یوں 471 سال بعد امام عالی مقام کا سر مبارک قاہرہ لا کر دفن کرنے والی بات دل کو بالکل نہیں بھاتی۔

میرے مطالعہ کے مطابق حضرت امام حسین علیہ السلام کا سر مبارک تن سے جدا کر کے نیزے پر رکھ کر فوجوں کی نگرانی میں دمشق لایا گیا تھا۔ جہاں یزید تھا۔ اُن کے ساتھ آل رسولؐ کے دوسرے سر مبارک بھی لائے گئے تھے جنہیں دمشق میں آل رسول قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا تھا۔ جبکہ امام حسین عالی مقام کا سر مبارک دمشق کی جامع مسجد میں دفن ہے۔ 1999ء میں جب میں دمشق گیا تو اُن مزارات پر بھی حاضری دی تھی۔ جس کا تفصیلی ذکر میری کتاب ''پیغمبروں کی سرزمین'' میں موجود ہے۔

اسلامی ممالک کی سیاحت کے دوران میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنے کیلئے ہم نے اپنے عظیم لوگوں کے مزار ایک سے زیادہ جگہوں پر بنا رکھے ہیں۔لیکن کبھی کسی محقق نے اس کی تردید نہیں کی۔ میں نے نجف اشرف میں حضرت علی کرم اللہ کے مزار پر حاضری دی تو اُس وقت مجھے حضرت علی کے افغانستان میں بنائے ہوئے مزار کی بڑی شدت سے یاد آئی تھی۔ جسے افغانستان کے علاقہ مزار شریف میں اسی آن وشان سے بنایا گیا اور لوگوں کی آمد ورفت سے اُس مزار کی بدولت پورا علاقہ مزار شریف کے نام سے مشہور ہے۔ایسے میں ہمارے محققین کیلئے یہ ایک بڑا چیلنج ہے۔لیکن مسئلہ ہے کہ اس سمت پہلا پتھر کون مارے!

خان الخلیل

مسجد حسین میں حاضری دینے کے بعد ہم وہاں قریب خان الخلیل کے مشہور بازار میں گئے تو وطن عزیز کی یادیں تازہ ہونے لگیں۔اگر کسی سیاح کو مصر کی حقیقی زندگی کی جھلک دیکھنے کا اشتیاق ہو تو وہ خان الخلیل کے بازار میں ضرور جائے۔ جہاں مصر کی گذشتہ چھ سو سال کی ثقافت تہذیب وتمدن چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔یہ بازار 1382ء میں قائم ہوا۔وہ دن اور آج کا دن یہ کبھی بند نہیں ہوا۔ اُس وقت مصر پر ترکی کی حکومت تھی۔یوں کافی عرصہ یہ ''ترکی بازار'' کہلاتا رہا ۔بازار میں سامنے دکانیں اور اُن کے پیچھے رہنے کیلئے مکان ہیں۔اگر آپ گھومتے پھرتے تھک جائیں تو کسی تھڑے پر حقے پیتے مصری کے پاس بیٹھ کر زمانہ بھر کی باتوں کے ساتھ ساتھ حقے کے دو چار ''سوٹے'' مفت میں لگا کر تروتازہ ہو کر پھر چل پڑیں۔ میں نے دیکھا تھڑوں پر بیٹھے بعض مصری بوڑھے گوریوں سے بڑی گرم جوشی سے گلے ملتے اور اپنے پہلو میں بیٹھا کر بڑے پیار ومحبت سے انہیں قہوہ پلانے کے ساتھ ساتھ حقے کے سوٹے بھی لگواتے تھے۔اس حسن سلوک سے گوریاں بھی خوش اور مصری بوڑھے بھی ''ٹھرک'' جھاڑ کر خوش بلکہ چہکتے تھے۔

بازار میں دکانوں کے ساتھ ساتھ کیفے ہاؤس ،قہوہ خانوں ، زیوارت ، ہارسنگار، کپڑے، کارپٹ، رگ Rugs،قدیم زمانے کا فرنیچر، گانے بجانے کے ساز، جڑی بوٹیوں کی دکانیں کے علاوہ چمڑے سے تیار کردہ اشیاء جن میں طرح طرح کے ہینڈ بیگ، بٹوے، جوتے،

چپل بھی دکانوں کے باہر لٹکتے نظر آئے۔ برتنوں کی اس قدر ورائٹی کہ میں انہیں دیکھتا ہی رہ گیا۔ جب میں نے قاعدہ پڑھنا شروع کیا تھا۔ تو سکول میں استاد الف...... انار اور ب...... بکری کے علاوہ ظ...... ظروف بھی پڑھاتے تھے۔ یہ ظ...... ظروف والی بات مجھے کبھی سمجھ نہیں آئی۔ کہ یہ ظروف کیا ہوتا ہے۔ قاعدہ میں جس برتن کی تصویر تھی وہ ہم نے اپنے گاؤں میں کبھی دیکھی ہی نہیں تھی۔ لیکن آج جب میں خان الخلیل بازار میں گیا۔ اور طرح طرح کے جست، تانبے، المونیم اور دوسری دھاتوں کے برتن دیکھے تو مجھے بچپن والا ظ...... ظروف یاد بھی آیا اور سمجھ بھی آئی۔ چلو دیر آید درست آید۔

دکانوں کے علاوہ تھڑے، ریڑھیاں اور ہاتھوں میں اشیاء اٹھائے ہوئے نوجوان بھی گاہکوں کو گھیر کر چیزیں فروخت کرنے میں مصروف دیکھے۔ اس بازار میں وہ سب کچھ مل جاتا ہے جس کی انسان کو ضرورت ہوتی ہے۔ عطر گلاب کا استعمال تو مصریوں میں زمانہ فراعنہ سے چلا آ رہا ہے۔ جسے فراعنہ کی شاہی میتوں پر چھڑکا جاتا تھا۔ لیکن اب مصر کے بازاروں میں اس قدر عطر اور دوسری خوشبوئیں فروخت ہو رہی ہیں کہ سیاح پیرس کو بھول جاتے ہیں۔ اگر آپ برتن یا زیور خریدیں اور اُس پر اپنا نام لکھوانا چاہیں تو دکاندار فوری کندہ کر دیتے ہیں۔

بازار میں خرید و فروخت کے بعد اگر آپ چائے، قہوہ یا کوئی مشروب پی کر تروتازہ ہونا چاہتے ہیں تو وہاں کیفے ہاؤس بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔ جہاں آپ کھانا بھی کھا سکتے ہیں اور شیشہ پی کر سرور بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ جو ذائقہ آپ پسند کریں اُسی ذائقہ کا شیشہ تیار کر کے دیا جاتا ہے۔ جب آپ کھانے پینے میں مصروف ہوتے ہیں تو چیزیں فروخت کرنے والے کیفے ہاؤس کے اندر بھی آ جاتے ہیں جو گھڑیاں، سگرٹ لائٹرز وغیرہ فروخت کرتے ہیں۔ رات کے وقت ان کیفے ہاؤس میں ڈانس بھی ہوتے ہیں۔ جو سیاحوں کے دل بہلاتے ہیں۔ خان الخلیل بازار میں جائیں تو مصر کی جیتی جاگتی تہذیب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔

ہم جوں ہی بازار میں داخل ہوئے تو دکانداروں کے ایجنٹ حضرات اپنی اشیاء کی طرف متوجہ کرنے کی خاطر ہمیں اپنی طرف کھینچنے لگے۔ ہم گھبراتے تو وہ ہم سے مسلمان، پاکستان اور اس طرح کے رشتے یاد دلوا کر ہمارا خوف کم کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہمیں ایک ریڑھی بان ملا۔ جو بڑا دلچسپ اور اہل علم آدمی تھا۔ اُس نے ہمیں اپنی دلفریب باتوں میں یوں

گھیرا کہ مجبوراً اُس کی دکان جو اُس کی ریڑھی کے بالکل پیچھے تھی سے بیوی بچوں کے لئے ڈھیر ساری خریداری کرنی پڑی۔ یورپی لوگوں کے لئے مصر میں خریداری کرنی مشکل ہے۔ چونکہ یہاں خریداری کرتے وقت سودا بازی کرنی پڑتی ہے۔

جب میں برطانیہ سے مصر جانے والا تھا تو میں نے مصر کی سیاحت کے بارے میں محترمی محمود ہاشمی صاحب سے بات کی۔ تو انہوں نے خصوصی ہدایت کی کہ وہاں دکاندار کو منہ مانگی قیمت مت ادا کرنا۔ ہاشمی صاحب نے بتایا کہ:

> ''ایک بار میں مصر گیا وہاں خریداری کیلئے سودا بازی کرنی پڑی۔ میں نے دکاندار سے پوچھا کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ چیزوں کی قیمتیں مقرر کر دیں۔ اس پر مصری دکاندار نے ہنس کر کہا۔ سودا بازی ایک جمہوری طریقہ ہے جبکہ ایک ہی قیمت مقرر کر کے گاہک پر ٹھوس دینا مطلق العنانی ہے۔ آپ یورپ کے لوگ جمہوریت پر یقین تو رکھتے ہیں لیکن خرید وفروخت کے معاملے میں آپ کا رویہ غیر جمہوری اور ڈکٹیٹر شپ پر مبنی ہے۔''

مجھے ہاشمی صاحب کی ہدایت یاد تھیں چنانچہ ہم نے کچھ اس قسم سے سودا بازی کی کہ دکاندار جس چیز کی ساٹھ پونڈ مانگتے ہم پندرہ پونڈ کی پیشکش کرتے تو سودا بیس پونڈ میں ہو جاتا تھا۔ ویسے وہ بازار جہاں سیاح آتے جاتے ہیں وہاں کی قیمتیں بازار کے دوسرے حصوں سے ہمیشہ زیادہ ہوتی ہیں۔

قلعہ سلطان صلاح الدین ایوبی

بعد دوپہر ہم سلطان صلاح الدین ایوبی کے دور میں تعمیر ہونے والے قلعہ کو دیکھنے گئے۔ قلعہ قاہرہ کی پشت پر مقطم نامی پہاڑی پر ہے۔ حمام ہمیں قلعہ کے قریب والی سڑک پر اُتار کر خود کار پارک کرنے چلا گیا۔ سڑک سے قلعہ تک چڑھائی چڑھتے ہوئے جب ہم اوپر پہنچے۔ تو ٹکٹ خریدے۔ فی ٹکٹ کے 35 مصری پونڈ ادا کیے۔ جبکہ یہی ٹکٹ عربوں کیلئے دو پونڈ کا تھا۔ ٹکٹ خریدے تو ایک گائیڈ نے ہمیں گھیر لیا اور وہاں ایک کنواں دکھاتے ہوئے بولا یہ وہی کنواں

ہے جس میں حضرت یوسف علیہ السلام کو بھائیوں نے پھینکا تھا۔ میں نے گائیڈ کو بتایا کہ ’’جو واقعہ آپ بتا رہے ہیں وہ تو فلسطین کے علاقہ کنعان میں پیش آیا تھا۔‘‘ میرے جواب پر گائیڈ اپنی مکاری اور جھوٹ پر پردہ ڈالنے کی خاطر خاموش ہو کر دوسری طرف چلا گیا۔ یوں مجھے معلوم ہوا کہ یہ گائیڈ جاہل ہوتے ہیں جو رٹی رٹائی تقریر سے سیاحوں کو غلط معلومات دیتے رہتے ہیں۔ ورنہ جن سیاحوں کو اس واقعہ کا پس منظر معلوم نہیں وہ بیچارے تو اسی کنواں کو عقیدت سے دیکھتے ہونگے۔

یہ قلعہ 1176ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے تعمیر کروایا تھا۔ جو تقریباً سات سو سال تک مصر کے شاہی حکمرانوں کی سرکاری رہائش گاہ رہا۔ کنواں جس کی نسبت حضرت یوسف علیہ السلام سے جوڑ دی گئی ہے کا حقیقت میں حضرت یوسف علیہ السلام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ کنواں قلعہ میں مقیم شاہی خاندان کو پانی فراہم کرنے کیلئے کھودا گیا تھا۔ قلعہ کے سب سے اونچے مقام پر ایک خوبصورت مسجد ہے۔ جو مسجد محمد علی کہلاتی ہے۔ محمد علی پاشا نے جب مصر کی حکومت کے اختیارات سنبھالے تو اُس نے عظیم الشان مسجد تعمیر کروائی تھی۔ جو اب مسجد محمد علی کے نام سے مشہور ہے۔ مسجد انتہائی وسیع اور کشادہ ہے۔ ہم اندر گئے تو دیکھا نمازیوں کی بجائے یہاں یورپ بھر کے سیاح گھوم پھر رہے ہیں۔ اُن سیاحوں میں مجھے سبز رنگ کے جبے نما چادریں اوڑھے کچھ حوریں بھی نظر آئیں۔ قریب گیا تو معلوم ہوا یہ حوریں نہیں دختران مغرب ہیں۔ جنہیں مسجد کی انتظامیہ نے سر اور جسم ڈھانپنے کیلئے ایک خصوصی سبز رنگ کا لباس دیا ہوا تھا۔ یہ سیاح گروپوں میں بیٹھے مسجد کے فن تعمیر پر باتیں کر رہے تھے۔ کچھ لیٹ کر چھت کے نقش و نگار دیکھ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر میں بھی لیٹ کر چھت کو دیکھنے لگا۔ چھت کے اوپر ایک خوبصورت گنبد تھا۔ گنبد کے اندورنی حصے میں انتہائی اعلیٰ قسم کی نقش و نگاری تھی۔ میں کافی عرصہ یوں ہی لیٹ کر چھت اور دیواروں کا جائزہ لیتا رہا۔

نماز عصر ادا کر کے مسجد کے صحن اور ارد گرد دلانوں میں گھوم پھر کر قاہرہ کا جائزہ لینے لگا۔ یہاں سے پورا قاہرہ آپ کے قدموں میں نظر آتا ہے۔ جہاں ہم کھڑے تھے وہاں سے نیچے دیکھا تو مسجد حسن میرے قدموں میں تھی۔ اسی مسجد کے صحن میں ایران کے آخری شہنشاہ رضا شاہ پہلوی کی قبر ہے۔ مسجد حسن کے ساتھ ہی مسجد رفاعی ہے۔ یہ دونوں مسجدیں اور اس کے

اردگرد کا علاقہ مجھے ویران اور خستہ نظر آیا۔ یہاں سے دائیں دیکھا تو قاہرہ کا شہر خاموشاں نظر آیا۔ جس کے بیچ لوگوں کے مکان بھی تھے۔ قبرستان کے پیچھے چھوٹی پہاڑی کے پہلو میں الازہر کی یونیورسٹی ہے۔ جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے سیدھا سامنے دور دریائے نیل بہہ رہا تھا۔ جس کے دونوں طرف عالی شان عمارتیں تھیں۔ دریائے نیل اس مقام سے دو حصوں میں بٹ کر آگے دوبارہ مل جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے دریا کے درمیان ایک جزیرہ نما جگہ بن گئی ہے۔ بائیں طرف مغرب کی طرف دور دریائے نیل کے اُس پار اہرام مصر نظر آرہے تھے۔ آج فروری کی 27 تاریخ تھی۔ برطانیہ میں برف باری کی اطلاع ملی لیکن یہاں کا موسم انتہائی خوشگوار تھا۔ ہم ٹی شرٹ میں تھے اور کبھی کبھی پسینہ بھی آجاتا تھا۔ ایسے میں ہم سوچتے رہے کہ کیا ''مشرق اور مغرب کا خدا ایک نہیں!''

قاہرہ کا دل

ہم قلعہ صلاح الدین ایوبی سے نیچے اُترے کار میں بیٹھے اور قاہرہ شہر کے مرکز کی طرف چل پڑے۔ جب گاڑی التحریر سکوائر پہنچی تو قاہرہ میوزیم کے سامنے ہلٹن ہوٹل کے پہلو میں زیر زمین کار پارک میں گاڑی کھڑی کر دی گئی اور پیدل چل کر قاہرہ کے مرکزی حصہ کو دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ کار پارک سے باہر نکلے تو دیکھا ایک کھلا میدان ہے۔ جس کے ایک طرف بہت بڑا چوک ہے۔ یہ التحریر یا آزادی چوک کہلاتا ہے۔ چوک کے ساتھ ایک مصری مفکر کا بہت بڑا مجسمہ نصب ہے۔ کھلے میدان میں دور دور تک بنچوں پر جوان لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھے پیار ومحبت کی باتوں میں مشغول تھے۔ لڑکے اور لڑکیاں یورپی لباس میں ملبوث تھے۔ کچھ لڑکیاں سگریٹ بھی پی رہیں تھیں۔ ان نوجوانوں کو آزاد فضاء میں ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھے مستقبل کے منصوبے بناتے دیکھا تو مجھے خیال آیا۔ اگر اس حالت میں لڑکے پاکستان میں باتیں کریں تو یقیناً پولیس والے اُن سے نکاح نامہ ضرور طلب کریں۔ ورنہ پولیس سٹیشن لے جاکر روایتی خدمت خاطر کے ساتھ ساتھ صبح کی اخبارات میں فحاشی پھیلانے کے جرم میں گرفتار نوجوانوں کی خبریں صفحہ اول پر شائع ہوں۔

لیکن یہ مصر تھا۔

زلیخا اور قلوپطرہ کا دیس!

التحریر سکوائر یا آزادی چوک جس کے ایک طرف سرخ رنگ کی عمارت میں مصر کا عجائب گھر ہے۔ اسی عجائب گھر کی دوسری منزل پر فراعنہ بادشاہ ایک کمرے میں ابدی آرام کر رہے ہیں۔ عجائب گھر کی عمارت دیکھ کر میں سوچنے لگا کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنا معجزہ دیکھاتے ہوئے فراعنہ کو دوبارہ زندگی دیکر سامنے والی کھڑکی سے باہر دیکھنے کا موقع دیں تو اپنے ملک کے جوان لڑکے لڑکیوں کو پیار و محبت کے سمندر میں غرق دیکھ کر اپنے دور کی ملکہ حسن نفراتیتی کو بھی بھول جائیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کھلے عام ایسے نظارے دیکھ کر وہ غش کھا کر دوبارہ اللہ سے جا ملیں۔

عجائب گھر کے دائیں طرف ہلٹن ہوٹل کی عمارت ہے۔ جس کا ایک حصہ التحریر سکوائر کی طرف اور دوسرا دریائے نیل کی طرف کھلتا ہے۔ ہلٹن ہوٹل اُسی جگہ تعمیر ہوا جہاں کسی زمانے میں برطانوی فوج کی بارکیں تھیں۔

میدان التحریر کی پشت پر بازار ہے۔ پہلے ہم بازار کی طرف گئے جہاں ''مطعم و کبابجی الحاتی'' نامی ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد اردگرد کی گلیوں میں گھومنے لگے۔ وہاں قریب ہی ''لوکس بازار'' نامی گفٹ شاپ سے گزرتے وقت میں نے اندر جھانکا تو کاؤنٹر پر کھڑی لڑکی نے اھلاً سہلاً کہتے ہوئے کچھ اس طرح استقبال کیا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے چیزوں میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ دکان کا مالک ایک بوڑھا مصری تھا۔ جو صرف عربی میں بات کرتا تھا۔ لیکن لڑکی جو غالباً ملازمہ تھی انگریزی میں بات چیت کر سکتی تھی۔ میں نے بیگم بچوں، بھابیوں اور بھتیجیوں کیلئے یہاں سے تحفے خریدے۔ چلتے وقت لڑکی نے دکان کا ایک تعارفی کارڈ دیا۔ جس پر دکان نمبر 5 میدان التحریر قاہرہ کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ اور ساتھ ملکہ نفراتیتی کا فوٹو تھا۔ جو اس بات کا ثبوت تھا۔ کہ فراعنہ مر کر بھی کچھ مصریوں کے دلوں پر حکومت کر رہے ہیں۔

میں گفٹ شاپ سے باہر نکلا تو دیکھا یعقوب آزاد اور منیر حسین سڑک کے کنارے کھڑے جوتے پالش کروا رہے ہیں۔ بوٹ پالش کرنے والے مزدور زمین پر بیٹھے بڑی محنت سے کام کر رہے تھے۔ جنہوں نے مجھے بھی گھیر لیا۔ میں نے کہا کہ میں نے چمڑے کے جوتے نہیں بلکہ ٹرینز پہنے ہوئے ہیں۔ اس پر انہوں نے کہا ہم پالش کی بجائے پٹرول اور دوسری کیمیکل اشیاء سے آپ کے ٹرینز دھو کر دیں گئے۔ پہلے میں نہ مانا لیکن پھر اُن غریبوں کا دل رکھنے کی خاطر میں نے حامی بھر لی۔ میں ٹرینز اُتارنے والا تھا کہ انہوں نے کہا رہنے دیں۔ ہم پہنے

پہنے ہی دھوڈالیں گئے۔ جب ہم بوٹ پالش کروار ہے تھے۔تو ہمارے اردگرد کی سڑکوں پر گاڑیاں شور کرتی ہارن بجاتی گزر رہیں تھیں۔ایسے میں مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے میں قاہرہ کی بجائے راولپنڈی راجہ بازار میں کھڑا جوتے پالش کروارہا ہوں۔ بالکل وہی سٹائل تھا قاہرہ میں بھی۔

میدان التحریر سے ہم نے شاہرہ تحریر پر سفر کرتے ہوئے دریائے نیل کا رخ کیا۔ راستے میں دائیں طرف عرب لیگ کا دفتر تھا۔جس کے باہر پہرہ دار بندوقیں لیے چاک وچوبند کھڑے تھے۔ہم نے عرب لیگ کی عمارت کو باہر سے دیکھا اور آگئے بڑھ گئے۔عرب لیگ کے سامنے سڑک کی دوسری طرف مرکزی حکومت کے دفاتر، پارلیمنٹ ہاؤس، جس کے ساتھ وزارت قانون، وزارت صحت اور وزارت تعلیم کی عمارتیں ہیں۔ امریکی یونیورسٹی بھی ساتھ ہی ہے۔امریکی اور برطانوی سفارت خانے بھی ساتھ ساتھ ہیں۔انڈونیشیا، یونان اور اٹلی کے سفارت خانے بھی یہاں قریب ہیں۔ان تمام عمارتوں اور دفاتر سے کوئی پانچ سوگز دور دریائے نیل بہتا ہے۔ ہم اسی شاہرہ پر چلتے ہوئے نیل کنارے پہنچے۔ وہی دریائے نیل جس کا تحفہ یہ ملک مصر ہے۔

نیل کنارے

میں نیل کنارے پہنچا تو پہلی نظر میں مجھے دریائے نیل اُس محبوبہ کی طرح خراماں خراماں بہتا نظر آیا جسے یہ علم ہو کہ وہ حسین ہے۔اور اپنے حسن کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے دھیرے دھیرے مستانہ چال چلتے ہوئے قدم تول تول کر اٹھاتی ہو۔ اسی مستانی چال میں سب کا محبوب دریا ڈیلٹا کو سیراب کرتا ہوا بحرہ روم میں گرتا ہے۔ یورپ میں تو ندی نالوں کو بھی دریا کہا جاتا ہے۔لیکن دریائے نیل انتہائی بڑا گہرا اور چوڑا ہے۔ جو دریائے سندھ، دجلہ اور فرات سے یقیناً بڑا ہے۔دریا میں پانی جنوب سے شمال کی طرف بہہ رہا تھا۔یہ دنیا کا واحد دریا ہے جو جنوب سے شمال یعنی مخالف سمت میں بہتا ہے۔

مصر کے نقشہ پر نظر ڈالیں تو دریا نیل ملک کے بیچوں بیچ ایک لکیر کھینچتا ہوا یوں گزرتا نظر آتا ہے جس طرح انسانی جسم میں شہ رگ۔ حقیقت بھی یہی ہے مصر کی زندگی اسی دریا کی بدولت ہے ورنہ یہ کب کا صحرا میں بدل گیا ہوتا۔دریا نیل افریقہ کے ملک رونڈا سے نکل کر

وکٹوریہ جھیل میں آملتا ہیا جس کے بعد دوبارہ اپنا سفر شروع کرتے ہوئے افریقی ممالک سے گزرتے ہوئے سوڈان کے بیچوں بیچ سفر کرتا ایتھوپیا میں داخل ہوتا ہے۔ دوسری طرف ایتھوپیا کے پہاڑوں پر مئی سے ستمبر کے دوران مون سون بارشوں کا شفاف پانی جو نیلے دریا کی شکل میں سوڈان کے دارالحکومت خرطوم کے مقام پر رونڈا سے آنے والے سفید دریا میں مل جاتا ہے۔ یوں دونوں دریا مل کر ایک بڑے دریا کی صورت میں مصر پہنچتے ہیں۔ مصر میں دریا نیل جھیل میں شامل ہو کر تھوڑے آرام کے بعد اپنا سفر دوبارہ شروع کرتا ہے۔ یوں چلتے چلتے الاقصر کے پاس سے گزر کر مصر کے درمیان سے ایک آبی لکیر کھینچتے ہوئے قاہرہ پہنچتا ہے جہاں اپنے حسن کی ایک جھلک دکھاتے ہوئے مصر کے علاقہ ڈیلٹا سے ہوتا ہوا 4331 میل کا فاصلہ طے کر کے بحرہ اوقیانوس میں گرتا ہے۔ لمبائی کے لحاظ سے یہ دنیا کا سب سے لمبا دریا ہے۔

مصر کی 95 فیصد آبادی دریا نیل کے دونوں کناروں اور ڈیلٹا میں ہے۔ مصر میں دریا نیل نبیہ سے داخل ہوتا ہے جہاں دریا کے کنارے آبادی نہ ہونے کے برابر ہے۔ جوں جوں شمال کی طرف آتے جائیں آبادی شروع ہو جاتی ہے۔ جو پانچ سے دس میل کے علاقہ پر دریا کے ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے۔ قاہرہ کے جنوب میں فیوم کے علاقہ میں یہ وسعت 15 میل تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ معجزہ ہی سمجھیں کہ دریا نیل دنیا کے سب سے بڑے صحرا جس میں کبھی بارش نہیں ہوتی کے بیچ میں سے ہزاروں میل کا سفر طے کرتے ہوئے زندہ بچ کر بحرہ روم میں گرتا ہے۔ اگر یہ معجزہ نہ ہوتا تو افریقہ کا پیاسا صحرا دریا کو سمندر تک پہنچنے سے قبل ہی خود پی جاتا۔

اہل مصر ہمیشہ سے دریائے نیل کے ممنون رہے۔ انہیں علم تھا کہ جہاں پانی ہوگا وہاں زندگی ہوگی۔ نیل افریقہ کے صحرا کو مشرقی اور مغربی صحرا میں تقسیم کرتا ہے۔ فراعنہ تو دریائے نیل کی پوجا کرتے اور اُس کی خوشنودی کیلئے قربانیاں دیتے تھے۔ اور پھر اس قسم کی نظمیں ترنم کے ساتھ ملکر پڑھی جاتی تھیں۔

دریائے نیل

ہم تیرا خوشی سے استقبال کرتے ہیں

تو زمین سے نکلتا ہے

اور اہل مصر کی پرورش کرنے آتا ہے

تو خوراک دیتا ہے

تو ہم پر کرم کرتا ہے

تو ہمارے لئے سب کچھ بہتر پیدا کرتا ہے

ہماری زمینوں کو سیراب کرتا ہے

تو ہمارے غلے کے گودام بھرتا ہے

کھلیان اور غلے کے گوداموں کو بڑھاتا ہے

اور غریبوں پر خصوصی کرم کرتا ہے۔

حضرت عمر کا دریائے نیل کے نام خط

دریائے نیل کی موجوں کو دیکھا تو یاد آیا فراعنہ پانی کی خاطر ہر سال ایک جوان کنواری لڑکی کو دریا کے نام پر قربان کر کے لاش دریا میں پھینکتے تھے۔ اس رسم پر ہزاروں سال تک عمل ہوتا رہا۔ جب اس خطہ میں اسلام کی شمع روشن ہوئی۔ تو فاتح مصر عمرو بن عاص کے زمانے میں قربانی دینے کا دن قریب آیا تو آپ نے عالم پریشانی میں خلیفہ وقت حضرت عمر بن خطاب کو خط لکھا کہ اس ملک کی یہ رسم ہے۔ اس بارے میں کیا حکم ہے۔ حضرت عمرؓ بن خطاب نے عمرو بن عاص کو جوابی خط لکھنے کی بجائے دریائے نیل کے نام یہ تاریخی خط لکھا:

''اے دریائے نیل!

تجھ میں بہنے والے پانی کے اگر تم مالک ہو۔ اور اس کے عوض تم ہر سال ایک جوان لڑکی کی قربانی مانگتے ہو تو ہمیں تیرے پانی کی ضرورت نہیں۔ اور اگر یہ پانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کی مخلوق کیلئے ایک نعمت ہے۔ تو اس پر تیرا اختیار نہیں۔ بلکہ اس کا مالک اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔''

اس خط کو دریائے نیل کے حوالے کیا گیا اور یوں ہزاروں سال سے جوان لڑکیوں کی قربانی کا سلسلہ ہمیشہ کیلئے بند ہوا۔

دریائے نیل کی سیر

جیسے ہی ہم دریائے نیل کے کنارے پہنچے آٹھ دس کشتی بانوں نے ہمیں گھیر لیا کہ ہماری کشتی میں بیٹھ کر دریا کی سیر کریں۔ ایسے میں جان بچانی مشکل تھی۔ بکاری اور ھمام نے ایک سے سودا کیا کہ وہ ہمیں ایک گھنٹہ دریا کی سیر کروائے گا جس کا معاوضہ تیس مصری پونڈ مقرر ہوئے۔ ہم سب جوں ہی کشتی میں بیٹھے۔ تو ملاح نے کشتی چلا دی۔ اب شام ہونے والی تھیں۔ دریا کے ارد گرد دور دور تک بلند و بالا عمارتیں روشنی سے جگ مگ جگ مگ کر رہیں تھیں۔ جن کے عکس دریائے نیل میں یوں نظر آ رہے تھے جیسے پانی میں آگ لگی ہوئی ہے۔ دریا کے دونوں کناروں پر سڑک ہے۔ جس پر گاڑیاں فراٹے بھرتیں اپنی منزل کی طرف رواں تھیں۔ ہمارے دائیں بائیں اور بھی کشتیاں سیاحوں کا دل بہلانے دریا میں چل رہیں تھیں۔ موسم خوشگوار تھا۔

منیر حسین نے شام کے اس حسین منظر کو کیمرہ کی آنکھ میں بند کرنا شروع کر دیا۔ یعقوب آزاد اور بکاری دریا کی صفات پر باتیں کر رہے تھے۔ اور میں خاموشی سے مبہوت بنا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا کہ میں دریائے نیل میں گھوم رہا ہوں۔ کشتی جنوب کی طرف جدھر سے دریا آ رہا تھا پہلے اُدھر گئی۔ ہمارے بائیں طرف ہلٹن ہوٹل جس کے بعد شیراٹن ہوٹل Sheraton کی انتہائی خوبصورت اور منفرد عمارت تھی۔ میریڈین اور شیپرڈ ہوٹل کا رخ بھی دریائے نیل کی طرف ہے۔ جوں جوں کشتی چلتی گئی ہم نے ایک سے بڑھ کر ایک عالیشان عمارت دیکھی۔ اس مقام سے دریائے نیل دو حصوں میں بٹ کر تھوڑا آگے جا کر پھر یکجا ہو جاتا ہے۔ دریا کے تقسیم ہونے سے وہاں ایک چھوٹا سا جزیرہ بن گیا ہے۔ میں نے جزیرہ کی طرف دیکھا تو اُس کے درمیان میں ایک بہت ہی اونچا ٹاور تھا۔ یہی قاہرہ ٹاور ہے۔ جس کے سب سے اوپر گھومنے والا ریسٹورنٹ ہے۔ یہاں قریب ہی قاہرہ کا نیا اوپرہ ہاؤس قائم کیا گیا ہے۔ جسے 1998ء میں جاپان کی حکومت نے بنا کر تحفہ میں مصر کو دیا۔ قاہرہ کی مشہور شاہراہ 6 اکتوبر یہاں سے گزرتی ہوئی شہر کی طرف چلی جاتی ہے۔ دریا کی دوسری طرف برطانیہ کا سفارت خانہ ہے۔ جس کے بعد قومی اسمبلی کی عمارت اور ساتھ ہی گارڈن سٹی ہے۔ یہ شاپنگ سینٹر ہے۔ جہاں سے سیاح دنیا بھر کی چیزیں یورپ کی نسبت ارزاں خرید سکتے

ہیں۔

شام کے وقت دریا میں اور بھی کشتیاں چل رہیں تھیں۔ کشتیوں پر رنگ برنگی لائٹس کچھ اس طرح چمک دمک رہیں تھیں کہ اُس سے ماحول میں بڑا خوبصورت حسن پیدا ہو رہا تھا۔ کچھ کشتیوں میں کھانے پینے کا بھی بندوبست تھا۔ دریا کی وسعت اور اُس میں ہر طرف سے روشنیاں پانی سے منعکس ہو کر جب اوپر اٹھتیں تو بہت رومانی ماحول جنم لیتا تھا۔ میں نے دیکھا ہمارے ساتھ ساتھ چلنے والی ایک کشتی پر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ہلہ گلا کر رہے تھے۔ کچھ ناچ گانے سے اپنا اور اپنے پہلو میں بیٹھی ہوئیں حسیناؤں کے دل بہلا رہے تھے۔ میں دور سے انہیں للچائی ہوئی نظروں کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ یعقوب آزاد نے چہرے سے میرے دل کی کیفیت بھانپ لی۔ چنانچہ انہوں نے مجھے حوصلہ دیا کہ فکر نہ کریں میں آپ کو بھی ایسی کسی کشتی پر بیٹھا دوں گا۔

جب ہماری کشتی واپس کنارے پہنچی تو یعقوب آزاد نے وعدہ پورا کرتے ہوئے مجھے ایک قدرے بڑی کشتی پر بیٹھایا لیکن میری حفاظت کے طور پر خود بھی ساتھ بیٹھ گئے۔ آزاد صاحب نے جب سے حج کیا اُس کے بعد زیادہ تر سعودی طرز کا لباس پہنتے ہیں۔ آج بھی انہوں نے سفید لمبا چوغا ''توپ'' پہن رکھا تھا۔ سر پر گول رسے باندھے ہوئے تھے۔ ان کی رنگت بھی سفید ہے اور قد و کاٹھ بھی عربوں جیسا ہے۔ دریا دل بھی ہیں۔ بخشیش کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں گنواتے۔ یہ سچ ہے کہ عربی لباس پہننے سے انسان عربی نظر تو آ سکتا ہے لیکن عربی بن نہیں سکتا۔ لباس کے ساتھ ساتھ دل دریا ہونا بھی ضروری ہے۔ چونکہ یورپ میں عرب شیخوں کی شیخیاں بڑی شہرت رکھتی ہیں۔ یعقوب آزاد اس بات سے باخبر تھے۔ یہ صرف ایک بات سے مات کھاتے تھے جب لوگ عرب کا شیخ سمجھ کر عربی میں باتیں کرنے لگتے تو ہمارے شیخ صاحب آئیں، بائیں، شائیں کرتے بکاری کو ڈھونڈنا شروع کر دیتے تھے۔

عربی ڈانس کا ایک منظر

جب ہم کشتی میں بیٹھے تو منیر حسین، بکاری اور رھمام نے فیصلہ کیا کہ وہ کشتی کی بجائے دریا کے کنارے کھڑے ہو کر مختلف مناظر سے لطف اندوز ہونگے۔ جس کشتی میں ہم دوبارہ سوار

ہوئے انہوں نے بھی آزاد صاحب کو سعودی شیخ ہی سمجھا اور ایک نمایاں جگہ بیٹھایا۔ اُن کی بدولت مجھے بھی ساتھ بیٹھنے کو جگہ مل گئی۔ جب کشتی چلی تو ملاح نے عرب کے تیز دھنوں پر مصری نوجوان مغینہ نانسی عجرم کا گایا ہوا یہ نغمہ بجانا شروع کر دیا:

یاطبطب
یاطبطب وادئع یایقولی انا التغیرت علیه
انا ازعل اولع ماهوکل همه ازای اراضیه
قولوله دانا برضی ساعات بحالات
مرة ازرل مرة ادیله عینی
من فینا علی حاله کل الاوقات
ده تعبنی قوی طلع عینی
لوازعلی منه و اقصر یقول بقصرفے حقه و یاخدجنب
لوافهمه یقول بظلمویفضل یحسنی بمیت زنب
قال انا بتغیر والله ده عقله صغیر
حیرقلبی معاه و حکم القوی بموت فیه قوی
وده اللی صبرنی علی هواه
یاطبطب...... ودائع

ترجمہ:

یا تو میں نے اُسے برباد کر دیا
یا بقول اُس کے میں بدل گئی ہوں
میں پریشان اور پگلی ہوں
لیکن وہ کہتا ہے میں خوشیوں سے اُس کا دامن بھر دوں
میں نے اُسے بتایا ہے کہ
میں ہمیشہ تجھ پہ مسکراہٹیں نچھاور نہیں کر سکتی

کچھ لمحوں کے لئے میں پگلی ہو جاتی ہوں لیکن
ہمارے درمیان محبت اُسی طرح رہتی ہے
میں اکتا گئی ہوں میں تھک گئی ہوں
مجھے اُس پر غصہ آتا ہے
لیکن پھر بھی مجھے اُس کی کمی محسوس ہوتی ہے
وہ کہتا ہے کہ میں اُسے نظر انداز کرتی ہوں تو وہ ناراض ہو جاتا ہے
جب میں وضاحت کرتی ہوں تو وہ کہتا ہے کہ یہ ناانصافی ہے
وہ چاہتا ہے کہ میں اپنے آپ کو الزام دوں
وہ بچوں کی طرح حرکتیں کرتے ہوئے کہتا ہے
میں بدل گئی ہوں
اُس نے مجھے الجھا دیا ہے
لیکن میں اُس سے محبت کرتی ہوں
اسی وجہ سے میں اُسی کی ہو گئی ہوں

نانسی عجرم کی سریلی آواز کانوں میں پڑی تو سب لڑکے اور لڑکیوں نے ڈانس شروع کر دیا۔ جو قدرے عمر رسید تھے وہ تالیاں بجا کر ناچنے والوں کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا مصری لڑکیاں عرب کے روایتی انداز میں ڈانس کر رہیں تھیں۔ مثل زلیخا ایک حسینہ نے کمر سے نچلے حصے کو بڑی خوبصورتی اور پھرتی کے ساتھ ہلاتے ہوئے نیچے سے اوپر اس طرح اٹھ رہی تھی جس طرح بانسری کی آواز پر ناگن کھڑی ہو کر اپنا پھن پھیلاتی ہے۔ پھر یہ حسینہ ناگن کی طرح اپنے جسم کے اوپر کے حصے کو بڑی مہارت سے بل دیکر جب ہلاتی تو جوانوں کے دل دھڑکتے۔ جوان اور بوڑھے مل کر نعرے لگاتے۔ لڑکی میوزک اور گانے کی آواز کے مطابق اس خوبصورتی سے اداکاری کر رہی تھی کہ مجھ جیسے لوگوں پر سکتہ طاری ہو گیا۔ یوں ہی مختلف لڑکیاں مختلف گانوں پر ناچتیں اور اپنے انگ انگ کو نمایاں کر کے کچھ اس قسم کی حرکتیں کرتیں کہ مردہ جسموں میں بھی لہریں پیدا ہونا شروع ہو جاتی تھیں۔ اس ردعمل میں میرے پاس بیٹھے ہوئے

ایک ستر سالہ عرب بوڑھے نے اٹھ کر ناچنا شروع کیا۔ تو شائقین نے ڈھیر ساری تالیاں بجا کر اُس کے زندہ دل ہونے کا اقرار کرتے ہوئے اُس کی حوصلہ افزائی کی۔ ان لڑکیوں نے ہم پر خصوصی توجہ دیتے ہوئے بار بار ہمیں اپنی جوانی کے جلوے دکھائے چونکہ وہ یعقوب آزاد کو حقیقی سعودی شیخ سمجھ رہی تھیں۔

ہائے......اُم کلثوم

کشتی میں میرے پاس بیٹھا ہوا بابا جو نانسی عجرم کے نغمے پر جھوم کر ناچنے لگا تھا۔ کو جب تھوڑا ہوش آیا تو میں نے پوچھا کہ بابا کیا نانسی مصر کی سب سے بڑی مغنیہ ہے؟۔ اس پر بابا نے میری طرف حیرت سے دیکھ کر کہا پتہ چلتا ہے آپ مصر میں نئے آئے ہیں اور آپ کو ہمارے ملک کے بارے میں زیادہ علم نہیں۔ مصر بلکہ اہل عرب کی ایک ہی محبوب مغنیہ تھی۔ اور وہ تھی ام کلثوم۔ جسے ''بلبل نیل'' کا خطاب دیا گیا تھا۔ اس کے نغمے لوگوں میں اُس وقت مشہور ہوئے جب مصر بلکہ عرب دنیا میں پیار و محبت اور جنسی معاملات پر بات کرنا قابل جرم سمجھا جاتا تھا۔ بلبل نیل نے اپنے نغموں کے ذریعے لوگوں کو جرات اور وہ الفاظ دیئے جن کے سہارے کھلے عام محبت اور پیار کا یہ انقلاب برپا ہوا جس کا مظاہرہ ابھی آپ نے اس کشتی پر دیکھا۔ مزید دیکھنے ہوں تو گھومیں پھریں۔

مغنیہ عالم ام کلثوم نے عملی زندگی کا آغاز 1936ء میں فلموں میں اداکاری سے کیا۔ لیکن اس کی لاثانی مدھر آواز اسے فلموں سے نکال کر گلوکاری کی طرف لے آئی۔ یہ ڈیلٹا کے ایک گاؤں تیمی الزاہریہ میں پیدا ہوئی۔ 1953ء میں ڈاکٹر حسن سے شادی ہوئی۔ ام کلثوم نے ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر ریکارڈ نغمے گائے۔ ہر مہینے کی پہلی جمعرات کو یہ اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتی تھی جو اس قدر ہر دل عزیز تھے کہ عرب دنیا کی اہم شخصیات اس میں شرکت کرتی تھیں۔ یہ پروگرام ساتھ ساتھ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بھی نشر ہوتے تھے۔

جب بابا مجھے اُم کلثوم کے بارے میں بتا رہا تھا تب مجھے یاد آیا کہ 1974ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے جب اسلامی سربراہی کانفرنس پاکستان کے دل لاہور میں منعقد کروائی تو بلبل نیل اُم کلثوم اور ملکہ ترنم نور جہاں نے مل کر کلام اقبال پیش کیا تھا۔ موسیقی کی دنیا کی دو

ملکاؤں نے جب ملکر نغمہ سرائی کی تو ایک سکوت برپا کر دیا تھا۔

اُم کلثوم کے نغمے آج بھی سب سے زیادہ فروخت ہوتے ہیں۔ 1975ء میں ام کلثوم فوت ہوئی تو عرب دنیا میں صف ماتم بچھ گیا تھا۔ مصر کی تاریخ میں سب سے بڑا جنازہ ام کلثوم کا تھا جس میں عرب دنیا کے سربراہان مملکت نے شرکت فرمائی تھی۔ اس کے گائے ہوئے ہزاروں نغموں میں سے آج بھی ''ایک ہزار اور ایک رات'' ''تم میری زندگی ہو'' جیسے نغمے بیسویں صدی میں دنیا کے تمام گلوکاروں کے گائے گئے ایک سو نغموں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ نغمے آج بھی سن کر عرب جھوم اٹھتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے بابا کے منہ سے نکلا ''ہائے ام کلثوم''۔

بابا کی زبان رکی تو ساتھ کشتی بھی کنارے پر رک گئی۔ ایسے میں حرکت کرتے تھرتھراتے جوان جسموں کو بھی سکون ملا۔ ہم باہر نکل کر اپنے دوستوں کے پاس آئے۔ فیصلہ ہوا پیدل چل کر دریائے نیل کو پل سے عبور کیا جائے۔ ہم پیدل چلتے دریا سے لطف اٹھاتے آہستہ آہستہ چل رہے تھے کہ کچھ عرب جوانوں نے ہمارے اپنے شیخ صاحب (یعقوب آزاد) کے ساتھ فوٹو بنوائے۔ غالباً وہ انہیں سعودی عرب کے سابق وزیر تیل شیخ ذکی زمانی سمجھ رہے تھے۔ اس غلط فہمی کی وجہ غالباً یہی تھی کہ آزاد صاحب کی شکل وصورت ذکی یمانی سے بہت ملتی ہے۔

چہل قدمی کرتے کرتے ہم دریا نیل کے درمیان واقع جزیرہ میں پہنچے۔ قاہرہ ٹاور بھی اسی جزیرہ میں ہے۔ جزیرہ میں ہم دائیں طرف کے پارک میں داخل ہونے لگے تو گیٹ کیپر نے ٹکٹ مانگے۔ ہم نے پارک میں جانے کا ٹکٹ پہلی بار سنا تھا۔ جب ٹکٹ خریدنے لگے۔ تو ہمیں بتایا گیا کہ عرب باشندوں کیلئے ایک ٹکٹ اور غیر عرب کیلئے دو ٹکٹ خریدنے لازمی ہیں۔ ہم نے اس ناانصافی پر احتجاج کیا لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنے۔ یوں ہم نے دو دو ٹکٹ جبکہ بکاری اور رھام نے ایک ایک ٹکٹ خرید کر پارک کی سیر کی۔ ٹکٹ خرید کر ہم سوچنے لگے کہ اگر ایسا برطانیہ میں ہوتا تو ہیومن رائٹ اور مساوی حقوق کے علمبردار آسمان سر پر اٹھا لیتے لیکن یہاں تو معاملہ ہی مختلف ہے۔ یہ اسلامی مملکت مصر ہے! ایسے دین کے ماننے والے جس نے چودہ سو سال پہلے مساوات کا درس دیا تھا۔ لیکن آج ہم سب کچھ بھول کر اپنے اصل راستے سے ہٹ کر نفسانفسی کے عالم میں مبتلا ہیں۔

سعودی طلباء سے ملاقات

ہم اسلامی جمہوریہ مصر میں مساوات کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ ہمیں انگریزی لباس میں چند سعودی طلباء ملے۔ جنہوں نے یعقوب آزاد کو سعودی شیخ سمجھ کر عربی میں باتیں شروع کر دیں۔ لیکن جلد ہی اُن پر حقیقت افشاں ہوئی کہ یہ صاحب سعودی نہیں بلکہ پاکستانی ہیں۔ جو اردو اور انگریزی تو فرفر بولتے ہیں لیکن عربی بولنے سے کورے ہیں۔ سعودی لباس مذہبی جذبہ اور سعودی لوگوں کے پیار کا نتیجہ ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسے مشرق وسطیٰ اور چند دوسرے اسلامی ممالک کے باشندے مغرب کے پیار میں اُن کا لباس پہنتے ہیں۔

جب طلباء کو یہ معلوم ہوا کہ شکل وصورت کے یہ صاحب سعودی نہیں! تو انہیں ایک خوشگوار دھچکا لگا۔ اُن کے خیال میں اس لباس پر صرف سعودیوں کا حق ہے۔ لیکن جب انہوں نے زیب تن کیے اپنے مغربی لباس پر نظر ڈالی تو پھر اپنے مزاج بدلے اور ہمارے ساتھ ایک دوستانہ ماحول میں انگریزی میں باتیں شروع کر دیں۔ جنہوں نے بتایا کہ:

”قاہرہ کی شامیں بڑی رنگیں ہوتی ہیں۔ شام ہوتے ہی مصر کی مست جوانیاں یورپ سے بھی بڑھ کر پھڑکتی اور تھرکتی ہیں۔ شراب اور شباب کے علاوہ نائٹ کلب، ڈسکو اور بیلے ڈانس کی رونقیں عروج پر ہوتی ہیں۔ جس طرح یورپی جمعہ اور ہفتہ کے روز نائٹ اوٹ کرتے ہیں۔ اس طرح اہل مصر جمعرات کو نائٹ اوٹ کرتے ہیں۔ یعنی بے فکرے ہو کر رات گے گھروں سے باہر نائٹ کلبوں اور دوسری عیاشی والی جگہوں پر وقت گزارتے ہیں۔ دریائے نیل کے جزیرہ میں ”اوپرا ہاؤس“ سیاحوں کا دل لبھاتا ہے۔ جہاں انگریزی سوٹ اور ٹائی پہن کر ہی اندر جانے کی اجازت ہے۔ یعنی ملک مصر کا لیکن قوانین انگریزوں کے۔ اسی طرح شہرہ آفاق شیراٹن ہوٹل میں کمال کا بیلے ڈانس ہوتا ہے۔ لیکن ڈسکو ڈانس سب سے اچھا ہلٹن ہوٹل میں ہوتا ہے۔ جہاں مصری حسینائیں

اپنے فن کا مظاہرہ کرتی ہیں۔

مصر ہے تو اسلامی ملک لیکن یہاں شراب آسانی سے دستیاب ہے۔ بلکہ مصر کی اپنی تیار کردہ شراب بڑے اعلیٰ معیار کی ہے۔ ''عمر خیام'' نام کی سرخ وائین مصر میں مقامی طور پر پیدا ہونے ہوئے انگوروں سے کشید کی جاتی ہے۔ وائین کے علاوہ بیئر اور سپرٹ کا معیار بھی اچھا ہے۔ سٹیلا بیئر Stella beer کی کمپنی کو ابھی حال میں حکومت نے نجی شعبہ میں دیا ہے۔

قاہرہ میں اور بھی بہت کچھ ہے۔ 187 میٹر بلند قاہرہ ٹاور ۔ دریائے نیل میں تیرتے پھرتے ریسٹورنٹ، قہوہ خانے، اوپن ایئر تھیٹر، چڑیا گھر، باٹنی گارڈن، اہرام کے مقام پر رات کے وقت روشنیوں اور ساز و آواز کا شو جیسی چیزیں سیاحوں کی بوریت ختم کرنے کیلئے موجود ہیں۔ ماڈرن مصری لوگ بھی گھروں سے نکلتے ہیں۔ کچھ اپنی بیگمات کے ساتھ قہوہ خانوں میں بیٹھ کر گپ شپ کے ساتھ ساتھ حقہ بھی پیتے رہتے ہیں۔ پرانے مصر میں مسجد حسین کے قریب ''الفشری'' نامی کیفے مصریوں میں کافی مشہور ہے۔

قاہرہ کے پانچ ڈسٹرکٹ ہیں۔ جن میں مختلف چیزیں سیاح دلچسپی سے دیکھتے ہیں۔ ایک الازہر، دوسرا قلعہ صلاح الدین، تیسرا مصر کا قدیمی قبرستان اور مزار امام شافعی، چوتھا مصر کا قدیمی شہر اور اُس میں مصر بلکہ افریقہ کی پہلی مسجد اور پانچواں التحریر میدان سے جزیرہ روڈا جہاں قاہرہ ٹاور ہے اور ہاں سب سے دلچسپ چیز دریائے نیل کی سیر۔

مصر میں بارہ سال کی عمر تک تعلیم لازمی اور مفت ہے۔ سیکنڈری ایجوکیشن کے بعد طلباء یونیورسٹی یا پولی ٹیکنکل میں داخلہ لے سکتے ہیں۔ مصر میں سرکاری سکولوں کے علاوہ پرائیویٹ اور اسلامی

سکولوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ مصر کا سرکاری روزنامہ
''الاہرام'' سب سے زیادہ تعداد میں شائع ہوتا ہے۔ محمد حسین ہیکل
اس اخبار کے بہت عرصہ ایڈیٹر رہے۔ محمد حسین ہیکل صحافت کے
ساتھ ساتھ بہت بڑے مدبر اور مورخ بھی تھے۔ الاہرام کے علاوہ
قاہرہ سے کافی تعداد میں ہفت روزے اور میگزین بھی شائع ہوتے
ہیں۔ اہل مصر کو نجیب محفوظ پر بڑا فخر ہے۔ جس کے لٹریچر کے کام کو
سہراتے ہوئے 1988ء میں نوبل انعام دیا گیا۔''

اب شام ہو چکی تھی۔ ہم نے عرب طلباء سے اجازت لی اور گاڑی میں بیٹھ کر کسی نائٹ کلب کی بجائے اپنی رہائش گاہ کا رخ کیا۔



دورِ فراعنہ پر ایک نظر

- ☆ مذہب
- ☆ دیوتے
- ☆ کتاب اموات
- ☆ لباس اور رہن سہن

دورِ فراعنہ پر ایک نظر

قاہرہ کے قریب گیزہ اور سقارہ کے اہرام، ممفس کا قدیمی شہر، الاقصر (Luxor) میں فراعنہ کے شاہی قبرستان، محلات اور عبادت گاہوں کی سیر سے قبل بہتر ہے اگر ہم ان تاریخی مقامات کے پس منظر کی ایک جھلک دیکھ لیں تاکہ ان مقامات کی سیاحت کا لطف دوبالا ہو جائے۔

پانچ ہزار سال پہلے سندھ کے موہنجوداڑو اور عراق کی بابلی تہذیبوں کے ساتھ ساتھ مصر میں فرعونی دور کا آغاز ہوا۔ فرعون مصر کے قدیم باشندے تھے۔ دریائے نیل کی بدولت مصر انتہائی ذرخیر سرزمین تھی۔ ایک کہاوت ہے کہ: ''پیٹ میں پڑا چارہ تو کودنے لگا بچارا''۔ غالباً فراعنہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اُس زمانے کی طرز زندگی کے مطابق انہیں کھانے پینے کی اشیاء اپنے ملک سے وافر مقدار میں مل جاتی تھیں۔ ملک کا دفاع بھی قدرتی طور پر کچھ اس طرح تھا کہ مغرب اور جنوب کی طرف صحرا۔ جہاں سے مقامی لوگوں کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ مشرق کی طرف بحرہ احمر اور شمال کی طرف بحرہ روم تھا۔ یوں مصری حکمرانوں کو دفاع اور کھانے پینے کی کوئی فکر نہیں تھی۔ انہیں اگر کوئی فکر تھی تو زندگی بعد از موت کی۔

فرعون موت کے بعد زندگی کے قائل تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہی انسان دوبارہ زندہ اٹھے گا جس کا جسم صحیح سلامت ہوگا۔ یوں اپنے دورِ حکمرانی کی پوری قوت یہ اسی کام پر لگا دیتے تھے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ فراعنہ پر موت کا خوف ہر وقت طاری رہتا تھا۔ غالباً یہی سبب تھا کہ برسر اقتدار آتے ہی وہ اپنے مقبرے بنوانے شروع کر دیتے تھے۔ میت کو محفوظ رکھنے کیلئے حنوط کرنے کے طریقے ایجاد ہوئے۔

فراعنہ نے دوسری زندگی تک حنوط شدہ میت کو محفوظ رکھنے کے لئے بڑے بڑے اہرام بنوانے شروع کیے۔ مضبوط ہونے کے باوجود یہ اہرام چوروں کی دسترس سے محفوظ نہیں تھے۔ چنانچہ شاہی میتوں کو خفیہ مقامات پر انتہائی رازداری کے ساتھ رکھا جانے لگا۔ آج الاقصر کے مقام پر بادشاہوں اور شاہی خواتین کے جو مقبرے دریافت ہوئے ہیں وہ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ حکمران اپنی میتوں کو حنوط کرنے کے بعد کسی انتہائی خفیہ مقام پر چھپا دیتے تھے تا کہ میت چوروں کی نظروں سے اوجھل رہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں کفن چوری کا دھندہ مصر سے شروع ہوا جو چلتا چلتا برصغیر اور دنیا کے دوسرے ممالک تک پہنچا۔ آج الاقصر کے مقام پر بادشاہوں اور شاہی خواتین کے وہ خفیہ مقبرے دریافت ہو رہے ہیں جو کسی زمانے میں مال و دولت سے لبالب بھرے ہوئے تھے۔

چور شاہی میتوں کی تلاش میں اس لئے رہتے تھے۔ چونکہ فراعنہ میت کے ساتھ سونا چاندی اور ضروریات زندگی کی چیزیں بھی قبر میں رکھ دیتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ دوسری زندگی میں یہ سازوسامان کام آئے گا۔ بالکل اُسی طرح کی سوچ آج بھی چین میں موجود ہے۔ جہاں کسی عزیز کی وفات پر لوگ نوٹوں کو آگ لگاتے ہیں۔ تا کہ یہ دولت مرحوم کے دوسرے جہاں میں کام آسکے۔

مصر پر فراعنہ کے تین ہزار سالہ دور کا آغاز **3200** ق م میں ہوا۔ اُس سے پہلے مصر چھوٹی چھوٹی علاقائی ریاستوں میں تقسیم تھا۔ کوئی بھی مرکزی حکومت نہیں تھی۔ فراعنہ حکومت کے بادشاہ مینس **Menes** نے متحدہ مصر کی بنیاد ڈالی۔ اور دارالحکومت قاہرہ سے **15** میل دور ممفیس میں قائم کیا۔ اسی خاندان کے زوسر نامی بادشاہ جب برسرِ اقتدار آئے تو اُنہوں نے امہوتپ نامی ایک آرکیٹیک کو حکم دیا کہ اُن کے لئے اہرام تعمیر کرے۔ امہوتپ نے شاہی حکم کی تعمیل میں دنیا کا پہلا اہرام تعمیر کیا۔ جو اس وقت بھی سقارہ میں موجود ہے۔ سقارہ ممفیس کے قریب ہے۔ دورِ فراعنہ میں سقارہ کی حیثیت شاہی قبرستان کی تھی۔ زوسر نے مصر پر **2667** ق م سے **2648** ق م یعنی کل انیس سال حکومت کی۔

دنیا میں پہلا اہرام تعمیر ہوا تو اُس کی شہرت پوری مصر میں پھیلی۔ لوگ دور دور سے آ کر اِسے دیکھتے۔ چنانچہ اہرام کے باہر ہر وقت میلہ لگا رہتا تھا۔ پروہت بھی باہر بیٹھے منتر جنتر

پڑھتے رہتے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بادشاہ سلامت اہرام کے اندر زندہ ہیں اور اپنے اختیارات کو استعمال کر کے اہل مصر کو باحفاظت دوسری دنیا میں پہنچائیں گئے۔ بادشاہ زوسر کے بعد جب خوفو Khufu تخت نشین ہوا تو اُسے بھی اپنی میت کو محفوظ کرنے کی فکر ہوئی۔ پہلے اہرام کی تعمیر کے تقریباً سو سال بعد خوفو کے حکم پر قاہرہ کے قریب گیزہ کے مقام پر دنیا کا منفرد ترین اہرام تعمیر ہوا۔ جسے لاکھوں انسانوں نے بیس سال کے عرصہ میں مکمل کیا۔ 450 فٹ بلند اور 755 مربع فٹ میں پھیلا ہوا یہ اہرام دنیا کا سب سے بڑا اہرام ہے۔ خوفو نے 2589 ق م سے 2566 ق م یعنی 23 سال حکومت کی۔ خوفو کے اہرام کے ساتھ اُس کے بیٹے کافری Khafres نے اپنے لئے اہرام بنوایا جو 446 فٹ یعنی پہلے اہرام سے چار فٹ چھوٹا ہے۔ اگر چہ دیکھنے میں یہ دوسروں سے اونچا ہے۔ لیکن اس کی بنیاد دوسروں کی نسبت اونچی جگہ پر ہے۔ پھر تیسرا اہرام منقرع نے بنوایا جو 217 فٹ اونچا ہے۔ ان اہرام کے اردگرد چھوٹے چھوٹے سینکڑوں اہرام تعمیر ہوئے۔ گیزہ کے اِن اہرام کا شمار دنیا کے سات عجائبات میں ہوتا ہے۔ اور آج بھی دنیا بھر سے لوگ انہیں دیکھنے جاتے ہیں۔ یہ اہرام ریگستان میں پہاڑ کی مانند پانچ ہزار سال سے یوں ہی اپنی جگہ قائم ہیں۔

ہر کمال کو زوال آتا ہے۔ فرعونی دور کے پہلے حکمرانوں کو زوال آیا تو 2200 ق م میں ملک کے نئے حکمران مصر پر قابض ہوئے جنہیں مڈل کنگ ڈم یعنی وسطی بادشاہیت کا نام دیا جاتا ہے۔ ان کا دور چار سو سال تک رہا جو 1800 ق م میں ختم ہوا۔ اس دور میں مصر کی مرکزیت ختم ہو گئی تھی۔ نتیجتاً مصر کا بالائی حصہ ملک کے دوسرے حصے سے الگ ہو گیا۔

جب مصر پر فراعنہ کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو 1730 ق م میں مصر کے علاقہ ڈیلٹا جو اُس زمانے میں جشن کہلاتا تھا پر عرب نسل کے چرواہے حکمرانوں Hyksos King نے حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ یہ علاقہ ہاتھ سے نکلنے پر فراعنہ نے جنوب میں تھیبس Thebes جس کا موجودہ نام الاقصر (Luxor) ہے میں اپنا دارالحکومت قائم کیا۔ چرواہے حکمران اپنے ساتھ جدید ترین ساز و سامان لے کر گئے تھے جس میں سب سے انوکھی چیز چیریٹ Chariots تھی۔ چیریٹ تانگہ نما ایک بگھی ہوتی تھی جسے گھوڑے کھینچتے تھے۔ اور اسے جنگی ساز و سامان سے لیس کر کے میدان جنگ میں استعمال کیا جاتا تھا۔ فرعون اس سے قبل پہیہ کے استعمال سے واقف نہیں تھے۔

چرواہے حکمران گلہ بانی کرتے اور خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ لیکن جب یہ مصر کے زرخیز خطہ ڈیلٹا پر قابض ہوئے تو انہوں نے جدید ترین طریقے سے کاشت کاری کو فروغ دیا۔ جس سے وہ اس قدر غلہ پیدا کرنے لگے کہ فلسطین اور شام کے لوگ بھی اپنی غذائی ضرورتیں وہاں سے پوری کرنے لگے تھے۔ چرواہے حکمران مصر کے دیوتاؤں کی بجائے شام سے اپنے دیوتے ساتھ لائے تھے۔ جس کی بناء پر مصری لوگ اِن سے خوش نہیں تھے۔

حضرت یوسف علیہ السلام اسی دورِ حکومت میں غلام کی حیثیت سے مصر پہنچے اور ممفیس کے بازار میں فروخت ہوئے تھے۔ حضرت یوسف غالباً 1906 ق م میں پیدا ہوئے۔ اور انہیں 1890 ق م میں کنوئیں میں پھینکا گیا تھا۔ پھر جیل میں رہے اور آخر اللہ تعالیٰ نے انہیں مصر کا اقتدار سونپا تھا۔ جنہوں نے اپنے دورِ حکومت میں بنی اسرائیل کو مصر میں آباد کیا تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی تعلیمات سے بنی اسرائیل اور کچھ مقامی لوگ بھی مسلمان ہوگئے تھے۔ اِن کی وفات کے بعد فراعنہ نے مصری قومیت کا نعرہ بلند کیا اور ایک زبردست جنگ کے بعد چرواہے حکمران ہکسوس کی حکومت ختم کر کے اُسے دوبارہ متحدہ مصر میں شامل کیا۔ فراعنہ نے جب چرواہے حکمرانوں سے اپنا علاقہ واپس لیا تو مسلمانوں کو قیدی بنالیا۔ جن پر فراعنہ کئی صدیاں ظلم وستم ڈھاتے رہے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے اس قوم سے حضرت موسیٰ پیدا کیے جنہوں نے اپنی قوم بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نکال کر صحرہ سینا پہنچایا۔ جس کا ذکر آگے صحرائے سینا کی سیاحت کے دوران تفصیل سے بیان ہوگا۔

1580 ق م میں مصر کے حکمرانوں نے فرعون کا لقب اختیار کیا۔ اس سے قبل مصری بادشاہ فرعون کا لقب استعمال نہیں کرتے تھے۔ لیکن مورخین سب کو فرعون کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ممکن ہے اُس کی وجہ یہی ہو کہ فرعون کسی بادشاہ کا نام نہیں بلکہ اُن کا لقب تھا۔ فرعون (Pharaoh) عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی ہیں ''گریٹ ہاؤس'' یعنی بڑا مکان یا شاہی محل کے ہیں۔ آغاز میں محل میں رہنے والے سب لوگوں کو فرعون ہی کہا جاتا تھا۔ لیکن رعمیس حکمرانوں نے یہ لقب صرف بادشاہوں کے لئے مخصوص کر دیا۔ یہ دور مصری تہذیب کے عروج کا دور تھا۔

1352 ق م میں آمن ہوتپ Amenhotep نامی بادشاہ برسرِاقتدار آیا تو اُس

نے محسوس کیا کہ حکومتی معاملات میں پجاریوں کا بڑا عمل دخل ہے۔ پجاریوں نے اپنے سینکڑوں دیوتے تراش رکھے تھے۔ جن کے نام پر وہ غریب لوگوں کو لوٹتے اور ظلم کے پہاڑ ڈھاتے تھے۔ یوں پجاریوں اور مذہبی لیڈروں سے چھٹکارا پانے کیلئے آمن نے اپنا دارالحکومت الاقصر سے تین سوستر کلومیٹر شمال کی طرف عمرانہ Amarana منتقل کر کے واحد دیوتا کی پوجا شروع کر دی۔ اس دیوتا کا نام Aton تھا جسے سورج کا دیوتا کہا جاتا تھا۔ آمن نے اپنا نام بھی تبدیل کر کے آخنتن Akhenaton یعنی سورج کی روح رکھا لیا تھا۔

آخنتن بادشاہ کی بیگم نفرتیتی Nefertiti تھی۔ جو حسن کی دیوی تھی۔ جتنی یہ حسین تھی اتنی ہی جنسی خواہشات نے اسے گھیرا ہوا تھا۔ اہل مصر اسے سراپا حسن وجنس سمجھتے تھے۔ آج کے زمانے میں بھی شہوت پرستی میں ڈوبی ہوئیں کچھ مغربی خواتین اور مرد جو جنسی خواہشات کی تسکین کے لئے ''اورل سیکس'' اور ''طریقہ 69'' استعمال کرتے ہیں اُن کا بانی ''نفرتیتی'' کو مانا جاتا ہے۔ یہ حقیقی معنوں میں ''سیکس سمبل'' تھی۔ آج بھی اگر کسی مصری سے ''نفرتیتی'' کے بارے میں پوچھا جائے تو وہ زوردار قہقہ لگا کر پوچھے گا...... خیر ہے۔ ''نفرتیتی'' کی یادیں کیوں آ رہی ہیں۔

''نفرتیتی'' انتہائی حسین وجمیل تھی۔ فیشن کی دلدادہ اور سفید لباس پہنتی تھی۔ خوبصورت غزالی آنکھوں میں ہلکا ہلکا سرما، دنداسے سے ہونٹ سرخ، صراحی دار گردن، بالوں میں کنول کا سفید پھول سجا کر جب اپنے خاوند کے ساتھ دربار میں بیٹھتی تو درباری اُسے دیکھتے ہی رہ جاتے تھے۔ اس حسینہ عالم کا سر اس وقت جرمنی کے شہر برلن کے عجائب گھر میں رکھا ہوا ہے۔ باقی جسم فنا ہو گیا۔

آخنتن نے سولہ سال حکومت کی۔ 1336 ق م میں جب اس کا انتقال ہوا۔ تو اس کا نوسالہ داماد (توت آنخ آمن) تاٹنک امن Tutankhamun برسر اقتدار آیا جس نے اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کی بحالی کا اعلان کرتے ہوئے دارالحکومت دوبارہ الاقصر منتقل کر دیا۔ اس کی ساس ملکہ حسن ''نفرتیتی'' تھی۔

تاٹنک امن اٹھارہ سال کی عمر میں برین ٹیومر کی وجہ سے فوت ہوا۔ اس کی میت کو بڑی آن شان کے ساتھ حنوط کر کے ہیرے جواہرات کے ساتھ انتہائی خفیہ غار میں رکھا گیا تھا۔

تاٹنک امن کی میت کو ایک انگریز ماہر آثار قدیمہ ہاورڈ کارٹر نے چار سال کی تگ ودو کے بعد 1922 میں جب دریافت کیا تو غار کا دروازہ کھلتے ہی ہاورڈ ہیرے جواہرات دیکھ کر مبہوت ہو گیا تھا۔ ممکن ہے پادریوں نے یہ خصوصی اہتمام تاٹنک امن کو اس صلے میں دیا ہو کہ اُس نے آختن کے واحد دیوتا کے مذہب کو خیر باد کہہ کر فراعنہ کے قدیمی مذہب پر اپنی حکومت قائم کی تھی۔

تاٹنک امن کی میت کے ساتھ غار سے ملنے والی تمام اشیاء اس وقت مصر کے عجائب گھر میں محفوظ ہیں جنکا ذکر تھوڑا آگے چل کر آئے گا۔

1321 ق م میں رعمیس اول Ramses 1 نے کارنک Karnak کا مندر تعمیر کیا۔ 1980 ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا یہ مندر اپنی مثال آپ تھا۔ جس کے کھنڈرات اس وقت بھی موجود ہیں۔ ماہرین نے ان کھنڈرات کی بنیادوں پر اُسے دوبارہ تعمیر کیا ہے۔ اس مندر میں صرف خاص لوگوں کو جانے کی اجازت تھی۔ عوام کیلئے اس کے دروازے ہمیشہ بند رہے۔ رعمیس دوئم نے ابوسمبل تعمیر کیا۔ یہ بھی اپنی مثال آپ تھا۔ فراعنہ کی اس عبادت گاہ کے باہر رعمیس دوئم اور اس کی بیوی نفرتری کے مجسمے نصب ہیں جن کی اونچائی ستر فٹ ہے۔ اس مندر کے کھنڈرات کو از سرِ نو اپنی بنیادیوں پر کھڑا کیا گیا ہے۔ جو اس وقت بھی جھیل ناصر کے کنارے اپنی آن وشان کے ساتھ سیاحوں کو ماضی کی یادیں دلاتے ہیں۔

رعمیس ثانی سب سے ظالم اور عیاش حکمران تھا۔ اس کی کئی بیویاں تھیں جن سے اس کے سو سے زیادہ بچے تھے۔ الاقصر میں کھدائی کے دوران ایک غار سے اس کے پچاس بچوں کی لاشیں برآمد ہوئیں تھیں۔ حضرت موسیٰ اسی رعمیس ثانی کے دورِ حکومت میں شاہی محل میں پرورش پاتے رہے۔ اس کا دارالحکومت تو الاقصر میں تھا لیکن شاہی محلات بالائی مصر میں ڈیلٹا کے علاقہ قنطیر Qantir میں بھی تھے۔ یہ محل پی۔ رعمیس کے نام سے مشہور تھے۔ اس وقت یہ جگہ تینس Tanis کے نام سے جانی جاتی ہے۔ رعمیس ثانی کا شاہی خاندان یہاں ہی رہتا تھا۔ اس علاقہ میں بنی اسرائیل اکثریت میں آباد تھے۔ اکثریت کو اقلیت میں بدلنے کیلئے فرعون نے اسرائیلی لڑکوں کو قتل کروانا شروع کر دیا تھا۔ حضرت موسیٰ کی پیدائش پر اُن کی ماں نے الہامی ہدایت کے مطابق حکمت عملی سے نومولود کو ایک ٹوکری میں رکھ کر دریا میں بہا دیا تو ٹوکری بہتی ہوئی جب

فرعون کے محل کے قریب سے گزری تو اُس وقت شاہی خواتین دریائے نیل میں غسل کر رہی تھیں۔ جنہوں نے ٹوکری میں بچہ دیکھا تو اُسے دریا سے باہر نکال لیا۔ اس بچے کو فرعون کی بیوی نے گود لے لیا۔ یوں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی پرورش کا بندوبست شاہی محل میں کر دیا تھا۔

رعمیس ثانی نے 1298 ق م سے 1235 ق م یعنی 53 سال حکومت کی تھی۔ وفات کے بعد اس کے بیٹے منفتاح Merneptah نے حکومت سنبھالی۔ بھائیوں میں اس کا نمبر تیرواں تھا۔ حکومت سنبھالنے سے قبل یہ فوج کا سپہ سالار تھا۔ جس نے 1235 ق م سے 1214 ق م تقریباً بیس سال حکومت کی۔ ساٹھ سال کی عمر میں یہ بادشاہ بنا۔ منفتاح کے دور میں حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو مصر سے نکالا تھا۔

رعمیس سوئم کے بعد فرعونی حکومت کی بھاگ ڈور پادریوں آمن Ammon کی طرف منتقل ہوگئی۔ حقیقت میں حضرت موسیٰ سے مقابلہ کرنے والے فرعون کی غرقابی کے بعد فراعنہ کی حکومت کو زوال آنا شروع ہو گیا تھا۔

1090 ق م میں بالائی اور لوئر علاقہ کی الگ الگ ریاستیں بن گئیں۔ مصر میں یہ افراتفری کا دور تھا۔ مقامی نوابوں نے اپنی اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ یوں مصر ٹکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم ہوا اور مختلف قبائل نے مختلف حصوں پر اپنی اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔

523 ق م میں ایران نے مصر پر قبضہ کر لیا۔ 332 ق م میں اسکندر اعظم نے اسے فتح کیا۔ اور اپنے جرنیل Ptolemy کو مصر کی حکومت سونپی۔ حسینہ عالم قلوپطرہ کا تعلق اسی خاندان سے تھا۔

مصر کا پرانا نام قبط ہے۔ اسی مناسبت سے قدیم مصری اپنے آپ کو قبطی کہلاتے تھے۔ حضور اکرام صلی اللہ علیہ وصلم کے حرم میں داخل ہونے والی حضرت ماریہؓ کا تعلق قبطی خاندان سے تھا۔ اسی وجہ سے وہ تاریخی کتب میں ماریہ قبطیہ کے نام سے مشہور ہیں۔

فراعنہ کا مذہب

فراعنہ کا مذہب عجیب وغریب خیالات اور نظریات پر مبنی تھا۔ ان کے سینکڑوں

دیوتے تھے۔مصریوں نے کچھ کہانیاں تراش کر اپنے مذہب کی بنیاد رکھی تھی۔ایک کہانی کے مطابق زمین وآسمان کے ملاپ سے اُن کا دیوتا اُزریس Osiris وجود میں آیا تھا۔جس کا جسم انسانی اور سر جانور کا تھا۔یہ تمام دیوتاؤں کی صفات کا مجموعہ سمجھا جاتا تھا۔ فراعنہ کے عقیدہ کے مطابق اسی اُزریس دیوتا نے یہ دنیا اور لوگ بنائے۔اس کا بھائی ساتت Seth تھا۔ جو بڑا مغرور اور بدکردار دیوتا تھا۔اِن کی ایک بہن اِزیس Isis نامی تھی جو بہت ہی خوبصورت تھی۔اُزریس دیوتا نے اپنی بہن اِزیس سے شادی کرلی۔اور بڑی کامیاب زندگی گزارنے لگا تھا۔جس سے اس کا بھائی ساتت خوش نہیں تھا۔ چنانچہ ساتت نے اپنے بھائی اُزریس کوقتل کر کے اس کی میت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُسے کسی خفیہ مقام پر چھپا دیا تھا۔

اِزیس نے اپنے خاوند کی میت کو تلاش کر کے اُس پر جادو کے کچھ ایسے کلام پڑھے کہ وہ زندہ ہوگیا۔جس کے بعد ان کے ہاں بچہ پیدا ہوا جس کا نام حورس Horus رکھا گیا۔ بعد میں ساتت نے دوبارہ اُزریس کو قتل کر کے اس کے چودہ ٹکڑے کر کے انہیں دریائے نیل کے مختلف مقامات پر چھپا دیئے۔جب یہ خبر اُزریس کے بیٹے حورس کو ملی تو اس نے اپنے باپ کے قاتل ساتت کو پکڑ کر قتل کر دیا۔یہ جون کا مہینہ تھا۔ازیس اپنے خاوند کی موت پر اس قدر روئی کہ دریا نیل میں طوفان آ گیا۔رونے کے بعد جب سنبھلی تو پھر میت کو دوبارہ ڈھونڈ کر انہیں حنوط کر کے کسی خفیہ مقام پر محفوظ کر دیا تھا۔یوں مصریوں میں لاشیں حنوط کرنے کا تصور پیدا ہوا۔آج بھی جون کے مہینے میں جب دریا نیل میں طغیانی آتی ہے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ آج کی رات ہی ازیس اپنے خاوند کی موت پر روئی تھی۔ جسے اہل مصر طوفانی رات کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

اسلامی نظریہ تخلیق کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو تخلیق کیا تھا۔پھر اُن کی پسلی سے اماں حوا پیدا ہوئیں۔جن کے بیٹے ہابیل اور قابیل تھے۔قابیل نے اپنی بہن سے شادی کی۔غالباً قربانی کی قبولیت کے مسئلہ پر دونوں بھائیوں کے اختلافات ہوئے۔تو ہابیل نے قابیل کو قتل کر دیا تھا۔ ہابیل قتل کر کے پچھتایا۔میت کے بارے میں فکر مند تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک پرندے کو بھیجا جس نے اپنے ساتھی پرندے کو مارا اور اُسے زمین میں دفن کیا۔ہابیل نے یہ بات پرندے سے سیکھی اور قابیل کی میت کو قبر کھود کر دفن کیا۔

مصریوں کے دیوتاؤں کی تخلیق اور اسلامی نظریہ کے بنیادی کردار تو ایک جیسے ہیں

لیکن بنیادی فرق اللہ تعالیٰ کی ہستی اور وحدانیت کا ہے۔ قرآن پاک کی روشنی میں انسان اس زمین پر اللہ تعالیٰ کا نائب یعنی خلیفہ مقرر کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس فراعنہ اپنے آپ کو خدا کہلواتے تھے۔

فرعونی مذہب کی بنیاد جس خیالی دیوتا اُزریس کی کہانی پر رکھی گئی تھی۔ اُس نے اپنی بہن اِزیس سے شادی کی تھی۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ فرعون اپنی بہنوں، بیٹیوں اور ماؤں کے ساتھ شادیاں کرتے تھے۔ فراعنہ کا خیال تھا کہ اُن کا خون اعلیٰ و ارفع ہے جس میں دوسرے خون کی ملاوٹ نہیں ہونی چاہئے۔ اپنے اعلیٰ نسل اور خون کی حفاظت کیلئے اپنے خاندان سے باہر شادیاں نہیں کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے اُن کا خون تو انکی نسلوں میں منتقل ہوتا رہا۔ لیکن فرعون مختلف بیماریوں میں کچھ اس طرح مبتلا ہوئے جن کا علاج ناممکن ہو گیا تھا۔ آخری دور کے کچھ فراعنہ کی شکلیں بھی عجیب وغریب ہو گئیں تھیں۔ کچھ کے نچلے دھڑ عورتوں جیسے ہو گئے تھے۔ فراعنہ دور کے خاتمہ کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

فراعنہ کے خدا

فراعنہ ایک خدا کی بجائے کئی دیوتاؤں پر ایمان رکھتے تھے۔ اِن کا سب سے بڑا دیوتا سورج تھا دوسرا امن اور تیسرا اپتھ Ptah تھا۔ ان کے مندر پورے مصر میں تھے۔ کچھ بادشاہ بھی مرنے کے بعد دیوتا کا روپ اختیار کر لیتے تھے اور لوگ بعد از مرگ اُن کی عبادت کرتے تھے۔ لیکن اس کے لئے لازمی تھا کہ بادشاہ زندگی میں تین بڑے کام انجام دے۔ اول اپنے لئے اہرام، دوسرا شہر میں اعلیٰ شان مندر تعمیر کروائے اور تیسرا کسی دشمن کو عبرت ناک شکست دے۔ جو بادشاہ یہ تینوں کام حیات میں انجام دیکر رخصت ہوتے رہے وہ دیوتا کی حیثیت اختیار کر لیتے تھے۔

قدیم مصری اپنے دیوتاؤں کے مجسمے عجیب وغریب شکلوں کے تیار کرتے تھے۔ کچھ میں انسانی جسم بنا کر اوپر کسی جانور یا پرندے کا سر لگا دیتے تھے۔ ان کا سب سے بڑا دیوتا اُزریس تھا جسے وہ اگلے جہاں کا دیوتا مانتے تھے۔ اسے جانوروں کا بھی دیوتا مانا جاتا تھا۔ مصریوں کا تصور تھا کہ دوسرے جنم میں یہ دیوتا انکی مدد اور حفاظت کرے گا۔ یہی بات تھی کہ

میت کے اوپر اس کی تصویر بنائی جاتی تھی۔

حورس نامی دیوتا کا سر عقاب کا تھا۔ فراعنہ حورس کو بادشاہ کے روپ میں زندہ دیوتا تصور کرتے تھے۔ اور اپنے تاج میں عقاب کی آنکھ کو شامل کیا جاتا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ یہ آنکھ انہیں دشمنوں سے بچاتی ہے۔ چونکہ حورس نے اپنے بدکردار چچا ساتت Seth کو قتل کیا تھا۔ ساتت صرف بدی کا دیوتا نہیں تھا بلکہ طوفان اور سیلاب بھی یہی لاتا تھا۔ جس کی وجہ سے فراعنہ میں یہ دیوتا بہت ہی بدنام تھا۔

مصر کا ایک قدیمی گیت ہے:

جہاں اُزریس پانی میں ڈوبا تھا
ازریس نے اسے ڈوبتے دیکھا تھا
تب ازریس بہت غمگین ہوئی
حوریس نے چیختے ہوئے کہا تھا
تم اُزریس کو پکڑو اور ڈوبنے نہ دو

اُزریس مر کر بعد از موت کی دنیا کا دیوتا بن گیا تھا۔ ان کی ایک بہن ہیتھر تھی جس کے سر پر گائے کے سینگوں کے درمیان سورج کی تصویر کا نشان تھا جو محبت کی دیوی تسلیم کی جاتی تھی۔ اسی طرح بکرے کے سینگوں کے درمیان سورج کی ڈسک والا دیوتا رم Ram کہلاتا تھا۔

فرعون بلی، عقاب، شیر، آبی پرندے، گائے، دریائی گھوڑا، کوبرا سانپ، مگرمچھ کی بھی پرستش کرتے تھے۔ فراعنہ کچھ پرندوں کے پروں کو بھی مقدس سمجھتے تھے۔ جو اُن کے تاج میں بھی شامل کیے جاتے تھے۔ بالکل اُسی طرح جیسے سکھ مذہب میں مور کے پر مقدس سمجھے جاتے ہیں۔ برصغیر کے کچھ مسلمان بھی مور کے پروں کو مقدس مانتے ہوئے اپنی مقدس کتاب قرآن پاک میں رکھتے ہیں۔

فراعنہ کے عقیدے کے مطابق سورج (آمون) جو را Ra اور ایٹن Aten کے نام سے پکارا جاتا تھا تمام دیوتاؤں کا دیوتا تھا۔ اسی کی وجہ سے دنیا کا نظام چلتا ہے۔ سورج جب دکھی ہوتا ہے تو اپنی شعاؤں کی صورت میں آنسو بہاتا ہے۔ Ptah نائی دیوتا سورج کا ہی عکس سمجھا جاتا تھا۔ جو تخلیق کاروں اور ہنرمندوں کا دیوتا تھا۔ آگ اور ہوا کا دیوتا شی Shu تھا۔ زمین اور

آسمان کے دیوتے جیب Geb اور نٹ Nut تھے۔جبکہ اگلے جہاں کا دیوتا اُزریس تھا۔

فراعنہ کے اِن دیوتاؤں کے رشتہ دار بھی ہوتے تھے۔مثال کے طور پر دیوتا کی بیوی ،بہن ،ماں ،باپ ،بیٹا یا بیٹی چنانچہ اُن رشتہ داروں کے بت ملک کے مختلف مندروں میں رکھے جاتے تھے۔اگر کوئی گروہ نیا دیوتا بنا کر اُس کی پوجا شروع کر دیتا تو پروہت اُس کی مخالفت کرتے تھے۔اسی مخالفت میں مختلف مندروں کے درمیان عقیدت منداپنے دیوتاؤں کی لڑائیاں لڑتے تھے۔

سورج دیوتا

اہل مصر سورج کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔جسے تمام دیوتاؤں کا اُوتار سمجھا جاتا تھا۔ اُن کے خیال کے مطابق اگر سورج نہ ہوتو دنیا میں کچھ بھی پیدا نہیں ہوسکتا۔دنیا کی تخلیق کرنے والا سورج ہے۔آج کی جدید سائنس اس بات سے اتفاق کرتی ہے کہ زندگی کا رشتہ پانی سے جڑا ہے۔جہاں پانی نہیں وہاں زندگی نہیں یہی وجہ ہے کہ چاند پر نہ تو پانی ہے اور نہ زندگی۔لیکن اگر سورج نہ ہوتو یہ دنیا سرد خانہ بن جائے۔سمندر جم جائیں۔زمین بنجر ہو جائے۔کھانے پینے کی اشیاء ختم ہو جائیں تو ایسے میں انسان بھی ختم ہو جائیں۔سورج کی تپش سے زمین اپنے سینے سے خوراک اور اللہ کی دوسری نعمتیں باہر نکالتی ہے۔ممکن ہے اس بات سے فراعنہ بھی آگاہ ہوئے ہوں تب تو وہ سورج کی پوجا کرتے تھے۔

فراعنہ دریائے نیل کی بھی عبادت کرتے تھے۔آج بھی اہل افریقہ اسے مقدس دریا سمجھتے ہیں۔یہ حقیقت ہے کہ افریقہ کے صحرا میں جو زندگی نظر آتی ہے وہ اسی دریائے نیل کی بدولت ہے۔

پیتھ دیوتا Ptah

پیتھ دیوتا Ptah فراعنہ کا تیسرا بڑا دیوتا تھا۔جو سورج کے ماتحت تھا۔اسے تخلیق کاروں اور ہنرمندوں کا دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ممفیس میں اس کا بہت بڑا مندر تھا۔اور اہل ممفیس اس کی پوجا کیا کرتے تھے۔فراعنہ کا تصور تھا کہ تمام تخلیقی کام اسی دیوتا کی بدولت ہوتے ہیں۔ چنانچہ اُس زمانے کے سنگ تراش ،بڑھئی ،لوہار ،مستری ،موچی ، حجام ،ڈاکٹر ،آرکیٹیک کا

سرپرست اعلیٰ اسی دیوتا کو مانا جاتا تھا۔ فراعنہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے آرکیٹیک امھوتب کو اس کا بیٹا مانتے تھے۔ یہ وہی امھوتب تھا جس نے دنیا میں سب سے پہلا اہرام تعمیر کیا۔ آج بھی ماہرین تعمیرات اسے آرکیٹیک کا باوا آدم مانتے ہیں۔ اسی امھوتب نے دنیا میں پہلی کرسی اور پہلا جوتا بنایا تھا۔ اس سے قبل دنیا میں کرسی اور جوتے کا تصور نہیں تھا۔ لوگ ننگے پاؤں رہتے تھے۔ اسی امھوتب نے سرجری اور حکمت کو اتنا فروغ دیا کہ یونانیوں کو اسے حکمت کا دیوتا ماننا پڑا۔ فراعنہ کے زمانے میں ہنرمندوں کو پیتھ دیوتا Ptah کے عملی روپ میں دیکھا جاتا تھا۔ پیتھ دیوتا کی مصر میں اتنی عزت تھی کہ عام لوگوں کے ساتھ ساتھ فراعنہ خود بھی اُسے سجدہ کیا کرتے تھے۔

فراعنہ اس بات کے معترف تھے کہ ہنرمندوں کے بغیر وہ دوسرے جہاں میں نہیں پہنچ سکتے چونکہ اگر کاریگر لکڑی سے کشتی نہیں بنائے گا تو اگلے جہاں کا سفر ممکن نہیں۔ اور پھر اگر ماہرین اپنے ہنر سے میت کو حنوط نہیں کریں گئے تو جسم محفوظ نہیں رہ سکتا اور اگر جسم محفوظ نہیں ہوگا تو اگلے جہاں میں پہنچنا مشکل ہے۔ اسی طرح سنگ تراس اور دوسرے ہنرمند اگر اہرام تعمیر نہیں کریں گئے تو میت کا کافی عرصہ محفوظ رکھنا مشکل ہے۔ اگر کاریگر کپڑا تیار نہیں کرے گا تو حنوط کرتے وقت میت کو کس طرح لپیٹ کر محفوظ کیا جائے گا۔

فراعنہ کاریگروں کے اس قدر قائل تھے کہ میت کی آخری رسوم کاریگروں کا دیوتا پیتھ انجام دیتا تھا۔ مقبرے میں رکھنے سے قبل تابوت کو پیتھ Ptah دیوتا کے سامنے کھڑا کیا جاتا تھا۔ دیوتا اپنے پجاریوں کی معاونت سے ایک خاص اوزار کے ساتھ میت کا منہ کھولنے کی رسم ادا کرتا تھا۔ تاکہ روح جسم میں جھانک کر دل کو دیکھ سکے اور یہ جان پائے کہ یہ میت کھا بھی سکتی ہے اور پی بھی۔ قبر میں میت کے ساتھ جہاں دوسری چیزیں رکھی جاتی تھیں وہاں پیپرس پر لکھی ہوئی کتاب اموات سے اس طرح کی تحریر بھی لکھ کر رکھ دی جاتی تھی۔

میں روٹی کھا سکتا ہوں
میں شراب پی سکتا ہوں
میں لباس پہن سکتا ہوں
میں عقاب کی طرح اڑ سکتا ہوں

میں بطخ کی طرح آوازیں نکال سکتا ہوں

فراعنہ تخلیق کے دیوتا پیتھ Ptah کے مجسمے کے سامنے جھک کر اُن کی عظمت کو تسلیم کرتے تھے۔ اور شاہی محل کے ساتھ ہی اس کا عالیشان مندر تھا۔

موت کا دیوتا گیدڑ

فراعنہ کے عقائد کے مطابق موت کا دیوتا گیدڑ تھا۔ جو انوبیس دیوتا کے نام سے مشہور تھا۔ اس کا جسم انسان کا اور سر گیدڑ کا تھا۔ فراعنہ دور کی کتاب اموات جو انکی دعاؤں کا مجموعہ تھی کے مطابق انوبیس ہی وہ دیوتا ہے جو موت کے بعد فراعنہ کے دل کو اُس کی نیکیوں کے ساتھ ترازو میں تول کر اس بات کا فیصلہ کرتا تھا کہ فراعنہ کا انجام کیا ہونا چاہئے۔ انوبیس دیوتا کالے رنگ کا تھا۔ جس کی پشت کے درمیان ریڑھ کی ہڈی کا نشان اس بات کا ثبوت تھا کہ مصر کے صحرا کے بیچوں بیچ دریا نیل بہہ کر اپنے کناروں کی زمین کو کاشت کیلئے تیار کرتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ موت کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ گیدڑ دیوتا کو بھی لوگ پسند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ لوگوں کی اکثریت آج بھی گیدڑ کو پسند نہیں کرتی۔ ''گیدڑ بولنا'' آج بھی بدشگونی کی علامت ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ گیدڑ بیچارے کی ہر زمانے میں شامت ہی آتی رہی۔ آج بھی یہ بات ایک محاورے کے طور پر استعمال کی جاتی ہے کہ '' گیدڑ کی کم بختی آئے تو گاؤں کو بھاگ جائے''۔

گیدڑ دیکھنے میں تو معصوم ہوتا ہے لیکن موقع ملتے ہی وہ اپنی چالاکی کا مظاہرہ بھی کر دیتا ہے۔ میرا بچپن دیہات میں گزرا۔ مجھے یاد ہے ساون بادوں میں جب مکئی کے پودے بڑے ہو جاتے تھے تو گیدڑ وہاں چھپ کر بیٹھا رہتا تھا۔ جوں ہی کوئی مرغی کھیت میں دانا دنکا چگنے جاتی گیدڑ جھٹ اُسے پکڑ کر مار دیتا تھا۔ چنانچہ آج بھی گیدڑ کچھ پرندوں کیلئے اپنے ساتھ موت ہی لاتا ہے۔ گیدڑ کو نہ لوگ کل پسند کرتے تھے اور نہ آج۔

ہندوازم اور فراعنہ

محسوس ہوتا ہے جیسے فراعنہ اور ہندو مذہب میں بہت مماثلت ہے۔ فراعنہ بھی ایک سے زیادہ دیوتاؤں کے قائل تھے اور ہندو بھی۔ فراعنہ اپنے دیوتے خود تراشتے تھے اور ہندوؤں

کی طرح اُن سے مرادیں مانگتے تھے۔ فراعنہ کے عزیز ترین نوکر اُن کے ساتھ زندہ درگور کیے جاتے تھے۔ ہندوؤں بھی ستی کی رسم کے تحت بیوی کو خاوند کے ساتھ زندہ چتا میں ڈالتے تھے۔ آج بھی ہندوستان کے کچھ علاقوں میں ایسا ہو رہا ہے۔ فراعنہ کی میت کو پجاری ڈھول باجوں کے ساتھ اہرام کی طرف لے جاتے تھے۔ بالکل اُسی طرح ہندووں جب عورت کو ستی کیلئے پروہت کی قیادت میں لے جاتے ہیں تو ڈھول اور باجے بجاتے جو اُس وقت تک بجتے رہتے ہیں جب تک زندہ جسم خاک نہیں ہو جاتے۔ ڈھول باجے بجانے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ زندہ جل مرنے والی عورت کی چیخ و پکار کو دوسرے لوگ سن کر اُس پر رحم نہ کھائیں۔

فراعنہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے پیغمبروں اور اُن کے پیروکاروں کو نہیں مانتے تھے۔ بلکہ الٹا اُن سے غلاموں سے بدتر سلوک کرتے۔ ہندووٴں بھی بالکل اُسی طرح کے مظاہرے کرتے ہیں۔ بھارت میں عیسائیوں اور مسلمان کو نہ صرف نفرت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ بلکہ انہیں اچھوت سمجھتے ہوئے اُن کے ساتھ کھانا پینا کجا بلکہ ان کے سائے سے بھی دور بھاگتے ہیں۔ قبل از اسلام عرب میں بت پرستی عروج پر تھی۔ لوگوں نے خود ہی خدا بنا رکھے تھے جنہیں مختلف نام دیکر خود ہی اُن سے مرادیں مانگتے تھے۔ دیوتاؤں اور بت پرستی دنیا کا بہت قدیم مذہب ہے۔ اسی لئے علامہ اقبال نے کہا تھا:

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدھوں کے بت ہوگئے پران

دیوتاؤں پر ایمان رکھنے والی اِن قوموں کا جائزہ لینے کے بعد قرآن پاک سورہ الاعراف آیات 189 میں ارشاد خداوندی پر اگر غور کریں تو جس انسان کو اللہ تعالیٰ نے تھوڑی بھی سوچ عطا کی ہے وہ یقیناً دین حقیقی میں داخل ہونے پر غور کرے گا:

اَیُشْرِکُوْنَ مَالَا یَخْلُقُ شَیْئًا وَّ ھُمْ یُخْلَقُوْنَ
وَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ لَھُمْ نَصْرًاوَّ لَآ اَنفُسَھُمْ
یَنصُرُوْنَ O

کیسے نادان ہیں یہ لوگ کہ اُن کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں
جو کسی چیز کو بھی پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے

ہیں۔ جو نہ اُن کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ آپ اپنی مدد پر قادر ہیں۔

کتاب اموات

فراعنہ کے زمانے میں جادوٹونے کا بہت زور تھا۔ مذہبی پیشواؤں نے اپنے عقائد کے مطابق ایک کتاب تیار کر رکھی تھی جو''کتاب اموات'' کہلاتی تھی۔ جس میں دعائیں اور جادوٹونے کے کلمات لکھے ہوئے تھے۔ اس کتاب میں سے ہی کچھ ابواب بادشاہوں، وزاراء اور امیر لوگوں کی قبروں میں لکھے جاتے تھے۔ جس قدر لوگ خرچ کرتے اُس کے مطابق پروہت انہیں کلام دیتے تھے۔ بردی پیپرز، پتھر کی سلوں یا پھر شاہی مقبروں کی دیواروں اور لکڑی کے تابوت پر یہ تحریریں لکھی جاتی تھی۔ مذہبی پیشواؤں کا دعویٰ تھا کہ ان کلمات کی برکت سے آخرت کا سفر بخیریت گزرے گا۔ چنانچہ لوگ زیادہ سے زیادہ مال خرچ کر کے یہ کلام دلفریب خریدتے تھے۔

مذہبی پیشواؤں کے علاوہ کچھ دوسرے لوگوں نے بھی جنتر منتر سیکھا ہوا تھا۔ جن کے زور سے وہ جادو کے کمالات دکھاتے رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا دستور ہے کہ جب بھی اپنے کسی پیغمبر کو کسی بڑے مشن پر بھیجا تو اُس زمانے میں لوگ جس چیز پر سب سے زیادہ اندھادھند عقیدہ رکھتے تھے۔ اُس کا توڑ پیغمبر کو دیکر بھیجا گیا۔ فراعنہ کے دور میں جادو عروج پر تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ کو اپنا پیغمبر نامزد کر کے انکی تربیت کی تو سب سے پہلے انہیں یہی حکم دیا:

''موسیٰ ذرا اپنی لاٹھی کو پھینک''۔

حضرت موسیٰ نے لاٹھی پھینکی تو وہ سانپ بن گیا۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''موسیٰ ڈر مت اسے پکڑ۔''

حضرت موسیٰ نے اُسے پکڑا تو سانپ پھر لاٹھی بن گیا۔ اس تربیت کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو فرعون کے دربار میں بھیجا تھا۔

فرنچ کٹ ڈاڑھی

فرعون داڑھی نہیں رکھتے تھے۔ لیکن جب مرتے تو میت کو حنوط کرنے کے بعد

ٹھوڑی پر رسمی طور پر ایک لمبی سی داڑھی لگا دی جاتی تھی۔ فراعنہ کی حنوط شدہ لاشوں کی تصویروں میں یہ ڈاڑھیاں ٹھوڈیوں پر نظر آتی تھیں۔ میت کے بازوں کو کراس کی شکل میں سینے پر رکھا تھا۔ ٹھوڑی پر داڑھی کے نشان اور بازوں کے کراس کا مطلب تھا کہ بادشاہ زندہ نہیں۔ ممکن ہے فرانس کے محققین نے فرعونی دور پر تحقیق کے دوران جب یہ معلوم کیا ہو کہ فراعنہ کی ڈاڑھیاں ہوتی تھیں تو انہوں نے اُسی طرز کی ڈاڑھیاں رکھنی شروع کر دیں۔ جسے انہوں نے اپنی اختراع سے ''فرنچ کٹ ڈاڑھی'' کے طور پر متعارف کروایا۔ چونکہ فرانسیسی فراعنہ سے بڑے مرغوب تھے۔ جب فرانس نے مصر پر قبضہ کیا تو فرانسیسی حکمران نپولین مصر گیا۔ جہاں اس نے رات اہرام کے اُس چیمبر میں گزاری جہاں کسی زمانے میں فرعون کی میت رکھی ہوئی تھی۔ آج بھی بعض مسلمان فرنچ کٹ ڈاڑھی فیشن کے طور پر رکھتے ہیں۔ اس تناظر میں سعودی حکمرانوں اور شہزادوں کی فرنچ کٹ داڑھیاں کافی شہرت رکھتی ہیں۔ ایسے لوگوں کو فیشن کے طور پر رکھی ہوئی ڈاڑھیوں کے پس منظر پر بھی غور کر لینا چاہیے۔

حنوط کے طریقے

فراعنہ کے عقیدہ کے مطابق مرنے کے بعد انسان دوسری دنیا میں چلا جاتا ہے جسے وہ انڈر وارڈ کہتے تھے۔ دوبارہ زندگی حاصل کرنے کیلئے اُن کا تصور یہ تھا کہ اگر میت درست حالت میں ہوگی تب ہی انسان کو دوسری زندگی ملے گی۔ دوسری زندگی کے لئے میت کو حنوط کیا جاتا تھا۔ جسم کو حنوط کیسے کیا جاتا تھا آیئے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

بادشاہ کی وفات کی خبر سب سے پہلے ہنرمندوں تک پہنچائی جاتی تھی۔ یہ خبر ملتے ہی کاریگروں میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ خوشی اس بات کی نہیں کہ ایک فرعون کے مرنے کے بعد دوسرے فرعون کے آنے سے لوگوں پر ظلم کی شدت کم ہو جائے گی بلکہ اس بات کی خوشی ہوتی تھی کہ جو مقبرے وہ تیار کر رہے تھے اب اُن کی آخری آرائش کا کام مکمل کیا جائے۔ یوں کاریگر متحرک ہو جاتے اور رات دن مقبرے پر کام کرتے ہوئے ایک میلے کا سماں پیدا ہو جاتا تھا۔

جب کاریگروں کی ایک جماعت مقبرے کی تیاری کر رہی ہوتی تھی تب شاہی میت کو اُن ماہرین کے حوالے کر دیا جاتا تھا جو میت کو حنوط کرتے تھے۔ میت کو حنوط کرنے میں 72 دن

لگتے تھے۔ سب سے پہلے میت کو آپریشن تھیٹر جسے وہ IBU کہتے تھے میں لے جاتے۔ جہاں میت کو پام کی خوشبو سے معطر شراب سے دھویا جاتا۔ پھر دریائے نیل کے پانی سے غسل دیا جاتا۔ پیٹ کے بائیں طرف ناف کے قریب سے چمڑے کو کاٹ کر دل کے علاوہ دوسرے تمام اعضاء نکال لیے جاتے تھے۔ اور پھر کٹے ہوئے چمڑے کو ٹانکے لگا دیئے جاتے تھے۔ میں نے دیکھا آج بھی سرجن اُسی طریقے سے ٹانکے لگاتے ہیں جیسا فراعنہ کے دور میں لگائے جاتے تھے۔ اعضا کا نکالنا اس لئے ضروری سمجھا جاتا تھا کہ جسم کے یہی اعضاء سب سے پہلے خراب ہوکر بدبو پیدا کرتے ہیں۔

جسم سے نکالے جانے والے اعضاء جگر، گردے، پھیپھڑے اور آنتوں کو الگ کر کے صاف کیا جاتا تھا۔ پھر میت کو اندر سے خوب صاف کیا جاتا تھا۔ دل کو اس لئے نہیں نکالا جاتا تھا کہ یہ جسم کا مرکزی اور سب سے اہم عضو تھا۔ انسان کو اس کی دوسرے جہاں میں ضرورت پڑے گی۔ لوہے کی ہک ناک کے ذریعے اندر ڈال کر دماغ کی ہڈی توڑ کر مغز ناک کے ذریعے نکال لیا جاتا تھا۔ جسم سے نکالے گئے اعضاء کو الگ صاف کر کے انہیں بھی تیل اور روغنیات سے معطر کر کے خشک کرنے کے بعد ریشم کے کپڑوں میں بند کر کے دوبارہ جسم کے اندر رکھ دیئے جاتے تھے۔ پھر سوتی کپڑا اور درختوں کے پتے بھر دیئے جاتے تھے تا کہ جسمانی ساخت بدل نہ جائے۔ جس کے بعد جسم پر نا ٹرون یعنی خام شورہ ڈال کر ڈھانپ دیا جاتا تھا۔ تا کہ جسم کی چربی اور دوسری رطوبت نکل جائیں۔

چالیس دن کے بعد جسم کو دریائے نیل کے پانی سے دھوکر جسم پر تیل اور دوسرے روغنیات لگا کر خشک ہونے کیلئے رکھ دیا جاتا تھا۔ پھر مرحلہ وار تہہ بتہہ پٹیاں باندھی جاتی تھیں۔ پٹیاں باندھنے کا آغاز سر سے کیا جاتا تھا۔ ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کو الگ الگ پٹیاں باندھی جاتی تھیں۔ بازوں اور ٹانگوں کو بھی الگ الگ باندھ کر پھر پورے جسم پر ایک چادر ڈال کر گوند کے ساتھ چپکا دی جاتی تھی۔ پٹیوں کی ہر تہہ کے بعد گوند لگائی جاتی تھی تا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ پیوست رہیں۔ اس دوران مذہبی رہنما مقدس کلمات پڑھتے رہتے تھے جس کا مقصد بدروح مخلوق کو دور رکھنا ہوتا تھا۔ آخر میں تابوت کے اوپر مرنے والے کا نام اور دیوتا اُزریس کی تصویریں بنائی جاتی تھی۔ تا کہ یہ دیوتا میت کی حفاظت کرے۔ جب میت حنوط

ہو جاتی تو اُسے ورثاء کے حوالے کیا جاتا تھا۔ خاندان کے لوگ جمع ہو کر ماتمی رسم ادا کرتے۔ اس رسم کے دوران میت کو سیدھا کھڑا رکھا جاتا تھا۔

جب میت حنوط کے مراحل سے گزر رہی ہوتی تھی تب سنگ تراش قبر کے سائز کے ایک بڑے پتھر کو بیچ میں سے کاٹ کر قبر تیار کرتے تھے۔ بڑھئی لکڑی کے تابوت تیار کرتے تھے۔ سونار چہرے پر رکھنے کیلئے سونے کے ماسک تیار کرتے تھے۔

پھر میت کو شاہی آداب اور رسومات کے تحت جلوس کی شکل میں شاہی محل۔ سے انوبیس مندر کی عبادت گاہ لے جاتے۔ اس دوران مصری عوام سڑکوں یا دریا نیل کے دونوں کناروں جہاں سے شاہی میت گزرتی کھڑے ہو کر اُسے الوداع کہتے تھے۔ خواتین بال کھولے ماتمی حالت میں آہ و فغاں کرتیں۔ گیزہ، سقارہ اور الاقصر میں ویلی آف کنگ میں آخری رسومات کیلئے مخصوص عبادت گاہیں تھیں۔ جہاں مذہبی رہنما آخری رسومات ادا کرتے۔ اس موقع پر نیا بادشاہ اور شاہی خاندان کے لوگ موجود ہوتے تھے۔ آخر میں مذہبی پیشوا میت کاریگروں کے حوالے کرتے جو میت کو اہرام یا مقبرے کے اندر بنائے گئے خفیہ مقام پر پہنچا کر آہستہ آہستہ دروازے بند کر دیتے تھے۔

تدریسی نظام

فراعنہ کے زمانے میں لکھائی اور پڑھائی کے شعبہ میں زیادہ تر وہ لوگ جاتے جن کا تعلق عبادت گاہوں یا پروہت کے خاندان سے ہوتا تھا۔ عام لوگوں کیلئے لکھائی پڑھائی ممنوع تھی۔ یہ سب سے زیادہ باعزت پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ الاقصر کے ٹمپل کی دیوار پر لکھی ہوئی ایک تحریر ہے۔ والد اپنے بچے کو لکھائی اور پڑھائی کی تعلیم کیلئے استاد کے پاس لے گیا۔ استاد بچے سے مخاطب ہوتا ہے:

تم اپنی ماں سے بہت زیادہ پیار کرتے ہو
لیکن تم لکھائی پڑھائی سے محبت ماں سے بھی زیادہ کرو گے
میں تجھے اس کی خوبصورتی بتاؤں گا
یہ تمام پیشوں سے بہتر پیشہ ہے

دنیا میں اس جیسا کوئی پیشہ نہیں

فراعنہ کے جرنیلوں کیلئے لکھائی پڑھائی لازمی تھی تا کہ وہ میدان جنگ میں پیغام بھیج اور وصول کر سکیں۔ حکومتی آفیسروں کو فصل کی پیداوار، مال مویشیوں کی تعداد کسانوں سے ٹیکس وصول کرنے کیلئے تعلیم ضروری تھی۔ جبکہ کاریگروں کیلئے یہ فن سیکھنا اس لئے ضروری تھا تا کہ وہ بادشاہوں اور امراء کے مقبروں میں دعائیں اور اُن کے کارنامے رقم کر سکیں۔ پروہتوں کیلئے بھی تعلیم یافتہ ہونا ضروری تھا۔ یہ لوگ مندروں کی دیواروں پر لکھائی اور اس طرح کے مناظر نقش کرتے تھے جن سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ بادشاہ اس عبادت گاہ کی عزت کرتا ہے۔ اور پھر ان کا یہ بھی فریضہ تھا کہ مختلف مناظر کشی کر کے دیوتاؤں کو خوش رکھیں۔ تعلیم یافتہ لوگ دیواروں اور کاغذ پر لکھنے کے ماہر ہوتے تھے۔ اُس زمانے میں لکھنے کے لئے قلم کی بجائے کچھ اس قسم کے اوزاروں کی ضرورت ہوتی تھی جن سے لکھائی کی بجائے کھدائی کی جا سکے۔ چونکہ حروف کی بجائے پرندوں، جانوروں اور کچھ دوسرے سمبل سے مفہوم بیان کیا جاتا تھا۔

فراعنہ کے تہوار

نئے سال کا آغاز 19 جولائی سے ہوتا تھا۔ اس موقع پر جشن نوروز کا اہتمام ہوتا تھا۔ افتتاح جشن پر قربانی دی جاتی اور بادشاہ خود کھیت میں ہل چلا کر نئے سال کا آغاز کرتا تھا۔

مصر میں قربانی کا تصور بہت پرانا ہے۔ آغاز میں انسانی قربانی دی جاتی تھی۔ اور وہ بھی ایسے انسان کی جو سب سے بہتر ہوتا تھا۔ بادشاہ سب سے اعلیٰ وارفع سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے بادشاہ کی قربانی بڑے اہتمام کے ساتھ دی جاتی تھی۔ فراعنہ برسر اقتدار آئے تو انہوں نے انسانی قربانی کا سلسلہ جاری رکھا۔ لیکن اپنی جان بچانے کی خاطر جشن قربانی سے تین چار روز قبل خود منظر سے غائب ہو کر اپنی جگہ کسی صحت مند غلام کو بیٹھا دیتے تھے۔ یہ کھیل عوام کی نظروں سے اوجھل رکھنے کی خاطر عارضی بادشاہ کو محل میں گھومنے پھرنے، کھانے پینے بلکہ رات کے وقت ملکہ کے ساتھ سونے کی بھی اجازت ہوتی تھی۔

آخر مقررہ دن موت کا دیوتا گیدڑ کے روپ میں آتا اور تخت نشین بادشاہ کو اپنے ساتھ قربان گاہ لے جاتا۔ جہاں اُس کی قربانی دی جاتی اور گوشت ملک کے مختلف علاقوں میں

بھیج دیا جاتا تھا۔ پروہت یہ گوشت کسانوں کے حوالے کرتے جو کھیت میں اس امید کے ساتھ دفن کر دیتے تا کہ اس کی برکت سے فصل اچھی پیدا ہو۔

فراعنہ نے جب دیکھا کہ چار دن کی بادشاہت کرنے والا کمتر غلام ملکہ کے ساتھ شب بسری کے نتیجہ میں بعض اوقات نشانی کے طور پر ولی عہد بھی عطا کر جاتا تھا۔ یوں خاندان میں اصلی اور نقلی کی جنگ شروع ہو جاتی تھی۔ ایسے میں فراعنہ کے حکم پر انسانی قربانی ممنوع قرار دیکر ہرن قربان کیے جانے لگے۔ ایسی قربانیوں کے موقع پر ملک بھر میں جشن بنائے جاتے۔ تمام مندروں میں خصوصی تقریبات منعقد ہوتیں جہاں پروہت خصوصی جشن کا اہتمام کرتے تھے۔ شراب و شباب کا کھل کر استعمال ہوتا تھا۔ ناچ گانے اور بادشاہ کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے۔ کسان بھی ایک ہفتہ جشن میں مشغول رہتے اور پھر ہل لیکر کھیتی باڑی میں جُت جاتے۔

جب یوگنڈا اور دوسرے افریقی ممالک کے پہاڑوں پر مون سون کی بارشوں کا آغاز ہوتا تو دریا نیل میں پانی چڑھنا شروع ہو جاتا تھا۔ جو مصر کی حدود میں آ کر سیلاب کی حیثیت اختیار کر لیتا تھا۔ سیلاب کا پانی دریا کے کناروں سے نکل کر قرب و جوار کے علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا تھا۔ جب دریا کی طغیانی میں کمی آتی تو پانی میں بہہ کر آنے والی زرخیز مٹی کی تہہ کھیتوں میں رہ جاتی تھی۔ یہ کالے رنگ کی مٹی تھی جس سے فصل زیادہ ہوتی تھی۔ کاشتکار ان زمینوں میں خوب فصلیں اُگاتے تھے۔ جب دریائے نیل میں طغیانی آتی تو مصر کے لوگ خوشی کے شادمانے بجاتے ہوئے اس طرح کے گیت گا کر پانی کو خوش آمدید کہتے تھے:

زندگی دینے والا پانی آیا
اپنے ساتھ بہاریں لایا
سورج دیوتا طلوع ہوتا
آسمان جلاتا زمین ہلاتا
مشرق و مغرب کے پہاڑ اُٹھاتا
سورج دیوتا مصر کو اپنی پناہ میں لے لیتا

ملکی اور مذہبی قانون مندروں کے مذہبی پیشوا تیار کرتے تھے۔ نئی نئی عبادات یا نئے

نئے دیوتے بھی یہی پادری متعارف کرواتے تھے۔ فراعنہ دور میں سورج کو سب سے بڑا دیوتا تصور کیا جاتا تھا۔ فرعون اپنے آپ کو سورج کا بیٹا مانتے اور پھر سورج دیوتا کے اختیارات خود استعمال کرتے تھے۔

فراعنہ کا لباس

فراعنہ بادشاہ لنگوٹ نما ایک لباس پہنا کرتے تھے۔ یہ لنگوٹ تہبند کی طرح مختصر انگریزی لباس منی سکیرٹ جیسا ہوتا تھا۔ جو گھٹنوں سے اوپر ہی رہتا تھا۔ قمیض نہیں پہنتے تھے۔ بہرحال سر پر تاج ہوتا تھا۔ ہر بادشاہ نے اپنی مرضی کے مطابق تاج متعارف کروائے تھے۔ جب مصر دو حصوں میں تقسیم تھا تب جنوب کے بادشاہ سفید اور شمال کے بادشاہ سرخ تاج پہنتے تھے۔ جب ملک متحد ہوا تو بادشاہوں نے سفید اور سرخ رنگوں کو یکجا کر کے تاج پہننا شروع کر دیے۔ یہ تاج اتحاد کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ تاج کے علاوہ بادشاہ ایک چوڑا ہار بھی پہنتے تھے۔ جو موتیوں سے تیار کیا جاتا تھا۔ داڑھی مونڈ دیتے تھے۔ فراعنہ زمانے کی کسی بھی تصویر میں کسی کو بھی ڈاڑھی میں نہیں دیکھا۔ فراعنہ خوشبو لگاتے تھے۔ کنول کا پھول مصر کا قومی پھول تصور ہوتا تھا۔

شاہی خواتین گاؤن نما ایک لمبا سفید رنگ کا لباس پہنتی تھیں۔ فیشن کے طور پر کمر بند ہوتا تھا جسے باندھنے کے بعد اُس کے سرے لٹکتے رہتے تھے۔ ملکائیں سر پر تاج بھی پہنتی تھیں۔ تاج میں کوبرا سانپ پھن کھلائے سامنے کی طرف یوں نظر آتا تھا کہ یہ ابھی کسی کو کاٹ کھائے گا۔ تاج کے علاوہ شاہی مرد اور خواتین بازو گلے اور پاؤں میں مختلف قسم کے زیور پہنتی تھیں۔ سونے کے یہ زیورات بڑے ماہرانہ انداز میں تیار کیے جاتے تھے۔ پتہ چلتا ہے کہ اُس زمانے کے سونار بہت ہی ہنر مند تھے۔ جن کے تیار کردہ زیوارت آج بھی قاہرہ کے عجائب گھر میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ شاہی خواتین کے علاوہ عام خواتین بھی ایسا لباس پہنتی تھیں جس سے جسم ڈھانپ جائے۔ ہار سنگار کرتی تھیں۔ سرمہ اور آنکھوں کے اردگرد کوئی چیز خوشنمائی کیلئے استعمال کرتی تھیں۔ امیر خواتین کریم بھی لگاتی تھیں۔ جو زیادہ تر زیتون کے تیل سے تیار کی جاتی تھیں۔ عورتوں کے سر کے بال لمبے ہوتے تھے۔ اور کچھ فیشن کی دلدادہ خواتین سر کے بالوں

میں کنول کا پھول سجاتی تھیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے آج کے زمانے میں کچھ خواتین بالوں میں پھول سجاتی ہیں۔ کچھ غلام خواتین کے ننگے فوٹو بھی دیکھے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام تن ڈھانپنے کی سہولت سے بھی محروم تھے۔

عام لوگوں کے جسم پر ایک مختصر سا لنگوٹ ہوتا تھا۔ جسے آپ منی سکیرٹ کہہ سکتے ہیں۔ فراعنہ دور کی متعدد تصویریں جو ان کے مقبروں میں ہیں یا قاہرہ کے عجائب گھر میں اُن تمام میں محنت کش طبقہ چاہئے وہ کھیت میں ہل چلا رہا ہوتا یا کشتی رانی پر مامور ہوتا اُسے ایک مختصر لباس میں ہی دیکھا گیا ہے۔ قمیض اور جوتا کسی کو بھی پہنے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ مصر کا موسم گرم ہے۔ یوں اس لباس میں وہ زندہ رہتے تھے ورنہ سرد ملکوں میں ایسے لباس میں زندہ رہنا مشکل ہوتا ہے۔ رات کے وقت رضائی اور کمبل کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ بعض اوقات چادر کا استعمال ہوتا تھا۔ سر پر بال تھے لیکن زیادہ لمبے نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ باقاعدگی سے بال کٹواتے تھے۔ یا اُن کے بال بڑھتے ہی نہیں تھے۔

رہن سہن

فراعنہ دور کے مقبروں اور اُن میں ملنے والی اشیاء کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مصریوں کے گھر ایک ہی کمرے پر مشتمل ہوتے تھے۔ جو زیادہ تر کچی مٹی سے تیار کیے جاتے تھے۔ کچھ لوگ خیموں میں بھی رہتے تھے۔ ایسے لوگ آبادی سے دور صحرا میں رہتے تھے۔ مصر کے صحرا میں رہنے والے بدو آج بھی خیموں میں اُسی طرز کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اکثریت زمین پر سوتی تھی۔ بیٹھنے کیلئے پیڑھے یعنی سٹول استعمال کیے جاتے تھے۔ لکڑی سے تیار کردہ یہ پیڑھے امیر اور غریب بلکہ شاہی خاندان کے لوگ بھی استعمال کرتے تھے۔ شاہی خاندان اور امرا پلنگ پر سوتے تھے بلکہ اگلے جہاں میں استعمال کیلئے پلنگ مزار میں بھی رکھوائے جاتے تھے۔

کھانا پکانے کیلئے چولہے استعمال ہوتے۔ ہانڈی، تھالیاں، پیالے، چمچ سب کچھ مٹی کا ہوتا تھا۔ آج بھی مقبوضہ کشمیر کے دور دراز علاقوں میں مٹی کی رکابی اور پیالے استعمال ہوتے ہیں۔ دنیا کے بیشتر غریب مسلم ممالک میں مسجدوں میں وضو کیلئے مٹی کے کوزے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ایسے کوزے ہزاروں سال پہلے دور فراعنہ میں استعمال ہوتے تھے۔ زیورات بھی

صراحی نما مٹی کے برتنوں میں محفوظ رکھے جاتے تھے۔ غلہ بھی مٹی سے تیار کردہ سٹوریج ''گلوٹی'' نما ہوتے تھے۔ گھر میں فرنیچر برائے نام ہی ہوتا تھا۔

خوشی غمی میں سب مل جل کر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ فالتو وقت میں کھیل تماشے بھی ہوتے تھے۔ لوگ مختلف قسم کے کھیل کھیلتے۔ مچھلیاں پکڑنا، کشتی رانی اور تیراکی لوگوں کے محبوب مشغلے تھے۔ شاہی گھرانے کی خواتین بھی دریائے نیل میں تیراکی کرتی تھیں۔ بازاروں میں تماشے کرنے والے جادوگر بھی اپنے کرتب دکھاتے تھے۔ اور خوشی کے موقع پر گیت گائے جاتے تھے۔ جوار، مکئی کی روٹی کے ساتھ ساتھ لوگوں کی اکثریت شراب پیتی تھی۔ شراب کو فراعنہ دور میں ایک عام مشروب سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مرنے کے بعد بھی مقبروں میں شراب کے جام رکھے جاتے تھے۔

کسی کے فوت ہونے کی صورت میں چالیس دن کے بعد ایک جشن برپا ہوتا تھا۔ جس میں عزیز واقارب جمع ہوتے۔ کھانے پینے کے علاوہ گانے بجانے اور ناچ گانے کا اہتمام بھی ہوتا تھا۔ گانے زیادہ تر مرحوم یا مرحومہ کی صفت میں گائے جاتے تھے۔ بلکہ آج بھی یہ رسم مصر کے دیہات میں موجود ہے۔ ایسے میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ ممکن ہے چالیسویں کی رسم مصر سے برصغیر اور دنیا کے دیگر ممالک میں پہنچی ہو۔

خاندان کا سربراہ کنبے کی کفالت کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ جو بڑی محنت سے بچوں کی پرورش کرتا تھا۔ جوں ہی بچے چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتے تو آہستہ آہستہ گھریلو کام کاج میں بھی ہاتھ بٹانا شروع کر دیتے تھے۔ کسان کے ساتھ اُس کی بیوی اور بیٹا بھی کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ جبکہ ہنرمندوں کے بچے ماں باپ کے ساتھ خاندانی ہنر سیکھتے تھے۔ یعنی بڑھئی کا بیٹا لکڑی کا کام اور آرٹ یعنی لکھائی پڑھائی کرنے والے خاندان اپنی اولاد کو لکھنا پڑھنا سکھاتے تھے۔

لوگ سماجی لحاظ سے تین طبقوں میں تقسیم تھے۔ کسان جو ملک کی **75** فیصد آبادی پر مشتمل تھا کو معاشرے میں سب سے نچلے طبقہ کا فرد سمجھا جاتا تھا۔ جس کا کام دن رات محنت کر کے حکومت کو ٹیکس ادا کرنا ہوتا تھا۔ کھیتی باڑی کے علاوہ باغات لگانے اور اُن کی دیکھ بھال کے ساتھ شراب کشید کرنے کی ذمہ داری بھی ان کی تھی۔ کسان کے بیوی بچے بھی دن بھر کھیتوں

میں کام کرتے اور جب کھیتی باڑی سے فارغ ہوتے تو پھر فراعنہ کے مقبرے، مندر اور دوسری عبادت گاہیں تعمیر کرنے میں بحیثیت مزدور کام کرتے تھے۔ حکومتی اعلیٰ عہدہ داران اور ہنر مندوں کو معاشرے میں مڈل کلاس یعنی متوسط طبقہ میں شمار کیا جاتا تھا۔ جن کی بیگمات کوئی کام نہیں کرتی تھیں۔ اور بچے لکھائی پڑھائی یا ہنر سیکھتے تھے۔ سب سے اعلیٰ و ارفع شاہی خاندان، وُزراء، روساء ہوتے تھے۔ جو کسان کے ادا کیے ٹیکس پر عیاشیاں کرتے تھے۔ اس سے ملتا جلتا معاشرتی نظام آج بھی دنیا میں موجود ہے۔ صرف برصغیر میں دور فراعنہ کے نچلے طبقہ کے لوگوں کو متوسط اور متوسط طبقہ کو سب سے نچلے طبقہ میں رکھا گیا ہے۔ باقی اوپر کا طبقہ فراعنہ سے آج تک اُسی کروفر کے ساتھ حکومت کر رہا ہے۔

جوان لوگ شاہی فوج میں شامل ہو کر ملک کا دفاع کرنے کے ساتھ ساتھ ضرورت کے مطابق بیگار کے کام بھی سرانجام دیتے تھے۔ شاہی محلات، عبادت گاہیں اور اہرام کی تعمیر کے دوران مزدور کی حیثیت سے یہی لوگ کام کرتے تھے۔ ملک پر حملہ کی صورت میں پوری قوم سیسہ پلائی دیوار بن جاتی تھی۔ مصریوں کی اسی حب الوطنی کی بدولت فراعنہ تین ہزار سال تک مصر کے حکمران رہے۔

دور فراعنہ میں شاہی محلات اور عبادت گاہوں کے باہر بازار بھی تھے۔ جہاں سے لوگ روزمرہ کی ضروریات زندگی کی اشیاء خریدتے تھے۔ فراعنہ کے مقبروں میں اِن بازاروں کے مناظر بھی دکھائے گئے ہیں۔ ایک منظر میں دکاندار کوئی چیز ترازو پر تول کر گاہک کو دے رہا ہے۔ یہ ترازو بالکل ویسا ہی تھا جیسے آج بھی دنیا کے بیشتر دیہاتوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ جس میں دو پلڑے جنہیں رسیوں کے ساتھ ایک ڈنڈی کے ساتھ باندھا ہوا ہوتا ہے اور ڈنڈی کے درمیان میں ایک رسی ہوتی ہے جسے پکڑ کر اٹھانے سے دونوں پلڑوں کا برابر یا کمی بیشی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ترازو کے استعمال سے پتہ چلتا ہے کہ وہ پورا تولتے تھے یعنی اُس وقت ہیرا پھیری کا آغاز نہیں ہوا تھا۔

کھیتی باڑی

دنیا میں صنعتی انقلاب آنے سے قبل دنیا کی معیشت کا دارومدار زراعت پر تھا۔ جو

ملک زرعی لحاظ سے آسودہ حال ہوتا تھا اُسی کی بالادستی ہوتی تھی۔ مصر دریائے نیل کی وجہ سے زرعی ملک تھا۔ اس میں اس قدر غلہ پیدا ہوتا تھا کہ مصر کے اڑوس پڑوس کے ملک اور قبائل بھی غلہ مصر سے لیتے تھے۔ حتیٰ کہ فلسطین تک کی غذائی ضرورت مصر پوری کرتا تھا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے مصر غلہ لینے گئے تو اُن کی ملاقات اپنے بھائی حضرت یوسف علیہ السلام سے ہوئی تھی۔ فراعنہ کاشت کاروں کو فلاحین کے نام سے پکارتے تھے۔

مصر کی سیاحت کے دوران فراعنہ کے مقبروں کے اندر تحریروں اور قدرتی مناظر کو میں بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ سقارہ میں 2340 ق م یعنی آج سے چار ہزار سال پہلے تعمیر ہونے والا مری روکا کا مقبرہ ہے۔ یہ فراعنہ کا وزیر تھا۔ اس مقبرے میں ایک حصہ زراعت کے متعلقہ ہے۔ افسوس ہے ان تصویروں میں سے کچھ مٹ چکی ہیں لیکن جو نظر آتی ہیں اُن میں کچھ مناظر میں کسانوں کو ہل چلاتے دکھایا گیا ہے۔ دوسرے منظر میں فصلیں کاٹتے ہوئے، پھر گاہ ڈالنے یعنی کھلیان کا منظر ہے۔ اس منظر میں کٹی ہوئی فصل زمین پر ایک گول دائرے میں پڑی ہوئی ہے۔ جس کے اوپر کافی تعداد میں بیل چلتے نظر آرہے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ میرے بچپن میں میرے تایا جان خود اس طرح گاہ ڈالتے اور اوپر اسی طرح بیل چلایا کرتے تھے۔ ہم بھی خوشی خوشی تایا جان کے ساتھ گاہ میں بیلوں کے پیچھے پیچھے دوڑا کرتے تھے۔ ممکن ہے میری طرح اور لوگوں کو بھی دیہاتوں کے یہ منظر یاد آجائیں۔ یہ دیکھ کر میں کافی عرصہ سوچتا رہا کہ مشینی دور سے پہلے کاشت کاری کا جو نظام دنیا میں رائج تھا وہ ایک دوسرے سے ملتا جلتا ہزاروں سالوں سے اسی طرح چلتا رہا تھا۔ گاہ ڈالنے کے منظر کے ساتھ بھوسے اور غلے کو الگ الگ کرنے کے جو منظر تھے ہمارے بچپن میں وہ اسی طرح رائج تھے۔ بلکہ آج بھی اُسی طرح کام ہورہا ہے۔ جب کھلیان میں غلے کے ڈھیر لگتے تو کسان غلے کو ایک برتن نما پیمانے سے ناپتے تھے۔ جس کے بعد اُسے بڑے بڑے گوداموں میں محفوظ کردیا جاتا تھا۔ مقامی علاقہ کی ضرورت کا غلہ چھوڑ کر باقی کو کشتیوں کے ذریعے دارالحکومت پہنچایا جاتا تھا تاکہ دوسرے ضرورت مندوں کو دیا جاسکے۔

قاہرہ کے عجائب گھر میں دور فراعنہ میں کھیتی باڑی کے لئے جو اوزار استعمال کیے جاتے تھے انہیں بھی محفوظ کیا گیا ہے۔ ان میں ہل بھی موجود ہے۔ ہل کی وہی شکل وصورت ہے

جیسے آج بھی ہمارے ملک میں استعمال کیے جاتے ہیں۔اُس میں لوہے کا پھال بھی موجود ہے۔ ہل کے علاوہ پھاوڑا جس سے زمین کھودی جاتی ہے۔ بالکل اُسی طرح کے آج بھی استعمال میں ہیں۔ مری روکا کے مقبرے میں کھیتی باڑی، مال مویشی پالنے سے لیکر مچھلیاں پکڑنے تک کے جتنے بھی مناظر ہیں اُن میں وزیر مری روکا خود بھی نظر آتے ہیں۔جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ صاحب عوام کے قریب قریب رہتے تھے۔

شادی بیاہ

جب لڑکی کو پہلا حیض آتا تو اُسے جوان سمجھا جاتا اور اُس کی شادی کردی جاتی تھی۔ لڑکا جب بلوغت میں قدم رکھتا تو اُس وقت لڑکے کا ختنہ کر کے اس بات کا اعلان کیا جاتا تھا کہ اب لڑکا جوان ہوگیا ہے۔ یہ رسم اب بھی افریقہ کے بعض قبائل میں موجود ہے۔

دور فراعنہ میں شادی سے پہلے لڑکے اور لڑکیوں کے آزادنہ جنسی ملاپ کو بُرا نہیں سمجھا جاتا تھا۔لیکن شادی کے بعد ایک دوسرے کا وفادار ہونا ضروری تھا۔ اور یوں آزادنہ جنسی فعل کا خاتمہ ہو جاتا تھا۔ بالکل موجودہ یورپ اور امریکی معاشرے کی طرح جہاں لڑکے اور لڑکیوں کے آزادنہ جنسی فعل کو بالکل برا نہیں بلکہ اُسے معاشرے کا ایک اہم جز سمجھا جاتا ہے۔ افزائش نسل کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ لڑکے اور لڑکی کی پیدائش پر برابر خوشی منائی جاتی تھی۔ سب سے بڑا بیٹا یا بیٹی والدین کی آخری عمر میں دیکھ بھال اور اُن کے کفن دفن کے ذمہ دار ہوتے تھے۔

میاں بیوی کھل کر پیار و محبت کا اظہار کرتے تھے۔اسی پس منظر میں دور فراعنہ کی ایک نظم ہے:

تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے
میرا جسم جذبات سے بے قابو ہو رہا ہے
میرا دل جذبات کو اُبھار رہا ہے
چونکہ ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں

ایک اور نظم ہے

تم دوسری لڑکیوں سے ہزار گنا زیادہ حسین ہو
تم تو ایک طلوع ہوتے ستارے کی مانند ہو
دیکھنے کیلئے تمہاری خوبصورت آنکھیں ہیں
بوسے دینے کیلئے رس بھرے شیریں ہونٹ ہیں

خوبصورت آنکھوں اور رس بھرے ہونٹوں کے گیت گاتے خوشی خوشی جب لڑکی حاملہ ہو جاتی تو لڑکی کو کہا جاتا کہ وہ گندم یا جوار کے کھیتوں میں پیشاب کیا کرے۔ یوں اگر پودے جلد پھول اور پھل دینا شروع کریں تو سمجھا جاتا تھا کہ لڑکا پیدا ہوگا اور اگر زمین میں سے گھاس پھوس اُگے تو سمجھا جاتا تھا کہ لڑکی ہوگی اور اگر ان دونوں میں سے کوئی علامت ظاہر نہ ہوتی تو سمجھا جاتا کہ لڑکی ابھی حاملہ نہیں ہے۔

شادیوں کی اکثریت کامیاب ہوتی تھی۔ بدقسمتی سے اگر ناچاقی ہو جاتی تو پھر طلاق دینے اور طلاق کے بعد دوسری شادی کا میاں بیوی کو برابر کا حق تھا۔ لوگوں کی طبعی عمریں زیادہ سے زیادہ چالیس سال ہوتی تھیں۔ لیکن شاہی خاندان اور امراء اچھا کھاتے پیتے تھے اس لئے ان کی عمریں زیادہ ہوتی تھیں۔

فراعنہ کی شکار گاہ

فراعنہ کی پسندیدہ شکار گاہ فیوم تھی۔ فیوم ممفیس کے جنوب میں تقریباً تیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ جو ایک نخلستان ہے۔ جس میں پچیس میل لمبی اور پانچ میل چوڑی ایک جھیل ہے جو جھیل قارون کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں قریب ہی قارون کے محل کے کھنڈرات بھی ہیں۔ ممکن ہے یہ محل فراعنہ کے مشہور عالم کنجوس وزیر قارون کا ہی ہو۔ فراعنہ دور میں جھیل میں مگرمچھ تھے۔ جنہیں اُس زمانے کے لوگ مقدس مانتے بلکہ اُن کی پوجا بھی کرتے تھے۔ جھیل کے کنارے مگرمچھوں کی پوجا کے لئے ایک مندر بھی تھا۔ فراعنہ نے دریائے نیل سے یوسف نامی ایک نہر نکال کر فیوم کے علاقہ کو سیراب کرنے کے ساتھ ساتھ اسے جھیل قارون کے ساتھ ملا دیا تھا۔ یہ نہر اب بھی موجود ہے اور فیوم کا شہر اس کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ اس وقت یہ شہر صوبائی دارالحکومت ہے۔

فیوم میں نہری نظام کی بدولت یہ علاقہ سرسبز اور زرخیز ہے۔ دور فراعنہ سے آج تک یہ علاقہ مصر کو گندم، مکئی، گنا، کپاس، پھل اور رنگا رنگ پھول عطا کرتا ہے۔ جدید زرعی ٹیکنالوجی کے استعمال سے اس علاقہ میں سال میں تین فصلیں پیدا ہوتی ہیں۔ فیوم مغربی صحرا کا سب سے بڑا نخلستان ہے۔



فراعنہ کی دنیا

اہرام

ابوالہول

فراعنہ کی دنیا

قاہرہ میں سب سے پہلے فراعنہ کی دنیا کو دیکھنے کی آرزو تھی۔ لیکن ہمارے **ساتھی** یعقوب آزاد نے فتویٰ دیا کہ: ''پہلے قاہرہ میں موجود اسلامی تاریخی **مقامات کو دیکھیں گئے پھر** غیر اسلامی کام کریں گئے''۔ اسلام کا نام سن کر ہم نے منقار زیر پر کرلی۔ منیر **حسین** نے تھوڑی کھسر پھسر کی لیکن وہ بھی جلد خاموش ہوگئے۔ **چونکہ یہاں ''حکم حاکم مرگ مفاجات''** والی بات تھی۔ اس طرح پہلے دن ہم نے قاہرہ کی **سیر کی اور دوسرے** دن **فراعنہ** کی دنیا دیکھنے اور عبرت پکڑنے گھر سے نکلے۔ اہرام قاہرہ کے پہلو میں **گیزہ** نامی شاہی قبرستان میں واقع ہیں۔ یہ قبرستان دو ہزار مربع میٹر کے علاقہ میں پھیلا ہوا ہے۔

اہرام دیکھنے کے شوق میں ہم معمول سے پہلے بیدار ہوئے۔ ڈرائیور بھی گاڑی لیکر صبح آٹھ بجے آ گیا۔ ناشتہ کے بعد ہم گھر سے روانہ ہوئے۔ قاہرہ شہر کے اردگرد رِنگ روڈ ہے۔ جو شہر کے چاروں طرف گھومتی رہتی ہے۔ ہم اسی روڈ پر سفر کر رہے تھے کہ صبح کے دھندلے موسم میں دور سے اہرام نظر آئے۔ عجائبات عالم کو پہلی بار دیکھا تو دل بلیوں اچھلنے لگا۔ دلی کیفیت سے منیر حسین کو آگاہ کیا تو اُن کی بھی میرے جیسی حالت تھی۔ بلکہ اُن کا تو چہرہ بھی خوشی سے تمتما رہا تھا۔ گاڑی رِنگ روڈ سے اُس سڑک پر ڈال دی گئی جو اہرام کی طرف جاتی تھی۔ سائین بورڈ پر لکھا تھا اہرام تین کلو میٹر۔ ہم ایک نہر کے کنارے کنارے سفر کر رہے تھے۔ جس کے دونوں طرف گنجان آبادی تھی۔ سڑک ایک ٹریفک لائٹ پر جا کر ختم ہوئی تو گاڑی کو بائیں طرف

شاہرہ اہرام پر موڑ لیا۔ کچھ فاصلے کے بعد دوبارہ بائیں مڑ کر تھوڑی چڑھائی کے بعد گاڑی ایک گیٹ پر رک گئی۔ یہ ٹکٹ آفس تھا۔ اہرام کے علاقہ میں داخل ہونے کیلئے ٹکٹ خریدنے پڑتے ہیں۔ میں نے 35 مصری پونڈ ادا کر کے ٹکٹ خریدا۔

اہرام

اہرام کے علاقہ میں داخل ہوا تو مجھے انتہائی مایوسی ہوئی۔ میں سوچنے لگا کیا یہ وہی اہرام ہیں جن کا دنیا بھر میں چرچا ہے۔ چاروں طرف دور دور کھنڈرات جن کے درمیان اہرام خاموش کھڑے نظر آئے۔ بالکل ایسے جیسے کوئی بزرگ اپنے ہم عصر کھونے کے بعد گھر کے صحن میں چپ چاپ کھڑا کسی گہری سوچ میں گم ہو۔ ہوسکتا ہے کہ اسی بزرگی کی بدولت اہل عرب انہیں ''اہرام''یعنی بزرگ کہہ کر پکارتے ہیں۔

مصر آنے سے قبل میں سوچا کرتا تھا کہ اہرام صحرا کے بیچ کسی ویرانے میں ہونگے۔ لیکن یہاں تو مجھے قاہرہ شہر کی آبادی اہرام کے پہلو تک نظر آرہی تھی۔ مجھے یہ تجاوزات بالکل اچھی نہ لگیں۔ ویسے تجاوزات کہیں بھی ہوں وہ اچھی نہیں ہوتیں۔ انہیں دیکھا تو اپنا وطن یاد آنے لگا۔ جہاں ''قبضہ گروپ'' نے اس قدر تجاوزات کیں کہ زندہ سلامت خود چل کر قبرستانوں میں پہنچے اور وہاں قبضے کرلیے۔ ہمارے حکمران عوام دوست ہیں اس لئے دوستی کے ناطے وہ تجاوزات پر آنکھیں بند کرلیتے ہیں۔ ایسے میں عدلیہ بھی بے بس ہے۔ سنا ہے فراعنہ بھی زندگی میں قبرستانوں پر قبضہ کر کے اپنے مقبرے تعمیر کروایا کرتے تھے۔ آج فرعون تو نہیں رہے لیکن اُن کے پیروکار کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔

اہرام کی خوبصورتی اسی میں تھی کہ اسے دورِ قدیمہ کے ماحول میں رکھا جاتا۔ میں جوں جوں اہرام کی طرف بڑھتا گیا توں توں مجھ پر اہرام کی عظمت ظاہر ہوتی گئی۔ اُس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ انسان جب اہرام کے قریب جاتا ہے اُس کی ہیبت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ اہرام کے احاطے میں کھڑے ہو کر دیکھا تو مجھے ایک طرف دور دور تک صحرا ہی نظر آیا۔ یعنی میرا تصوراتی علاقہ۔ اگرچہ دوسری طرف شہر کی آبادی پہنچ چکی ہے۔ لیکن جہاں تک آبادی ہے وہاں سے اہرام تک پہنچنے کیلئے ایک چھوٹی سی پہاڑی چڑھ کر اوپر جانا پڑتا ہے۔ یوں اہرام شہر کے قریب

بھی ہیں اور اونچائی کی وجہ سے دور بھی۔ حقیقت میں یہ علاقہ فراعنہ کا شاہی قبرستان تھا۔ جہاں بادشاہوں، شاہی خاندان کے دوسرے افراد، مذہبی لیڈروں، وزرا، روساء اور شاہی عہدہ داروں کے چھوٹے چھوٹے اہرام تھے۔

ہم صبح نو بجے گیزہ پہنچے تو دیکھا سیاح جوق در جوق آ رہے ہیں۔ اکثریت یورپی اور امریکی تھی۔ اہرام کے اطراف میں بہت ہی کھلی جگہ ہے۔ جہاں ارد گرد کھنڈرات بکھرے ہوئے یاد ماضی دلاتے تھے۔ اُن کھنڈرات میں ماہرین آثار قدیمہ اور کچھ سیاح ایک ایک پتھر کو غور اور تحقیقی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ایک طرف کھدائی کا کام جاری تھا۔

فراعنہ کے مزار

مجھے اہرام کو اندر سے دیکھنے کا شوق تھا۔ یہ شوق مصر جانے سے پہلے میرے دل میں موج زن تھا۔ اسی شوق کی خاطر میرا منیر حسین سے ایک خفیہ معاہدہ ہوا تھا کہ یعقوب آزاد اندر جائیں یا نہ جائیں ہم دونوں ضرور چلیں گئے۔ منیر حسین کے سہارے میں نے فیصلہ کیا کہ پہلے اہرام کے اندر کی سیر کریں اور پھر باہر کی۔ اندر جانے کا ٹکٹ ایک سو مصری پونڈ تھا۔ ہم نے ٹکٹ خریدے۔ اور اہرام کے قریب چلے گئے۔ قریب سے اہرام کو دیکھا تو مجھے سخت حیرت ہوئی۔ اہرام کا ہر پتھر جسامت میں انتہائی بڑا تھا۔ جنہیں کاریگروں نے انتہائی نفاست کے ساتھ کاٹ کر انتہائی خوبصورت بنایا ہوا تھا۔ ہر پتھر جسامت میں دوسرے سے ملتا جلتا تھا۔ کسی بھی پتھر کا وزن ڈھائی ٹن یعنی ستر من سے کم نہیں تھا۔ بعض پتھروں کا وزن دس دس ٹن بھی تھا۔ میں اہرام کی مشرقی دیوار کے ساتھ کھڑا ہوا تو ایک ایک پتھر میرے کندھوں کے قریب تھا۔ پتھر پانچ فٹ سے کسی بھی صورت کم نہیں تھے۔ جب اہرام کی چوڑائی کا جائزہ لیا تو وہ میرے تصور سے بھی زیادہ تھا۔ پتھروں کا جائزہ لیا تو وہ انتہائی سخت تھے۔ اُن میں چونے کی آمیزش تھی۔ اہرام کی اونچائی کا جائزہ لینے اوپر کی طرف دیکھا تو سر پر رکھا ہیٹ گر گیا۔ ہیٹ اٹھایا اور اہرام کی دیوار پر خوبصورتی سے پیوست پتھروں پر چڑھتے ہوئے جب 56 فٹ کی بلندی تک پہنچا تو وہاں اہرام کے اندر جانے کیلئے بالکونی بنی ہوئی تھی۔ جہاں شائقین قطار میں کھڑے تھے۔ ہم بھی قطار میں کھڑے ہو گئے۔ آگے یعقوب آزاد اور میرے پیچھے منیر حسین تھے۔ جبکہ محمد بکاری اور ھمام

نے پہلے ہی اندر جانے سے انکار کر دیا تھا۔

اہرام کے اندر جانے سے قبل سیکورٹی احکام نے ہماری جامعہ تلاشی لی۔ ہمارے دستی بیگ اور کیمرے اپنی تحویل میں رکھ لیے تا کہ ہم اندر چوری چھپے فوٹو گرافی نہ کرتے رہیں۔ اہرام کے اندر تصویریں بنانا ممنوع ہے۔ ایک تنگ اور تاریک راستہ سے اہرام کے اندر داخل ہوئے تو جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ جس راستہ کا آج انتخاب کیا ہے۔ اسے سر کرنا اتنا آسان نہیں ہو گا۔ ساڑھے تین فٹ چوڑا اور چار فٹ اونچا یہ ایک سرنگ نما راستہ تھا۔ جس میں سر اونچا کر کے چلنا ہرگز ممکن نہیں تھا۔ ہم سر جھکائے اس حالت میں اندر داخل ہوئے جس طرح لوگ فراعنہ کے دربار میں حاضر ہوتے تھے۔ ممکن ہے کاریگر جب یہ راستہ بنا رہے تھے تب اُن کے ذہن میں یہ بات موجود ہوئی ہو گی کہ کل اگر کوئی اہرام میں داخل ہو تو وہ اکڑنے کی بجائے جھک کر آئے۔ چونکہ یہی آداب شاہی ہیں۔

میں سر جھکائے چلتا رہا۔ اب یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ہم اوپر کی بجائے آہستہ آہستہ نیچے کی طرف جا رہے ہیں۔ گائیڈ نے بتایا کہ یہ تنگ و تاریک راستہ 32 گز ایک فٹ لمبا ہے۔ جب میں قدرے کھلی جگہ پہنچا تو اوپر کی طرف دیکھ کر گھبرایا۔ یہ جگہ اندھیری غار کی مانند نظر آئی۔ جس کا دھانا انتہائی تنگ اور تاریک تھا۔ اس کی چوڑائی 1.5 میٹر اور اونچائی 1.6 میٹر تھی۔ دیوار میں ڈرل کر کے لوہے کے بریکٹ لگا کر اوپر لکڑی کے تختے بچھا کر ایک مختصر سا راستہ بنایا گیا تھا۔ دائیں طرف دیوار اور بائیں طرف لکڑی کی حفاظتی ریل لگی ہوئی تھی۔ جس کے سہارے لوگ چل رہے تھے۔ یہ راستہ سیدھا نہیں بلکہ عمودی طور پر 45 زاویہ کے مطابق اوپر جا رہا تھا۔ اس تنگ و تاریک اور مشکل سفر کے آغاز میں ہی منیر حسین نے اندر جانے کا ارداہ ترک کر کے واپس چلے گئے۔ میں نے بھی واپسی کا سوچا لیکن پھر خیال آیا میں یہ چیزیں اپنے لئے نہیں بلکہ اپنے قارئین کیلئے بھی دیکھ رہا ہوں۔ اگر اپنی ذات تک بات محدود ہوتی تو میں بھی منیر حسین کی سنت پر عمل کرتا۔

اہرام ایک تنگ و تاریک قبر ہے۔ لیکن یہ قبر عام آدمی کی نہیں بلکہ فرعون خوفو کی تھی۔ جس کیلئے ہمیں 344 فٹ اسی قبر سے گزر کر اوپر اُس مقام تک پہنچنا تھا جہاں فرعون کی لاش رکھی گئی تھی۔ تنگ تاریک راستے میں آکسیجن کی کمی کی وجہ سے میری سانس گھٹنے لگی۔ پیاس نے سخت

ستایا۔ گلا اس قدر خشک کہ بات کرنی مشکل تھی۔ آگے آگے یعقوب آزاد جا رہے تھے۔ جنہوں نے پیچھے مڑ کر کہا: ''نظامی صاحب فرعون کی قبر میں اگر ہم مر گئے تو ہماری کوئی فاتحہ بھی نہیں پڑھے گا۔'' میں نے ہاں میں مختصر جواب دیا چونکہ اس وقت مجھے اپنی فاتحہ کی نہیں بلکہ یہ فکر تھی کہ کسی حادثہ کی صورت میں میری میت کیسے باہر نکالی جائے گی۔ ہماری طرح بہت سے گورے اور گوریاں بھی حکومت مصر کو کوس رہیں تھیں جنہوں نے اندر جانے سے قبل مکمل معلومات نہیں دیں۔ اگر ہم اس خطرہ سے آگاہ ہوتے تو ممکن ہے اندر نہ جاتے۔ لیکن یوں محسوس ہوتا تھا جیسے مصری حکومت دولت کمانے کے چکر میں ہے۔ اگر وہ یہ راز افشاں کر دیں تو ممکن ہے بہت سے لوگ اندر کا رخ نہ کریں۔ جس کا نتیجہ آمدن میں کمی ہے۔

واپسی کا راستہ بھی یہی تھا۔ چنانچہ وقفہ وقفہ پر رک کر ہمیں واپس لوٹنے والوں کو راستہ دینا پڑتا تھا۔ اسی قبر نما سرنگ میں سے اوپر چڑھتے چڑھتے جب 124 فٹ سفر طے کیا تو ہم قدرے کھلی جگہ پہنچے۔ یہ گرانڈ گیلری کہلاتی ہے۔ یہاں سے دو راستے جدا ہوتے ہیں۔ اگر افقی سفر کرتے تو ملکہ کے چیمبر میں پہنچ جاتے لیکن ہمیں ملکہ سے کیا لینا تھا۔ ہمیں فرعون سے ملاقات کرنی تھی۔ گرانڈ گیلری ہموار نہیں بلکہ 45 زاویہ پر ترچھی سیڑھیوں یا زینے کی طرح تھی۔ یہ گیلری نما راستہ سیدھا اوپر کوئی 153 فٹ جاتا تھا۔ جس کی چوڑائی سات فٹ اور اونچائی 28 فٹ تھی۔ گیلری کے بیچ میں لکڑیاں بچھا کر اوپر پٹیاں لگی ہوئی تھی۔ جن پر پاؤں رکھ کر لوگ اوپر چڑھتے تھے۔ ہم سر اونچا کر کے دائیں بائیں لگی لکڑی کی ریلوں کے سہارے پوری جسمانی قوت سے چڑھتے جا رہے تھے۔ مدھم سی روشنی بھی تھی۔ یہ راستہ اہرام کے عین درمیان میں نہیں بلکہ درمیان سے 24 فٹ مشرق کی طرف تھا۔ ان راستوں کے علاوہ اندر بڑے بڑے پہاڑ نما پتھر نصب تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ پورے کا پورا اہرام ٹھوس پتھروں کا ایک مخروطی پہاڑ ہے۔

آخر ہم منزل مقصود پر پہنچے۔ تو دیکھا ایک مصری بوڑھا لمبا روایتی چوغا پہنے سیاحوں کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ تین فٹ چوڑی ایک اور سرنگ میں سے سر جھکائے گزر کر ہم ایک کمرے میں پہنچے۔ یہی کنگ چیمبر یعنی بادشاہ کا کمرہ تھا۔ یہ کمرہ 17 فٹ چوڑا 34 فٹ لمبا اور 19 فٹ اونچا تھا۔ چھت پر نصب ایک ایک پتھر چالیس سے ساٹھ ٹن یعنی تقریباً سولہ سو من سے کم نہیں

تھا۔ یہی وہ کمرہ تھا جہاں خوفو بادشاہ کی حنوط شدہ لاش رکھی گئی تھی۔ کمرے کے ایک طرف میت رکھنے کیلئے جگہ تھی۔ جو پتھر سے تعمیر کردہ ایک ٹب کی مانند تھی۔ بلکہ اگر اُسے ٹب کی بجائے پتھر کی قبر کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ میں نے جھانک کر اندر دیکھا تو وہ خالی تھی۔ نہ اندر فرعون تھا۔ اور نہ اُس کے خزینہ۔ گائیڈ نے بتایا کہ ہزاروں سال کی جدوجہد کے بعد جب سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کی جستجو کرنے والے یورپی یہاں پہنچے تو انہیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ یہ کمرہ بالکل خالی تھا۔ اس مقام تک چوروں کا پہنچنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ چونکہ یہاں تک پہنچنے کیلئے کوئی بھی دروازہ نہیں۔ بلکہ آج کے جدید ترین دور میں بھی مزید کسی خفیہ راستے کا پتہ نہیں چلایا جاسکا۔

کنگ چیمبر کے اندر کوئی خاص بات نہیں تھی بس ایک عام سا قبر نما کمرہ تھا۔ جس میں نہ کوئی کھڑکی تھی نہ روشندان۔ اندرونی دیواریں بہت ہی ملائم تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دیواریں چونے سے پلستر کردی گئی تھیں۔ تاکہ دیواریں ہموار اور ملائم ہوجائیں۔ فراعنہ کے خالی تابوت کو دیکھ کر میں نے یہی سبق سیکھا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو مال و دولت سے نوازہ ہے تو اُسے دنیا میں خرچ کردینا ہی عقل مندی ہے۔ چونکہ فراعنہ کے ساتھ دفن خزانے اُن کے کسی کام نہ آسکے۔

مصری گائیڈ نے فرش پر ایک جگہ زور زور سے پاؤں مارے اور بتایا کہ یہاں سے عین نیچے ملکہ کا چیمبر ہے۔ جہاں خوفو بادشاہ کی ملکہ کا تابوت تھا۔ اس مقام سے اہرام کی چوٹی 95 میٹر یعنی 290 فٹ ہے۔ لیکن اوپر کوئی راستہ نہیں جاتا۔ اسی کنگ چیمبر میں فرانس کے حکمران نپولین نے اکیلے رات بسر کی تھی۔ وہ رات نپولین نے کس حالت میں گزاری اُس کا ذکر اُس نے کبھی کسی سے نہیں کیا تھا۔

ہم کچھ عرصہ یہاں رہے۔ اِدھر اُدھر گھوم پھر کر دیکھتے رہے۔ سچ یہ ہے کہ مجھے اپنے حواس پر زیادہ قابو بھی نہیں تھا۔ بس یہی فکر تھی کہ اس قبر سے باہر کیسے نکلوں گا۔ جلدی جلدی کمرے کو دیکھا اور باہر نکلنے کی راہ لی۔ اوپر جاتے وقت میں سوچ رہا تھا کہ واپسی آسان رہے گی۔ لیکن میرے ساتھ تو معاملہ اونٹ والا ہوا۔ جس کیلئے چڑھائی اور اترائی دونوں تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ جب میں اُترنے لگا تو لمبے قد نے مجبور کیا۔ راستہ تنگ اور تاریک تو تھا ہی لیکن اتنی

جگہ تھی کہ انسان صرف بیٹھ کر ہی نیچے اُتر سکتا تھا۔ اوپر چڑھتے وقت تو میں سر نیچے کیے بازو اور ٹانگوں کے زور پر اوپر چڑھ گیا لیکن نیچے اُترتے وقت مشکل تھی۔ میں نیم دراز ہو کر لڑکھڑاتے ہوئے آہستہ آہستہ نیچے اُترنے لگا۔ راستہ میں جگہ جگہ پریشان حال بوڑھے انگریز اور میمیں دیکھیں جن کے اوپر جانے کے ارادے تھے۔ لیکن راستے میں بیٹھے اس سوچ میں تھے کہ اب کیا کیا جائے۔ ہم نے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرنے کی کوشش کی لیکن جب انہوں نے ہمارے بھی حواس اڑے ہوئے دیکھے تو انہیں ہماری حوصلہ افزائی پر شک ہوا۔

خدا خدا کر کے ہم فرعون کی قبر سے باہر نکلے۔ یعقوب آزاد نے میرا منہ خانہ کعبہ کی طرف کروا کر توبہ کروائی کہ آئندہ میں کبھی بھی ایسی حرکت نہیں کروں گا۔ ابھی میں توبہ کے عمل سے گزر رہا تھا کہ ایک امریکی دوشیزہ نے آن گھیرا۔ یہ محترمہ ڈر کے مارے اندر تو نہ جا سکی لیکن اندر کی خبریں معلوم کرنے کیلئے بے تاب تھی۔ میں نے سینہ تان کر اُسے کچھ اس طرح کے من گھڑت قصے سنائے جس طرح جارج بش مسلمانوں کے خلاف ہر روز نئے نئے قصے کہانیاں گھڑ کر بڑی ڈھٹائی کے ساتھ پیش کرتا رہتا ہے۔ اُس امریکی دوشیزہ کو جب میں اپنی خود ساختہ اہرام کی اندرونی کہانی سنا رہا تھا تو وہ بڑی غور سے میری باتیں سن کر بڑی حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اور میری باتوں کو بالکل اُسی طرح سچ مان رہی تھی جس طرح امریکی قوم اپنے صدر بش کی باتوں کو سچ مانتی ہے۔

مصر جانے سے قبل برطانیہ میں سیاحت کا پروگرام بنا رہا تھا تو ہمارے ساتھ کام کرنے والے ایک گورے نے از راہ مزاق کہا کہ: ''خوفو کے اہرام کے پاس جاتے ہوئے احتیاط کرنا۔ چونکہ اس اہرام کے زیر سایا بڑے سے بڑا ''وارداتیاں'' بھی سچ بولنا شروع کر دیتا ہے۔'' جب میں مصر گیا اور خوفو کے اہرام کے زیر سائے امریکی دوشیزہ کے ساتھ محو گفتگو تھا۔ تب ہمارے ایک ساتھی زیر لب توبہ توبہ کا ورد کرتے ہوئے وقفہ وقفہ سے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے کچھ کہہ رہے تھے۔ میں نے انہیں غور سے دیکھا تو وہ پسینے سے شرابور اپنی جوانی سے لیکر آج تک کی تمام کوتاہیوں اور خامیوں کا ہمارے سامنے کھل کر اقرار کر رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر بکاری نے بھی اپنے حسب نسب سے لیکر جوانی کی ندیا میں جب تیز پانی بہتا تھا اُس دور کے قصے سنانے شروع کر دیئے۔ مجھ تعجب ہوا۔ چونکہ یہ وقت اپنے قصے اور یاد ماضی کیلئے مناسب نہیں تھا۔ بلکہ

مقام عبرت تھا۔ ساتھیوں کی حالت دیکھ کر میں یہی سمجھا کہ ممکن ہے یہ کیفیت فرعون خوفو کے خوف کا نتیجہ ہو۔

جب اہرام تیار ہو جاتے تو میت رکھ کر تمام دروازے کچھ اس طرح بند کیے گئے تھے کہ باہر سے پتہ نہیں چلتا تھا کہ اندر جانے کا راستہ کون سا ہے۔ یہ تدابیر چوروں سے بچنے کیلئے کی جاتی تھیں۔ مغرب نے خلیفہ ہارون رشید کو بدنام کرنے کی خاطر یہ بات پھیلا دی تھی کہ ہارون رشید نے اپنی فوج کو حکم دیا تھا کہ اہرام کے اندر فراعنہ کی دولت نکالنے کا بندوبست کریں۔ چنانچہ خلیفہ کی فوج آئی اور انہوں نے اہرام کی دیواروں پر بڑے زور زور سے پتھر برسائے جس سے ایک پتھر اپنی جگہ سے سرک گیا۔ یوں انہیں اندر جانے کا ایک راستہ ملا۔ لیکن بعض مفکرین کی رائے ہے کہ جب فرانسیسی مصر آئے تو اُن کے فوجی اہرام اور ابوالہول پر گولہ باری کرتے رہے۔ تاکہ اندر جانے کا راستہ مل سکے۔ جب یہ لوگ اندر گئے تو یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ اہرام کے اندر نہ کوئی میت تھی اور نہ خزانہ۔

خوفو فراعنہ مصر کے چوتھے خاندان کا سربراہ تھا۔ جس کا اہرام 13 ایکڑ رقبہ پر تعمیر ہوا تھا۔ اس کی بلندی 481 فٹ اور چوڑائی 744 فٹ ہے۔ دیواریں سیدھی اوپر نہیں بلکہ ترچھی 52 زاویہ کے مطابق ہیں۔ ماہرین اہرام کہتے ہیں کہ خوفو کے اہرام کی تعمیر میں 23 لاکھ پتھر نصب ہیں۔ کوئی بھی پتھر ساٹھ من سے کم نہیں یوں اس اہرام کا کل وزن 68 لاکھ چالیس ہزار ٹن بنتا ہے۔ دور جدید کے ماہرین کے خیال میں تیس ہزار کے لگ بھگ مزدور کام کرتے تھے۔ کام مختلف ماہرین کی نگرانی میں مختلف ٹیم کی شکل میں انجام پاتا رہا۔ مثال کے طور پر سنگ تراشوں کے مختلف گروپ تھے۔ کانوں سے پتھر کھینچ کر اہرام تک پہنچانے والے لوگ مختلف گروپس میں کام کرتے تھے۔ تعمیر کرنے والے کاریگروں کے مختلف گروپ تھے اور پورے پروجیکٹ کا انچارج ایک اعلیٰ عہدہ دار ماہر تعمیرات ہوتا تھا۔ بادشاہ اور شہزادے بھی وقتاً فوقتاً کام کی رفتار دیکھنے آتے تھے۔

ہم گھوم پھر کر اہرام کی بیرونی ساخت کو دیکھ رہے تھے کہ شتربانوں نے آن گھیرا۔ منیر حسین کو ایک شتربان نے اونٹ پر بیٹھا لیا۔ اُس سے جان چھڑائی تو گائیڈ ہمارے پیچھے پڑ گئے کہ ہمیں خدمت کا موقع دیں۔ جب اُنہیں پتہ چلا کہ ہم اُن کے جال میں پھنسنے والے نہیں تو

ایک گائیڈ نے ہمیں مفت میں مشورہ دیا کہ اگر آپ اس مقام پر کھڑے ہو کر ہاتھ اوپر اٹھا کر کچھ اس انداز میں رکھیں جیسے آپ کسی کے سر پر دست شفقت رکھتے ہیں۔ تو فوٹو میں یوں نظر آئے گا جیسے اہرام آپ کی ہتھیلی کے نیچے ہے۔ منیر حسین نے ہمارے فوٹو لیے لیکن اہرام کو فوٹو میں صرف میں ہی قابو کر سکا۔ اپنے لمبے قد کی بدولت۔ یوں لمبے قد نے جو اہرام کے اندر میرا پسینہ نکلوایا تھا اُس کے صلے میں مجھے اہرام کو اپنی مٹھی میں بند کرنے کا موقع مل گیا۔

خوفو کے اہرام کے جانب شمال قاہرہ کی طرف مجھے بہت سے کھنڈرات نظر آئے۔ یہ بھی شاہی خاندان کے مزار تھے۔ ہم ان کھنڈرات میں گھومنے کے بعد خوفو کے بیٹے کافری کے اہرام کی طرف گئے۔ جو درمیان میں واقع ہے۔ اسے دیکھا تو مجھے یہ دوسرے اہرام سے بلند نظر آیا۔ لیکن غور کرنے پر پتہ چلا کہ یہ دوسرے سے چھوٹا ہے۔ چونکہ جس جگہ یہ تعمیر ہوا وہ جگہ دوسرے کی نسبت اونچی ہے۔ کافری کے اہرام کے باہر ایک میلہ سا تھا۔ سیاح اِدھر اُدھر گھوم پھر کر ان عجائبات کو دیکھ رہے تھے۔ گائیڈ ،شتر بان اور گھوڑے بان سیاحوں کو اپنے جال میں پھنسانے کی تگ ودو میں تھے۔ بہت سے بچے ہاتھوں میں اہرام کے مجسمے اٹھائے سیاحوں کو فروخت کرنے کی کوشش میں تھے۔

منیر حسین اہرام کے ہر زاویے سے فوٹو تیار کر رہے تھے۔ ہمام نے مشورہ دیا کہ اگر ہم اہرام کے اُس طرف چلیں جدھر صحرا ہے۔ تو وہاں سے تینوں اہرام ایک قطار میں نظر آئیں گئے۔ ہم نے ہمام کے مشورے پر عمل کیا۔ گاڑی میں بیٹھے اور اُس مقام پر جا پہنچے جہاں سیاح کھڑے فوٹو بنوا رہے تھے۔ یہ قدرے اونچی جگہ تھی۔ میں نے اس اونچے ٹیلے سے صحرا کے درمیان تینوں اہرام کو ایک قطار میں دیکھا تو علامہ اقبال کے یہ اشعار یاد آنے لگے جنہیں اس سے قبل میں کئی بار پڑھ چکا تھا۔ لیکن اِن کے حقیقی معنی مجھے آج ہی سمجھ آ رہے تھے۔

اس دشت جگر تاب کی خاموش فضا میں
فطرت نے فقط ریت کے ٹیلے کیے تعمیر
اہرام کی عظمت سے نگوں سار ہیں افلاک
کس ہاتھ نے کھینچی ابدیت کی یہ تصویر

ٹیلے پر شتربان کافی تعداد میں موجود تھے۔ جو اس انتظار میں تھے کہ کوئی سیاح

اشارے کرے اور وہ انہیں اونٹ پر بیٹھا کر پیسے کمائیں۔ بکاری نے ایک شتربان سے سودا کیا۔ لیکن یہ اونٹ مریل قسم کا تھا۔ سب نے اُس پر بیٹھ کر فوٹو بنوانے سے انکار کر دیا۔ شتربان دوڑ کر اپنے ایک دوست کا موٹا تازہ اونٹ لے آیا۔ جس پر بیٹھ کر ہم نے اہرام کے پس منظر میں فوٹو بنوائے۔ فوٹو بنوانے کے بعد یعقوب آزاد نے نماز ظہر پڑھنے کا ارادہ کیا تو معلوم ہوا کہ تمام شتربان نمازی ہیں۔ جنہوں نے پلاسٹک کے بیگوں میں وضو کیلئے پانی بھی رکھا ہوا تھا۔ آزاد صاحب نے شتربانوں کے ساتھ فراعنہ کے اہرام کے سائے میں باجماعت نماز ادا کی۔

سٹال لگا کر یا گھوم پھر کر چیزیں فروخت کرنے والے ہوں یا پھر گائیڈ یا شتربان تمام سیاحوں کو پھنسانے کے مختلف طریقے استعمال کرتے ہیں۔ ایک طریقہ بھائی چارہ پیدا کرنے کا ہے۔ ہمارا گندمی رنگ دیکھ کر اکثر ہم سے پوچھتے کہ: ''آپ ہندی ہیں'' اس پر ہم بڑے تاؤ کھاتے اور غصہ میں جواب دیتے نہیں۔ ''ہمارا تعلق اُس مسلمان ملک سے ہے۔ جو ایٹمی طاقت ہے۔'' جس پر وہ خوش ہو کر کہتے تو آپ ہمارے پاکستانی بھائی ہیں۔ آپ ہمارے بھائی ہیں۔ الحمدللہ آپ مسلمان ہیں اور یوں بھائی چارے کی فضا قائم کر کے ہمیں اپنی چیزیں فروخت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ہم جہاں بھی گئے مصری ہمیں ہندی سمجھتے رہے۔ ہر جگہ اس کی وضاحت کرتے کرتے تھک جاتے کہ ہم ہندی نہیں پاکستانی ہیں۔ بار بار ہندی کے تکرار پر میں نے سوچنا شروع کیا کہ ایسا کیوں ہے؟ کیا یہ لوگ جاہل ہیں یا پھر ہمارے ملک کی خارجی پالیسی اور سفارت خانے اپنے ملک کو یہاں متعارف کروانے میں ناکام رہے۔ میں مختلف پہلو پر غور کرتا رہا لیکن جس چیز نے مجھے قائل کیا وہ تھا۔ میڈیا کا کردار۔ ہندوستان کو مشرق وسطیٰ میں متعارف کروانے والی ہندوستان کی فلم انڈسٹری ہے۔

ہندوستانی فلمیں ان تمام ممالک میں بڑی دلچسپی سے دیکھی جاتی ہیں۔ عام لوگوں میں امیتابھ بچن، دلیپ کمار، ششی کپور جیسے فلم سٹار بہت مقبول ہیں۔ ہماری پاکستانی فلم انڈسٹری تو ابھی تک پنجاب کے روایتی ''گنڈاسا کلچر'' اور ہرے بھرے کھیتوں میں صحت مند ہیرائین کے ناچ گانے سے نہیں نکلی۔

تعمیر اہرام کی کہانیاں

اہرام کس طرح تعمیر ہوئے؟۔ یہ سوال ہر انسان کے ذہن میں اُبھرتا ہے۔ ماہرین تعمیرات نے مختلف مفروضے تیار کیے۔ کچھ کہتے ہیں کہ تعمیر کے دوران ساتھ ساتھ ارد گرد کی جگہ کو اونچا کیا جاتا رہا اور ساتھ ساتھ تعمیر ہوتی گئی۔ تعمیر کے بعد ارد گرد کے عارضی ملبے کو ہٹا دیا گیا۔ اس مفروضے سے اختلاف کرنے والے یہ کہتے ہیں کہ وہ تمام ملبہ گیا کدھر۔ اہرام کے ارادگرد تو اس کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ کچھ کہتے ہیں کہ اہرام کے درمیان تک ارد گرد عارضی طور پر جگہ کو اونچا کیا گیا تھا پھر مشینوں کے ذریعے پتھر اور دوسرا ساز وسامان اوپر لے جاتے رہے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اُس زمانے میں مشینری تھی جس کا جواب نفی میں ہے چونکہ اُس وقت تک لوہا ایجاد نہیں ہوا تھا۔

کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ فراعنہ نے ظلم وستم کر کے غلاموں سے یہ اہرام تعمیر کروائے لیکن میرے خیال میں ایسا نہیں ہوا۔ بیگار کا کام کبھی بھی معیاری نہیں ہوتا۔ جبکہ ان اہرام کی تعمیر میں اعلیٰ ترین تکنیک استعمال کی گئی۔ غلاموں میں ایسی صلاحیتوں اگر ہوں بھی تو غلامی کے پھندے میں وہ سلب ہو جاتی ہیں۔ ایسی اعلیٰ تخلیق ایک اعلیٰ ذہن کے انسان میں آزاد فضا میں ہی پرورش پاسکتی ہیں۔

دو ہزار سال پہلے یونانیوں نے مصر پر قبضہ کیا تو اُن کیلئے بھی یہ سوال ایک معمہ تھا۔ تب سے آج تک اس پر بہت غور وفکر ہو چکا ہے۔ 450ق م میں یونانی مفکر ہیروڈٹس Herodotus نے مقامی لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ ایک لاکھ آدمی جن میں اکثریت غلاموں کی تھی نے دن رات تین شفٹوں میں مسلسل بیس سال کام کرتے رہے تب یہ دنیا کا عجوبہ وجود میں آیا۔ لیکن جب ہیروڈٹس یہ معلومات جمع کر رہا تھا تب اہرام کو تعمیر ہوئے ڈھائی ہزار سال سے زیادہ عرصہ بیت چکا تھا۔ اور وہ لوگ بلکہ اُن کی نسلیں مرکھپ چکی تھی۔

مجھے یاد آیا ایک بار میں نے اہرام مصر کے ڈائریکٹر ڈاکٹر ضیائی حواس کا ایک انٹرویو پڑھا تھا جس میں انہوں نے تعمیر اہرام کے بارے میں بتایا تھا کہ:

''ہم مصری مل جل کر کام کرنے کے عادی ہیں۔ آج بھی مصر کے

دیہاتوں میں لوگ باہمی اشتراک سے کام کرنے کے عادی ہیں۔
مثال کے طور پر کھیت میں ہل چلانے سے فصل کی تیاری اور کٹائی
تک کسان ہر مرحلہ پر ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ جب اہرام
تعمیر ہوئے تو یہ کام مصری لوگوں نے ملکی روایات کے مطابق اپنی
خوشی سے بلا معاوضہ ایک دوسرے کی مدد کے جذبہ کے تحت کیا
تھا۔ جب اہرام تعمیر ہوئے تو ایک جشن عظیم برپا ہوا تھا۔ بالکل اُسی
طرح جیسے آج بھی اہل مصر ایک دوسرے کی مدد کے بعد جب کوئی
کام مکمل کرتے ہیں تو وہ جشن مناتے ہیں۔''

جب میں نے ڈاکٹر ضیائی کا انٹرویو پڑھا تب مجھے یاد آیا کہ ہمارے علاقہ میں آج بھی لوگ مل جل کر اشتراک باہمی کے تحت ایک دوسرے کی بلا معاوضہ مدد کرتے ہیں۔ جسے مقامی زبان میں ہم ''لیتری'' اور بلا معاوضہ کام کرنے والوں کو ''لیترے'' کہتے ہیں۔ یوں بقول ڈاکٹر ضیائی اہرام ''لیتروں'' نے تعمیر کیے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو غلاموں سے اہرام تیار کروانے والا مفروضہ غلط ثابت ہوتا ہے۔

''لیتروں'' سے مزدوری لینے کے ڈاکٹر ضیائی کے نظریہ کے علاوہ میرے خیال میں یہ کام مذہبی جذبہ کے تحت لوگوں نے انجام دیا تھا۔ قدیم مصری فرعون وقت کو خدا مانتے تھے۔ مزدوروں کی اکثریت اُن کسانوں کی تھی جو مصر کی سرزمین میں کھیتی باڑی کرنے کے بعد اپنا فالتو وقت کارِ ثواب کے لئے اس کام میں لگاتے تھے بالکل اسی طرح جیسے آج بھی بہت سے عقیدت مند اپنے پیر و مرشد کی خوشنودی کیلئے بلا معاوضہ اُن کی خدمت کرتے ہیں۔ لیکن بلا معاوضہ کی اس خدمت کو ہم غلامی سے تشبیہ دینے کی بجائے شوق سے قبول کر رہے ہیں۔

مصری مذہب پرست قوم ہے۔ انہوں نے جس مذہب پر ایمان لایا اُسے صدق دل سے مانا۔ دور فراعنہ میں جب یہ فراعنہ کے مذہب کو مانتے تھے تب یہ مالی جانی ہر لحاظ سے قربانیاں دیتے تھے۔ بلکہ رات دن اُسی مذہب کے گن گاتے رہتے تھے۔ آج کے مصریوں کی اکثریت مذہب اسلام سے وابستہ ہے۔ چنانچہ دنیا کی پہلی اسلامی یونیورسٹی الازہر قاہرہ میں قائم ہوئی۔ دنیا کے بہترین قراء مصر کے ہیں۔ مصری مذہب کے نام پر ہر قسم کی قربانی دینے کیلئے

ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ اسی جبلت کی بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ دور فراعنہ میں تعمیر ہونے والے اہرام اور دوسری مذہبی عبادت گاہیں مصریوں نے ہی مذہبی جذبہ کے تحت تعمیر کی تھیں۔ دنیا میں مذاہب کے نام پر بڑی بڑی قربیاں اور بڑی بڑی یادگار عمارتیں وجود میں آئی ہیں۔

آج کے ماہر مصریات اس بات پر بھی غور و فکر کر رہے ہیں کہ اہرام کی تعمیر میں تیس ہزار سے زائد جو لوگ کام کرتے تھے اُن کے کھانے پینے اور رہائش کا کیا انتظام تھا۔ میرے خیال میں مصر کا ملک گرم ہے جس میں بارش اور سردی برائے نام ہوتی ہے چنانچہ مزدور خیموں میں رہتے تھے اور کھانا شاہی لنگر فراہم کرتا تھا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسان اپنے کھیت سے غلہ بھی ثواب حاصل کرنے کیلئے ساتھ لے جاتے ہوئے ہونگے۔ اس قسم کے ثبوت ملے ہیں کہ اگر کوئی مزدور کام کے دوران زخمی ہو جاتا تو اُسے ہنگامی طبی امداد فراہم کی جاتی تھی۔ اگر کسی کا کوئی اعضا ءٹوٹ جاتا تو اُس کا علاج کروایا جاتا تھا۔

گیزہ کے علاقہ سے مزدوروں کے قبرستان سے جو ڈھانچے ملے اُن کے طبی معائنہ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ مزدور کی اوسط عمر تیس سے پینتیس سال تھی جبکہ ہنر مند اور نگرانوں کی عمر پچاس اور ساٹھ سال کے درمیان ہوتی تھیں۔ مزدوروں کی اکثریت کمر درد اور کندھوں کے درمیان کھنچاؤ کی وجہ سے مرتی تھی۔ اس کی وجہ غالباً یہی تھی کہ مزدور بھاری پتھروں اور دوسرا ساز و سامان کھینچے سے بیمار ہو جاتے تھے۔

یہ سچ ہے کہ اہرام میں کام کرنے والے مزدور بلا معاوضہ کام کرتے تھے۔ ممکن ہے اس وجہ سے مفکرین نے اسے غلامی سے جوڑ دیا ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُس زمانے میں لین دین کیلئے ادل بدل یعنی Barter system کا نظام تھا۔ نقدی کی صورت میں معاوضہ کا تصور نہیں تھا۔ لوگ کام کے بدلے کام کرتے تھے۔ اور یوں بھی آج کے دور کو پانچ ہزار سال پہلے کے دور سے مقابلہ کرنا عقل مندی نہیں۔

اہرام کی سیاحت کے دوران منیر حسین اہرام کے فوٹو بنانے میں مصروف تھے۔ یعقوب آزاد، بکاری اور ڈرائیور حمام گھوم پھر کر لطف اٹھا رہے تھے۔ میں ایک چٹان پر بیٹھ گیا۔ اور لوگوں کو ہنستے کھیلتے اہرام کی سیاحت کرتے دیکھنے لگا۔ اس دوران ایک باریش بزرگ میرے پاس آئے اور اہرام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا آپ کو علم ہے یہ

اہرام کس نے اور کس طرح تعمیر کیے تھے؟ اور پھر میرے جواب دینے سے قبل ہی اُس بزرگ کامل نے خود ہی جواب دینا شروع کر دیا کہ یہ حضرت سلمان علیہ السلام نے تعمیر کروائے تھے۔ حضرت سلمان علیہ السلام کے قبضہ میں جنات تھے۔ جنہوں نے جنات کو حکم دیا کہ میرے لئے اہرام تعمیر کرو۔ چنانچہ حکم کی تعمیل میں جنات نے یہ اہرام کچھ اس انداز سے تعمیر کیے کہ آج تک آپ جیسے لوگ مغز ماری کرتے کرتے تھک گئے ہیں لیکن آپ کو اس کا حل نہیں مل سکا۔ اور پھر ایک لمبی سانس لیتے ہوئے بولے: ''عجیب زمانہ آ گیا ہے۔ مغرب کے یہ دانشور مجھ جیسے انسان سے کچھ پوچھتے ہی نہیں۔''

اہرام کی تعمیر کے پراسرار راز افشاں کرنے کے بعد وہ بزرگ مجھ سے دوبارہ مخاطب ہوتے ہوئے کہنے لگے: ''آپ شریف آدمی ہیں۔ مجھے بتائیے کہ حضرت سلمان علیہ السلام اور جنات کے اہرام تعمیر کرنے کے بارے میں، میں نے جو نظریہ پیش کیا ہے اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' میں نے کہا کہ: ''حضرت ابراہیم علیہ السلام سے آٹھ سو سال، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سولہ سو سال اور حضرت سلمان علیہ السلام سے اٹھارہ سو سال قبل یہ اہرام تعمیر کیے گئے تھے۔ حضرت سلمان علیہ السلام جب اس دنیا میں موجود ہی نہیں تھے تو پھر انہوں نے جنات کو تعمیر اہرام کا کس طرح حکم دیا؟

کیا یہ کوئی پیغمبری معجزہ تھا؟''

میرے جواب پر اُس دانشور بزرگ نے مجھے گھورا اور زیر لب بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

اہرام کا شمار دنیا کے سات عجائبات میں ہوتا ہے۔ جسے تعمیر کرنے کیلئے مزدور جنوبی مصر کے علاقے اسوان کے پہاڑوں سے پتھر کاٹ کر نکالتے اور پھر دریائے نیل میں کشتیوں کے ذریعے ایک ہزار کلومیٹر کا سفر طے کرتے ہوئے گیزہ لاتے تھے۔ بھاری پتھروں کے نیچے گول گول لکڑیاں رکھ کر پتھر کو رسوں سے باندھ کر کھینچا جاتا تھا۔ بدقسمتی سے اگر کوئی غریب مزدور پتھر کے نیچے آ جاتا تو وہ ہمیشہ کیلئے اس دنیا سے رخصت ہو جاتا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے آج کے روشن خیال یورپ میں ناقص انتظامات کی وجہ سے بہت سے مزدور مشینوں میں پھنس کر ہاتھ پاؤں اور بعض اوقات جان کی بازی بھی ہار جاتے ہیں۔ چونکہ:

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

گیزہ کے اہرام کیلئے پتھر اسوان کے علاوہ قاہرہ شہر کی سب سے اونچی پہاڑی مقطم سے بھی نکالے جاتے رہے۔ یہ پہاڑی اس وقت قاہرہ شہر کی پشت پر ہے۔ جس پر سلطان صلاح الدین نے قلعہ اور محمد علی پاشا نے بعد میں مسجد تعمیر کروائی تھی۔ جو اس وقت بھی اپنی پوری آن اور شان کے ساتھ قائم ہے۔ قلعہ کی پشت پر اس وقت بھی پہاڑ سے پتھر نکال کر تعمیر میں استعمال کیے جاتے رہے۔

قاہرہ کی پشت پر واقع مقطم پہاڑ پر کھڑے ہوں تو گیزہ کے اہرام دریائے نیل کے اُس پار نظر آتے ہیں۔ دن کا منظر رات کے منظر سے مختلف ہوتا ہے۔ شام ہوتے ہی قاہرہ روشنیوں میں جگ مگ کرتا نظر آتا ہے۔ جب کہ گیزہ کا علاقہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا ویران محسوس ہوتا ہے۔ محکمہ سیاحت نے اہرام کیلئے ایک خاص طریقے سے زمین پر لائٹس کچھ اس طرح نصب کی ہیں جو ترچھی اہرام پر پڑتی ہیں جس سے یہ مخروطی اہرام روشنی کے منیار نظر آتے ہیں۔

اہرام سے تھوڑا دور رات کے وقت وہ کھیل سٹیج کیا جاتا ہے جس میں دور فراعنہ کو تصویری شکل میں کچھ یوں پیش کیا جاتا ہے کہ دیکھنے والے اپنے آپ کو دور فراعنہ میں پاتے ہیں۔ فراعنہ کے چلنے کی آوازیں اُن کے گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور پھر غلاموں پر ڈھائے جانے والے ظلم کے منظر آپ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

منگل 28 فروری 2006ء کو ہم نے اہرام دیکھے۔ اُس دن برطانیہ سردی کی لپیٹ میں تھا جہاں برف باری ہو رہی تھی۔ لیکن مصر میں ہمیں پسینہ آ رہا تھا۔ درجہ حرارت 24 ڈگری تھا۔ ہم سائے اور ٹھنڈے مشروب پینے کی تلاش میں گاڑی میں بیٹھ کر اہرام کے پہلو سے نیچے اُترے۔ تو ڈھلوان کے دامن میں ابوالہول سے ملاقات ہو گئی۔

ابوالہول

کافری بادشاہ نے جب اپنے والد خوفو کے پہلو میں اہرام تعمیر کروایا تو اس علاقہ میں ایک ایسی عبادت گاہ کی ضرورت محسوس ہوئی جو فراعنہ کی شایان شان ہو۔ یوں ابوالہول نامی شہرہ آفاق مجسمہ تراش کروایا گیا جو ساڑھے چار ہزار سال سے ابوالہول Sphinx کہلاتا ہے۔ دنیا کے سیاح جب مصر کی سیاحت کیلئے روانہ ہوتے ہیں تو اُن کی فہرست میں ابوالہول بھی ہوتا

ہے۔ ابوالہول کا مجسمہ ایک چٹان کاٹ کر کچھ اس طرح تراشا گیا ہے کہ اُس کا دنیا میں بدل نہیں۔ مجسمے میں ایک شیر ہے جو اپنے پچھلے دو پاؤں سمیٹے آرام سے بیٹھا ہے۔ اگلے دونوں پاؤں آگے پھلائے ہوئے ہیں۔ سر اوپر یوں اٹھا ہوا ہے۔ جیسے پاسبان ہو۔ شیر کے دھڑ پر انسانی سر ہے۔ ماہرین مصریات کا خیال ہے کہ ابوالہول کا چہرہ کافری بادشاہ کا چہرہ تھا۔ اور سر کے اوپر جس طرح فراعنہ بادشاہ تاج پہنتے تھے اُسی نمونے کا تاج ہے۔

ابوالہول کو قریب سے دیکھنے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے پہلے یہ ایک پہاڑی تھی۔ جسے کاریگروں نے کاٹ اور تراش کر 66 فٹ اونچا یہ مجسمہ بنایا۔ جس کا چہرہ بیس فٹ چوڑا ہے۔ ہزاروں سال کی گردش زمانہ کے ہاتھوں ابوالہول اپنی ناک کٹوانے کے ساتھ ساتھ ڈاڑھی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ حال میں ماہرین آثار قدیمہ نے جدید ترین ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے اسے اصلی حالت میں لانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن آج روشن صدی کے کاریگر وہ کام نہ کر سکے جو ساڑھے چار ہزار سال پہلے مصری کاریگر کر چکے ہیں۔

ہم دوپہر کے وقت جب ابوالہول کے پاس پہنچے تو دھوپ اپنے شباب پر تھی۔ ابوالہول کا مجسمہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ اہل مصر نے اس کی اصل رونق ختم کر دی ہے۔ اور ''قبضہ گروپ'' نے اس کے دامن تک تعمیرات کر ڈالی ہیں۔ اب دریائے نیل نے بھی اپنا رخ بدل دیا ہے اور یہاں سے کافی دور بہہ رہا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ دریا بھی اہل مصر کی تجاوزات والی حرکت سے خوش نہیں۔

میں نے گھوم پھر کر ابوالہول کا مجسمہ دیکھا۔ جس کی دہشت اپنی جگہ لیکن اس کے قریب جو عبادت گاہ تھی اُس کی اپنی ایک شان تھی۔ میں اُن کاریگروں اور مزدوروں کو داد دینے لگا جنہوں نے پتہ نہیں کتنے دور سے بڑے بڑے پہاڑ نما پتھر لا کر یہ عبادت گاہ تعمیر کی تھی۔ میں ایک پتھر کے پاس دونوں ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہوا۔ پیمائش سے پتہ چلا کہ صرف ایک پتھر دس فٹ چوڑا اور اٹھارہ فٹ اونچا تھا۔ جس کا وزن یقیناً کئی ٹن ہوگا۔ ایسے بھاری پتھروں کو دور دراز کی پہاڑیوں سے کاٹ کر یہاں تک لانا یقیناً جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

ابوالہول کا مجسمہ کچھ اس طرح ہے کہ صبح سورج کی پہلی کرن اسی پر آن پڑتی ہے۔ اہل مصر اُس وقت سورج دیوتا کی پوجا کرتے تھے۔ یوں ابوالہول ایک ایسی عبادت گاہ کی حیثیت رکھتا

تھا۔ جہاں مصری لوگ حاضر ہونے کو اپنی خوش قسمتی سمجھتے تھے۔ لیکن عموماً یہاں شاہی میت کی آخری رسوم ادا کی جاتی تھیں جس کے بعد مذہبی پیشوا میت کو اپنی تحویل میں رکھ کر اہرام تک لے جاتے جہاں ماہرین تعمیرات اپنی تحویل میں لیکر اُسے خفیہ مقام پر پہنچا دیتے تھے۔

جب ابوالہول تیار ہوا تب دریائے نیل اس کے سامنے سے گزرتا تھا۔ پانی کی قدر و قیمت صحرائی لوگوں سے پوچھیں۔ فراعنہ کو یہ فکر رہتی تھی کہ اگر دریائے نیل کا پانی خشک ہوگیا تو پھر اہل مصر پیاسے مر جائیں گے۔ یوں دریا کو خشک ہونے سے بچانے کیلئے فرعون مختلف طریقے اختیار کرتے رہتے تھے۔ ایک نظریہ کے مطابق ابوالہول کی یہ بھی ذمہ داری تھی کہ وہ دریائے نیل پر نظر رکھے۔ فراعنہ کا عقیدہ تھا کہ جب تک ابوالہول پانی کی طرف دیکھتا رہے گا دریا بہتا رہے گا۔

ابوالہول عربی کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے دہشت کا باپ۔ ممکن ہے زمانہ قدیم میں جب فراعنہ نے اسے تراش کر عبادت کے قابل بنایا تو پادریوں نے اس سے کچھ اس طرح عقیدت کا اظہار کیا کہ بیچ میں سے فراعنہ کہیں غائب ہونے لگے اور طاقت آہستہ آہستہ فراعنہ سے پادریوں کے ہاتھ میں منتقل ہوتی رہی۔ یوں جب فراعنہ کمزور ہونے لگے تو پھر اپنے ہی ہاتھوں بنائے ہوئے ابوالہول کا مقام گرانے کی خاطر اسے دہشت کا باپ قرار دیا۔ بالکل اُسی طرح جیسے موجودہ زمانے میں اسامہ بن لادن کا نام امریکہ اور یورپ میں کھلبلی مچا دیتا ہے۔ یوں یہ خوفزدہ لوگ ڈر کے مارے اسامہ کو ''دہشت کا باپ'' قرار دے رہے ہیں۔ تاکہ سب دنیا ملکر اس شمع کو گل کرے جسے خود امریکہ نے اپنے ہاتھوں بنا کر روشن کیا تھا۔

دور فراعنہ میں جب دریائے نیل ابوالہول کے سامنے سے بہتا تھا تب یہاں سامنے ایک مصنوعی جھیل تھی۔ یہ جھیل کشتیوں کو دریا کے کنارے کھڑا کرنے اور شاہی جلوس کے استقبال کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ گیزہ کا یہ علاقہ فراعنہ کا شاہی قبرستان تھا۔ اور ان کے محلات یہاں سے پندرہ میل دور ممفیس میں تھے۔ جب بادشاہ یا شاہی خاندان کا کوئی فرد فوت ہوجاتا تو حنوط کے بعد میت کو شاہی قبرستان ایک جلوس میں دریائے نیل کے ذریعے لایا جاتا تھا۔ ممفیس اور گیزہ کے درمیان دریا کے کنارے مختلف عبادت گاہیں تھیں۔ جہاں میت کیلئے آخری رسومات ادا کرتے ہوئے جلوس آگے بڑھتا ہوا ابوالہول

کے سامنے آ کر رک جاتا تھا۔ پھر مذہبی لیڈر میت کو ابوالہول کی عبادت گاہ میں لے جا کر مذہبی رسوم ادا کرتے تھے۔ جہاں سے اہرام تک لے جاتے۔ اہرام کے پہلو میں بھی ایک عبادت گاہ ہوا کرتی تھی۔ آخری مذہبی رسوم وہاں ادا کر کے میت کو اہرام کے خفیہ مقام تک پہنچا دیا جاتا تھا۔

ہم کافی عرصہ گھوم پھر کر ابوالہول کا ہر طرف سے جائزہ لیتے رہے۔ اس کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے ٹیلے ہیں ہم اُن ٹیلوں پر چڑھے تو وہاں اور بھی سیاح موجود تھے جو فوٹو گرافی میں مصروف تھے۔ کچھ یورپی سیاح ابوالہول کے سائے میں پیار و محبت کے محنت طلب کام میں مصروف تھے۔ سفید چمڑی کے ساتھ ساتھ افریقی اور ہم جیسے چند ایشیائی سیاح بھی تھے۔ بکاری نے افریقی خواتین کے ایک سیاحتی گروپ سے دوستی لگائی اور کافی عرصہ اُن کے ساتھ صومالی زبان میں باتیں کرتا رہا۔

گیزہ میں اہرام اور ابوالہول کی سیر کرتے کرتے دوپہر ہوگئی۔ گرمی سے ہم شرابور تھے۔ چنانچہ وہاں قریب ہی ایف سی ہوٹل میں جا کر کھانا کھایا۔ یہ ہوٹل بالکل ابوالہول کے سامنے ہے۔ ہم دوسری منزل پر بیٹھ کر کھانا کھاتے، اہرام، ابوالہول، قرب و جوار میں ہونے والی تعمیرات کا جائزہ لیتے باتیں کرتے اور تصویریں بنواتے رہے۔

اہرام کے بارے میں لوگوں کے مختلف خیالات، نظریات اور وہم پایا جاتا ہے۔ 1817ء میں ایک برطانوی باشندے نے جب اہرام کے اندر جانے کا راستہ تلاش کیا اور راستہ کے منہ پر جو پتھر نصب تھا اُسے جہاز میں رکھ کر برطانیہ لے جا رہا تھا کہ راستے میں جہاز ڈوبا اور وہ پتھر بھی ساتھ ڈوب گیا۔ یوں یہ بات مشہور ہوگئی کہ فراعنہ مر کر بھی اپنے اہرام کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اہرام کے اندر اگر کوئی چیز رکھی جائے تو وہ خراب نہیں ہوتی۔ موجودہ سائنسی دور میں تجربات سے یہ بات غلط ثابت ہو چکی ہے۔ توت عنخ آمون کی میت تلاش کرنے والے ماہرین بھی مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو کر فوت ہوئے تو ایک بار پھر شور اٹھا کہ یہ بھی فراعنہ کی بددعا کا نتیجہ تھا۔ لیکن بعد میں سائنسی تحقیق نے اس افواہ کا بھی دم توڑ دیا۔

کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ اہرام کی تعمیر ستاروں کے مطابق ہے۔ چنانچہ آسمان پر سات ستاروں کی ترتیب کے مطابق گیزہ میں اہرام تعمیر کیے گئے۔

کچھ کتابوں، فلموں اور ذرائع ابلاغ میں یہ تاثر دیا گیا ہے کہ فراعنہ نے یہودیوں کو غلام بنا کر اپنے اہرام بنوائے تھے۔ تاریخ اس بات کی نفی کرتی ہے۔ یہودی مذہب کی عمر ساڑھے تین ہزار سال کے لگ بھگ ہے۔ جبکہ اہرام کی تعمیر یہودیت کے وجود میں آنے سے بارہ سو سال قبل وجود میں آ چکی تھی۔ اپنے وجود سے پہلے کوئی کام انجام دینا ممکن نہیں۔

ہاں اگر کوئی معجزہ ہوا تو مجھے اُس سے انکار نہیں!.........



فراعنہ کے محلات
اور قبرستان

ممفس

سقارہ

محلات اور قبرستان

کھانے کے بعد فیصلہ ہوا کہ فراعنہ کے قدیمی شہر ممفیس چلیں تا کہ جن بادشاہوں کے گیزہ میں یہ مزار ہیں اُن کے محل اور فراعنہ کا پہلا شاہی قبرستان بھی دیکھ لیں۔ کھانے کے بعد اٹھے اہرام اور ابوالہول پر ایک بار پھر نظریں ڈالیں اور کار میں بیٹھ کر ممفیس کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ سفر دریائے نیل اور اُس میں سے نکالی گئی نہر کے کنارے کنارے ہوتا رہا۔ سڑک سنگل لیکن پختہ تھی۔ جو سرسبز کھیتوں اور باغات کے بیچوں بیچ گذرتی ہے۔ راستے میں کچھ گاؤں بھی دیکھے۔

آج ہمیں مصر کی دیہاتی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ گاؤں کے مکان اینٹوں اور گارے کے بنے ہوئے تھے۔ عمر رسیدہ خواتین مصر کے روایتی لباس میں تھیں۔ کچھ خواتین نظر آئیں جو کھیتوں میں کام کرنے کے بعد ہریالی کی گٹھڑی سر پر اٹھائے پیچھے پیچھے بچے چلتے گھروں کو جارہے تھے۔ قدرے بڑے بچوں نے سوکھی لکڑیوں کو رسی میں باندھ کر سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ بھیڑ، بکریاں، بھینسیں، گائیں، بیل، گدھے اور چند اونٹ بھی کھیتوں میں چرتے دیکھے۔ ایک دیہاتی خچر پر سوار کہیں جارہا تھا جس کے ہاتھ میں حقہ تھا۔ جو خچر پر سوار حقے کے سوٹے بھی لگا رہا تھا۔ قاہرہ سے ممفس اور سقارہ جانے والی یہ سڑک دیہاتوں اور سرسبز کھیتوں کے درمیان میں سے گزرتی ہوئی ایک ہرے بھرے اور شاداب باغ میں پہنچی۔ جہاں کسی زمانے

میں ممفیس شہر آباد تھا۔

ممفیس Memphis

آج سے پانچ ہزار سال پہلے قاہرہ سے 32 کلومیٹر اور سقارہ سے تین کلومیٹر دور جنوب مغرب میں فراعنہ بادشاہ مینز نے 3100 ق م میں ممفیس نام سے ایک شہر آباد کیا تھا۔ ممفیس تین ہزار سال تک فراعنہ بلکہ دنیا بھر کا مرکز رہا۔ بعد میں فراعنہ کا دارالحکومت کچھ عرصہ الاقصر میں بھی رہا لیکن اُس کے باوجود اس شہر کی رونق اور اہمیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ یہ دنیا کا منفرد شہر تھا۔ جسے ایک بادشاہ نے اپنے پائے تخت کیلئے بنوایا تھا۔ اُس زمانے کے لوگوں میں شہروں کا تصور نہیں تھا۔ اکثریت غاروں یا پھر خیموں میں خانہ بدوش زندگی بسر کرتی تھی۔ غاروں اور خیموں کے زمانے میں ممفیس ایک ایسا جدید ترین شہر تھا جس میں زندگی کی تمام تر سہولیات میسر تھیں۔ بڑے کمال کی بات تھی۔ ایسی سہولیات جن کا آج کے جدید ترین دور میں تصور نہیں کیا جا سکتا۔

ممفیس کی بنیاد پڑتے ہی دنیا میں شہنشاہیت کا آغاز ہوا۔ اس سے قبل دنیا میں وسیع تر حکومت کا تصور نہیں تھا۔ لوگ قبائل میں تقسیم تھے اور قبیلے کا سردار ہی روزمرہ کے مسائل کو نبٹاتا رہتا تھا۔

ممفیس دریائے نیل کے کنارے ایک خوبصورت شہر تھا۔ جس کے اردگرد سفید پتھر کی دیوار تھی۔ اِسی بناء پر یہ شہر ''وائیٹ وال'' کے نام سے مشہور تھا۔ سفید دیوار کے اندر آباد شہر میں محلات، حکومتی دفاتر، ہسپتال، میت کو حنوط کرنے کے سنٹر، عبادت گاہیں، جیلیں اور بازار تھے۔ محل دو حصوں میں تقسیم تھا۔ ایک حصہ ''ریڈ ہاؤس'' اور دوسرا ''وائیٹ ہاؤس'' کہلاتا تھا۔ بادشاہ کا تاج بھی سرخ اور سفید تھا جو متحدہ مصر کی علامت تھی۔ چونکہ بالائی مصر کا نشان سرخ اور ڈیلٹا کا نشان سفید تھا۔ اسی وجہ سے محل بھی سرخ اور سفید حصوں پر مشتمل تھا جو متحدہ مصر کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ طاقت کا سرچشمہ ''وائیٹ ہاوس'' کو ہی سمجھا جاتا تھا جہاں فراعنہ خود رہتے اور اُن کے دفاتر تھے جبکہ سرخ حصہ میں انتظامی امور کے دوسرے دفاتر ہوتے تھے۔ ایسے لگتا ہے جیسے امریکیوں نے بھی فراعنہ سے متاثر ہو کر اپنے دارالحکومت کا نام ''وائیٹ ہاؤس'' رکھا۔

ممفیس شہر کے بڑے بڑے مراکز میں فراعنہ کے مجسمے نصب تھے۔شاہی تقریبات محلات کے اردگرد پھیلے ہوئے وسیع علاقہ میں ہوتی تھیں۔ جب بادشاہ گزرتے تو راستے کے اردگرد جوان لڑکیاں اپنے سر کے بال پھیلا دیتی تھیں جن پر بادشاہ چلتے تھے۔ بالکل ایسے ہی جیسے آج بھی آغا خان کے پیروکار کی جوان دوشیزائیں اپنے بال اُن کی عقیدت میں راہ میں بکھیر دیتی ہیں۔ فراعنہ کے زمانے میں کچھ خواتین بادشاہوں پر پھول نچھاور کرتی تھیں۔ صحن کے چاروں طرف دور دور تک جوان لڑکیاں میوزک پر ناچ گانے میں مصروف رہتی تھیں۔ان تمام مناظر کی تصویرکشی ان بادشاہوں کے مقبروں میں بنی ہوئی آج بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔

ممفیس شہر میں شاہی محلات کے بعد سب سے زیادہ توجہ کا مرکز پیتھ دیوتا Ptah کا مندر تھا۔ پیتھ کا دیوتا ہنرمندوں اور کاریگروں کا دیوتا مانا جاتا تھا۔ اس مندر کے مذہبی رہنما کو اہل مصر ''گریٹ لیڈر آف کرافٹس مین'' یعنی ''اہل ہنر کا سب سے بڑا رہنما'' کے لقب سے پکارتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ فراعنہ سنگ تراش سے لیکر مجسمے ساز تک سب اہل ہنر کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اُن کی خوراک اور رہائش کا معقول بندوست کیا جاتا تھا۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب لوگوں کی اکثریت خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے ہوئے خیموں میں رہتی تھی۔ لیکن ہنرمندوں کی بستیاں شاہی محل کے قریب ہوتی تھیں جن کے کھنڈرات اب بھی الاقصر میں موجود ہیں۔ پیتھ دیوتا کے مندر پورے ممفیس بلکہ مصر میں تھے۔جن میں پیتھ کے مجسمے رکھے ہوئے تھے۔ کچھ دیوہیکل مجسمے شہر کے بڑے بڑے مراکز میں بھی نصب تھے۔ پیتھ دیوتا کو مجسمے میں حنوط شدہ دکھایا گیا تھا۔ جس کی ٹھوڑی پر ڈاڑھی کا نشان تھا۔ لیکن ہاتھ کام کاج اور طاقت کے استعمال کیلئے کھلے ہوئے تھے۔ مصریوں کا خیال تھا کہ پیتھ دیوتا نے اپنے ہنر اور فن سے جنت، زمین اور آسمان تخلیق کیے تھے۔

بیل کی قربانی کا آغاز پیتھ دیوتا۔کے زمانے میں ہوا۔ حاجت مند بیل کی قربانی دیتے۔سقارہ کے قبرستان کے متعدد مقبروں میں بیل کی قربانی کے مناظر دیکھے جاسکتے ہیں۔

خوفو بادشاہ کاریگروں اور ہنرمندوں کا بڑا مداح تھا۔ممفیس میں یہ پیتھ دیوتا کی خود پوجا کرتا تھا۔خوفو نے جب ہنرمندوں اور کاریگروں کی حوصلہ افزائی کی اور انہیں معاشرے میں اس قدر اونچا مقام دیا کہ لوگ اُن کی پوجا کرنے لگے۔تب ہنرمندوں نے اپنے فنی کمالات کا

مظاہرہ کرتے ہوئے اہرام کچھ اس انداز سے تعمیر کیے کہ پانچ ہزار سال سے لوگ اُن کے فنی کمالات سے متاثر ہو کر فرط حیرت میں اس طرح ڈوبے ہوئے ہیں کہ اس معمہ کو ابھی تک حل نہیں کر سکے۔

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے امریکہ نے ہنرمندوں کی قدر فراعنہ سے سیکھ کر اس صدی کے آغاز میں دنیا بھر کے ہنرمندوں کو امریکہ لا کر آباد کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ آئن سٹائن جرمن باشندہ تھا۔ جسے امریکہ نے اپنے ہاں پناہ دی اور پھر ہوا یہ کہ آئن سٹائن کی صلاحیتوں سے ایٹم بم تیار ہوا۔ جسے استعمال کرتے ہوئے امریکہ نے جاپان کو تباہ کیا۔ بلکہ اب پوری دنیا پر حکومت کے خواب دیکھ رہا ہے۔ آج بھی امریکہ سمیت پورے یورپ میں اعلیٰ ہنرمندوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے انہیں بخوشی اپنے ملکوں میں مستقل رہنے کی اجازت دی جا رہی ہے۔ اس کے برعکس پاکستان میں آج بھی ہنرمندوں کی بجائے گاؤں اور علاقہ کے جاہل جاگیردار کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات انہیں وزارتوں کے قلم دان بھی سونپے جاتے ہیں جو یہ نہیں جانتے کہ قرآن پاک میں کتنے سپارے ہیں۔

امریکہ نے اپنے ایٹمی سائنسدان آئن سٹائن کو ملک کا اعلیٰ ترین اعزاز عطا کیا تھا۔ جبکہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کو ایٹمی طاقت سے لیس کرنے والے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو محسن پاکستان کے خطاب کی بجائے امریکہ کے اشاروں پر ذلیل و خوار کر رہے ہیں۔ تاکہ کوئی بھی والد اپنے بچے کو ایٹمی سائنسدان نہ بنائے۔ اور یوں مسلم امہ دوسروں کی محتاج بن کر بے کسی کی زندگی بسر کرے۔ جس ملک اور قوم میں علم کی روشنی کی بجائے جہالت کا بول بالا ہوگا تو ایسی قوموں کا زوال پذیر ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

دنیا میں میت حنوط کرنے کا پہلا سینٹر ممفیس میں قائم ہوا۔ جہاں فراعنہ اور اُن کے شاہی خاندان، وزراء اور روساء کی میت کو حنوط کیا جاتا تھا۔ انسانوں کے علاوہ جانوروں کو بھی حنوط کرنے کا آغاز یہاں سے ہوا۔ 2800 ق م کی بات ہے۔ ایک نواب زادے کی بلی مر گئی۔ یہ بلی اُسے بہت پیاری تھی۔ چنانچہ بلی کے غم میں اس نے اپنے ابرو کے بال صاف کروائے اور ماتمی حالت اختیار کرتے ہوئے اپنی پیاری بلی کو حنوط کرنے کا حکم دیا۔ جسے حنوط کے بعد سقارہ کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ بلی کے پیار و محبت میں وہ نواب صاحب اپنے نوکروں چاکروں

کے ساتھ روزانہ بلی کی قبر پر حاضر ہوتے۔ کچھ عرصہ بعد یہاں مرادیں مانگی جانے لگی اور پھر ایک وقت ایسا آیا جب مصر میں بلی بھی دیوتا کی حیثیت اختیار کر گئی۔ جس کی لوگ باقاعدگی کے ساتھ پوجا کرتے اور مرادیں مانگتے تھے۔

فراعنہ کے دور میں مخلوط محفلیں بھی منعقد ہوتی تھیں۔ لیکن اکثر شاہی بیگمات اپنی الگ محفلیں سجاتی تھیں۔ دریائے نیل سے خصوصی طور پر پانی نہر کی شکل میں نکال کر محل کے ساتھ سوئمنگ پول میں ڈالا جاتا تھا۔ دریا میں بھی تیراکی کیلئے جگہیں موجود تھیں۔ جہاں شاہی خواتین امرا اور وزرا کی بیگمات کے ساتھ غسل کرتی تھیں۔ مصر کے علاقہ ڈیلٹا میں فرعون رعمیس دوم کی بیگمات دریا کے کنارے محفل جمائی ہوئی تھی جب اُنہیں ایک ٹوکری میں تیرتا ہوا بچہ نظر آیا جسے انہوں نے اپنے پاس منگوا کر شاہی خاندان میں شامل کر لیا تھا۔ یہی بچہ جوان ہو کر موسیٰ کلیم اللہ کے لقب سے مشہور ہوا۔

شاہی محلات کے ساتھ پروہت جو مذہبی رہنما ہوتے تھے کی رہائش گاہیں تھیں۔ جس کے ساتھ وزرا اور روساء کی کوٹھیاں تھیں۔ پروہت بادشاہ کے روزمرہ کی سرگرمیوں کو ستاروں اور علم نجوم کی روشنی میں ترتیب دیتے تھے۔ چنانچہ پروہت علم نجوم، جوتش اور جادوٹونے کا علم بھی رکھتے تھے۔ وہ زمانہ جادوگری کی مکمل زد میں آیا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ کو فرعون کے دربار میں بھیجا تو فرعون نے حضرت موسیٰ کے مقابلے کیلئے ملک بھر کے جادوگروں کو جمع کیا تھا۔

فرعون صرف بادشاہ نہیں تھے بلکہ وہ اپنے آپ کو سورج دیوتا کی اولاد سمجھتے تھے۔ یوں فرعون سورج دیوتا کے اختیار خود استعمال کرتے تھے۔ پروہت جہاں مذہبی فرائض ادا کرتے تھے وہاں بادشاہوں، وزرا، روساء اور عوام کیلئے عبادت گاہوں میں جانے کے قوانین بھی مرتب کرتے تھے۔ کہ کس طرح مندر میں عبادت کی جائے۔ عبادت گاہوں کے اندر مختلف حصے ہوتے تھے۔ کچھ حصے ایسے تھے جو صرف بادشاہوں کیلئے مخصوص تھے جہاں عام آدمی کا داخلہ ممنوع تھا۔ ممفیس میں مرکزی عبادت گاہ شاہی محل کے قریب ہی تھی۔ اس کے علاوہ شہر میں متعدد عبادت گاہیں تھی۔ کچھ حصے غریب عوام کیلئے مخصوص تھے۔ کچھ عبادت گاہیں صرف میت کی آخری رسومات ادا کرنے کیلئے ہوتی تھیں۔ فراعنہ واحد خدا کی بجائے کئی دیوتاؤں کی عبادت

کرتے تھے۔ ہر دیوتا کا الگ مندر ہوتا تھا۔ کچھ مندر وسیع علاقے میں پھیلے ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک ہی مندر کے ساتھ دوسرے دیوتاؤں کے مندر بھی بنا لیے جاتے تھے۔

دور فراعنہ میں مصر کی 75 فیصد آبادی کھیتی باڑی کے پیشہ سے منسلک تھی۔ گندم، مکئی اور جوار اہم فصلیں تھیں۔ سبزیاں بھی اُگائی جاتی تھیں۔ زمین کی ملکیت بادشاہ کے پاس تھی۔ آغاز میں فراعنہ نے کچھ زمینیں مندروں کے تصرف میں دے دی تھیں۔ آہستہ آہستہ مندروں نے اردگرد کی زمینوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ مذہب کے نام پر ان کے ہاں کسانوں کی قلت نہیں تھی۔ ایسے کسان جو مندروں کیلئے کھیتی باڑی کرتے تھے وہ ٹیکس سے بھی مستثنٰی ہوتے تھے۔ اس طرح حکومت کے خزانہ میں کمی آنا شروع ہوئی۔ اس کے علاوہ صوبے خودمختار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ جنہوں نے اپنے اپنے مقامی مندر اور قبرستان بھی بنا لیے تھے۔ فراعنہ کا پہلا دور اسی وجہ سے ناکام ہوا۔ پھر دوسرے دور کا آغاز ہوا جس میں مصر کی مرکزی حکومت ممفیس میں قائم ہوئی تھی۔

کھیتی باڑی تو عام کسان کرتے تھے۔ لیکن لکھنے پڑھنے کا کام پروہت کے ذمہ تھا۔ ممفیس میں ایسے بہت سے ادارے، ورکشاپ اور فیکٹریاں قائم تھیں جہاں لکھنے پڑھنے اور دوسرے ہنر سیکھائے جاتے تھے۔ شراب کشید کرنے اور بہت سی دوسری اشیاء کی تیاری کیلئے فیکٹریاں تھیں۔ ممفیس ایک وسیع علاقہ میں پھیلا ہوا تھا۔

ممفیس میں جہاں فراعنہ بڑے کروفر سے حکومت کرتے تھے۔ وہاں ہزاروں کی تعداد میں غلام بادشاہوں کی خدمت اور اُن کی خواہشات کے اشاروں پر ناچتے تھے۔ غلاموں کی خرید وفروخت کی پہلی منڈی مصر میں اسی شہر میں قائم ہوئی تھی۔ جہاں غلام لائے جاتے اور امرا انہیں خریدتے تھے۔ غلاموں کی اسی تجارتی منڈی میں ایک دن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے حضرت یوسف علیہ السلام چودہ پندرہ سال کی عمر میں غلام بنا کر لائے گئے۔ جنہیں جب فروخت کرنے کا اعلان ہوا تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے شہر کا شہر انہیں خریدنے کیلئے امنڈ پڑا ہے۔ اس میں امیر اور غریب سب خریداروں کی صف میں کھڑے تھے۔ اس منظر کو مولوی عبدالستار صاحب نے اپنی کتاب قصص المحسنین میں یوں بیان کیا ہے:

ہک عورت ہتھ سوتر اٹی جھگڑا کھلی مچاوے

لے سوتر دیہہ یوسف مینوں مالک نوں بتلاوے
جو عورت مل حضرت کارن اٹی سوت لیائی
اسدے گھر اس اٹی باجھوں چیز نہ ہیسی کائی

حضرت یوسف کو وہ عورت ایک سوتر کی اٹی کے عوض تو نہ خرید سکی بہر حال انہیں مصری حکومت کے ایک اعلیٰ عہدہ دار نے خرید لیا۔ جس کا لقب قرآن پاک میں ''عزیز'' بیان کیا گیا ہے۔ یوں اللہ تعالیٰ نے ایک حکمت کے تحت حضرت یوسف علیہ السلام کو حکومتی ایوانوں تک رسائی دینے کا بندوبست کیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے امتحان لیتے رہتے ہیں۔ اسی امتحان کی کڑی آزمائش کیلئے اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم خاص سے حضرت یوسف علیہ السلام کو بے مثل حسن عطا کیا تھا۔ اِن کے حسن پر عزیز مصر کی بیوی فدا ہونے لگی۔ عزیز مصر کی بیوی کا نام کچھ کتابوں میں زلیخا لکھا ہوا ہے۔ چنانچہ ایک دن زلیخا نے مناسب وقت پا کر حضرت یوسف کو پھنسانے کی کوشش کی لیکن حضرت یوسف اپنا دامن پاک وشفاف بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ راز افشاں ہونے پر زلیخا نے مکر زناں کے مصداق حضرت یوسف علیہ السلام پر الزام تراشی شروع کر دی۔ تحقیق پر حضرت یوسف بے گناہ ثابت ہوئے۔ لیکن مزید بدکاری یا کسی اور مصیبت میں پھنسنے کی بجائے انہوں نے جیل میں رہنا پسند کیا۔

ممفیس کے شہر کی اب صرف چند ایک نشانیاں رہ گئی ہیں باقی سب کچھ زمانے نے مٹا دیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا قید خانہ بھی فنا ہو گیا۔ باقی بچ جانے والی چیزوں میں سے رعمیس ثانی جس نے حضرت موسیٰ کی پرورش کی تھی کے دو بڑے مجسمے شامل ہیں۔ یہ مجسمے فراعنہ دور میں شہر میں نصب تھے۔ ایک مجسمہ سنگ مرمر کا ہے۔ اُن میں سے ایک چالیس فٹ بلند مجسمہ اب قاہرہ کے مرکزی ریلوے سٹیشن کے باہر نصب ہے۔

ممفیس کا عظیم شہر جو دریائے نیل کے کنارے آباد تھا۔ آخر اسی دریائے نیل کے رخ بدلنے سے زیر زمیں چلا گیا۔ اب اس جگہ ریحانہ Rahina نامی چھوٹا سا گاؤں درختوں کے درمیان اپنے شاندار ماضی کو یاد کر کے آنسو بہاتا رہتا ہے۔

ممفیس دیکھنے کے بعد ہم باغ کے بیچوں بیچ گذرتی سڑک کے ذریعے ایک پہاڑی پر چڑھتے ہوئے اوپر جا کر بائیں ہاتھ مڑ کر کار ایک پارک میں کھڑی کر دی۔

یہ سقارہ تھا!

فراعنہ کا شاہی قبرستان!

سقارہ Saqqara

سقارہ میں فراعنہ بادشاہ، شاہی خاندان کے افراد، وُزراء، روساء اور حکومت کے اعلیٰ افسروں کے مقبرے تھے۔ قبرستان آٹھ میل لمبا اور دو میل چوڑا ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ یہی پہاڑی سلسلہ قاہرہ کی طرف جاتے جاتے گیزہ کے شاہی قبرستان تک جا پہنچتا ہے۔ پہاڑی کے اوپر حد نظر تک دور دور تک صحرا ہی صحرا نظر آ رہا تھا۔ جب کہ پہاڑی کے دامن میں سرسبز کھیت اور باغات تھے۔ دور فراعنہ میں دریائے نیل پہاڑی کے دامن کے ساتھ ساتھ بہتا ہوا گیزہ کی طرف چلا جاتا تھا۔ یہ قبرستان تین ہزار سال تک زیر استعمال رہا۔ فراعنہ اپنے دور حکمرانی میں تین شاہی قبرستان استعمال کرتے رہے۔ پہلا قبرستان سقارہ میں تھا۔ دوسرا گیزہ کا قبرستان جہاں اہرام ہیں اور آخر میں الاقصر میں ویلی آف دی کنگ نامی شاہی قبرستان استعمال میں لایا جاتا رہا۔

ہم نے سقارہ کا شاہی قبرستان دیکھنے کیلئے ٹکٹ خریدے اور ایک بڑے گیٹ سے اندر داخل ہوئے۔ اب دائیں ہاتھ دنیا کا پہلا اہرام میرے سامنے تھا۔ یہ اہرام فراعنہ کے بادشاہ زوسر نے اپنے لئے تعمیر کروایا تھا۔ جو مربع شکل کا تھا۔ اسے یوں تعمیر کیا گیا تھا کہ پہلے ایک بہت بڑا چبوترا تعمیر ہوا۔ جو غالباً ایک طرف سے 387 فٹ اور دوسری طرف سے 460 فٹ چوڑا تھا۔ جس پر دوسرا چبوترا بنا لیکن دونوں طرف تھوڑی تھوڑی جگہ چھوڑ دی گئی تھی۔ جیسے سیڑھیاں بنائی جاتی ہیں۔ اسی طرح جگہ چھوڑتے اور چبوترے کے اوپر چبوترا تعمیر کرتے کرتے دو سو تین فٹ بلند اہرام تعمیر ہوا۔ اس میں قدرے چھوٹے پتھر استعمال ہوئے۔ زوسر کے اہرام کے اردگرد کھلے دلان ہیں۔ جہاں فراعنہ کے زمانے میں ہر سات سال بعد میلہ لگتا تھا۔ میلے میں بادشاہ رسمی طور پر اپنی معیاد میں توسیع کرتے تھے۔ اگر غور کیا جائے تو ایک طرح یہ جمہوریت کا آغاز تھا۔ اہرام کے دائیں بائیں دو عبادت گاہیں تھیں جو مصر کے شمال اور جنوب کی نمائندگی کرتی تھیں۔ سامنے جہاں دلان ختم ہوتا تھا وہاں ایک عبادت گاہ تھی جس کے نشانات ابھی تک موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ایک بہت ہی گہرا کنواں ہے۔ اس میں داخل ہونے کیلئے سیڑھیاں

ہیں جو معلوم نہیں کتنی نیچے چلی جاتی ہیں۔ سنا ہے اہل ممفیس قربانی کر کے یہاں پھینک دیا کرتے تھے۔ یہ قربانی انسانی بھی ہوتی تھی اور جانوروں کی بھی۔ مجھے اس وقت بھی وہاں ایک خوفناک دہشت، بے رونقی محسوس ہو رہی تھی۔

ایک گائیڈ نے مجھے بتایا کہ: کنوئیں کی تہہ میں تقریباً ڈیڑھ سو فٹ نیچے فراعنہ کے ایک وزیر مینخو کی قبر ہے۔ یہ قبر ایک پہاڑی کو کاٹ کر اُس میں بنائی گئی تھی۔ جس کا وزن چھ سو من سے زیادہ ہے۔ آج کے انجینئر اس بات پر حیران ہیں کہ اتنی بڑی پہاڑی نما پتھر کو کنوئیں میں اُتارا کیسے گیا۔ لوگ اسی کنوئیں کو قربانی کیلئے بھی استعمال کرتے تھے۔ قربان گاہ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے آخری نکر سے بائیں مڑ کر باہر دیکھا تو حد نظر تک ریت کا ایک سمندر اور اُس میں مزار اور قبریں ہی قبریں نظر آئیں۔ ایک مزار کے باہر لکھا تھا:

''مقبرہ اوناس عنخ بن الملک Mereruka (2400 ق م)''۔ یہ مصر کا بادشاہ تھا۔ جس کے ساتھ اس کے وزیر کا مقبرہ تھا۔ ہم اندر گئے تو ایک کمرے کے بعد دوسرا کمرہ یوں کافی اندر گئے جہاں حنوط شدہ میت رکھی ہوتی تھی۔ باہر گرمی زوروں پر تھی لیکن اندر بڑی ٹھنڈک تھی۔ اس مقبرے کے در و دیوار پر انتہائی خوبصورت نقش و نگاری کی گئی تھی۔ یہاں نگرانی پر تعینات ایک بوڑھے مصری نے بتایا کہ یہ نقش و نگاری نہیں بلکہ اُس زمانے کی تحریریں ہیں جس میں بادشاہ اور وزیر کی زندگی کی پوری تاریخ لکھی ہوئی ہے۔ انتہائی خوبصورت رنگیں تصویریں اور مناظر تھے۔ میں حیران تھا کہ چار ہزار سال سے یہ رنگ اپنی اصلی حالت میں ہیں۔ یہ مقبرہ اوناس عنخ بن الملک کے پورے خاندان کا تھا۔

زوسر بادشاہ کے اہرام سے تقریباً سو میٹر کے فاصلہ پر امہوتب کا مقبرہ ہے۔ یہ زوسر بادشاہ کا وزیر تھا۔ اور مذہبی رہنما بھی تھا۔ مقبرے کے اندر انتہائی دلکش رنگین تصویریں تھی۔ ایک دیوار پر امہوتب کی ایک بڑی تصویر ہے جس میں اُس نے مذہبی لباس پہنا ہوا ہے۔ چونکہ یہ اپنے آپ کو پیتھ دیوتا Ptah کا بیٹا کہلواتا تھا۔ اور دنیا میں اُس کا زندہ نمائندہ تھا۔ کچھ دیواروں پر مکمل طور پر ادھوری تصویریں ہیں اور کچھ میں بہت زیادہ خوبصورتی سے نقش و نگاری کی گئی تھی۔ پتہ چلتا تھا کہ یہ مقبرے مختلف اوقات میں آہستہ آہستہ نقش و نگاری کے مراحل سے گزرتے رہے۔ کچھ مناظر میں مال مویشی کھیتوں میں چرتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ ایک منظر میں بچے کھیل

رہے ہیں۔ ایک منظر میں امہوتب اپنے نوکروں اور جانوروں کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ یہ مقبرے اور اس میں مناظر جیتے جاگتے ایک زمانے کی یادیں تازہ کرتے ہیں۔ جس سے دور فراعنہ کی روزمرہ کی زندگی کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

شاہی مقبروں میں عام لوگوں کی زندگی کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ ہل چلانے کا وہی طریقہ آج بھی دنیا میں رائج ہے۔ ہل کے آگے بیل، گدھے اور کچھ تصویروں میں انسان بھی ہل کھینچتے نظر آتے ہیں۔ ایک آدمی ہل کی ہتھی دوسرا ساتھ ساتھ بیج بوتا اور چار آدمی دو آگے اور دو پیچھے مل کر ہل کھینچتے تھے۔ دور فراعنہ کی معیشت کا انحصار کھیتی باڑی پر تھا۔

کالج میں، میں نے جان کیٹس کی ایک نظم GRACIOUS URN پڑھی تھی۔ کیٹس نے مٹی کا ٹوٹا ہوا ایک گھڑا دیکھا اور اُس سے متاثر کر یہ نظم لکھی تھی۔ گھڑے پر بنے ہوئے ایک منظر میں ایک لڑکی بھاگ رہی تھی جس کے پیچھے اُس کا عاشق لڑکا اُسے پکڑنے کے لئے دوڑ رہا تھا۔ شاعر کہتا ہے کہ دونوں اب اس دنیا میں نہیں لیکن اُن کی یہ تصویریں ہمیشہ اسی طرح جوان وشاداب رہیں گی۔ بالکل اُس گھڑے کے مناظر کے مطابق فراعنہ دور کے مقبروں میں بنے ہوئے یہ مناظر تو موجود ہیں لیکن فراعنہ ختم ہو چکے ہیں۔

سقارہ میں زوسر بادشاہ کے اہرام سے کوئی آدھا میل شمال مغرب کی طرف اُس عبادت گاہ کے کھنڈرات ہیں جہاں بیل کی پوجا کی جاتی تھی۔ یہ قربانی پیتھ Ptah دیوتا کے نام پر دی جاتی تھی۔ اس کے اردگرد بہت سے زیرزمین مقبرے ہیں۔ ان مقبروں میں مری روکا کا مقبرہ بھی ہے۔ 2340ق م یعنی آج سے چار ہزار سال پہلے تعمیر ہونے والا یہ مقبرہ مری روکا کا ہے۔ یہ فراعنہ کا وزیر تھا۔ زیرزمین اس مقبرے میں کئی کمرے ہیں۔ دیواروں پر انتہائی خوبصورتی کے ساتھ روزمرہ زندگی کے مختلف مناظر کی تصویرکشی کچھ اس انداز سے کی گئی ہے کہ فراعنہ دور کی جیتی جاگتی زندگی نظروں کے سامنے گھومنا شروع ہو جاتی ہے۔ کچھ منظر میں کسانوں کو کھیتوں میں ہل چلاتے، فصلیں کاٹتے، گاہ ڈالتے، غلہ کو تول کر گوداموں میں رکھتے۔ کچھ لوگوں کو محنت مزدوری اور مشقت کرتے دکھایا گیا ہے۔ بعض دریائے نیل سے مچھلیاں پکڑتے کچھ کو مقدس بیل کی قربانی دیتے ہوئے یوں دکھایا گیا کہ اُن پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ میرے ساتھ ایک امریکی دوشیزہ نے جب قربانی والے منظر کو دیکھا تو اُس کی چیخ نکل گئی۔ میں

نے پوچھا تو کہنے لگی: ''یہ بڑا خوفناک منظر ہے۔ آپ دیکھتے نہیں وہ سامنے بیل کو ذبح کیا جا رہا ہے اور اُس کا تازہ تازہ خون بہہ رہا ہے۔ بیل کو باندھ کر پہلے اُس کی ایک ٹانگ کاٹی گئی پھر دوسری اور اسی طرح چاروں ٹانگیں کاٹ کر گوشت تقسیم کیا جا رہا تھا۔ زندہ جانور کو یوں کاٹنا کہاں کی انسانیت تھی۔ کتنے ظالم اور وحشی تھے فرعون''۔ میں اس نرم دل امریکی دوشیزہ سے پوچھنے والا تھا آپ عراق اور افغانستان میں جو انسانوں کا قیمتی خون بہا رہے ہیں وہ آپ جیسی نرم دل امریکی دوشیزاؤں کو نظر نہیں آتا؟۔ لیکن میرے پوچھنے سے قبل ہی ایک لمبے تلنگے امریکی نے اُس دوشیزہ کی نرم دلی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُسے اپنی باہوں میں لیا اور دونوں مقبرے سے ملحق ایک اندھیری کوٹھڑی میں کہیں غائب ہو گئے۔

اِن مقبروں کے اندر کچھ مناظر میں مری روکا کو خود پیٹنگ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ایک منظر میں مری روکا کچھ خونخوار جنگلی جانوروں کو تربیت دے رہے ہیں۔

ماضی کی یادگاروں میں ٹائی Ti کا مقبرہ بھی موجود ہے۔ یہ فراعنہ کی حکومت کا اعلیٰ سرکاری عہدہ دار تھا۔ جو سراغ رسانی کا سربراہ اور بادشاہ کے ملازمین کا افسر اعلیٰ تھا۔ اس کی بیوی نفری ہوتب ایک شہزادی تھی۔ دونوں میاں بیوی اور اُن کا بیٹا ایک ہی مقبرے میں مدفون تھے۔ دیواروں پر انتہائی خوبصورتی سے نقش نگاری کی گئی تھی۔ کچھ تصویروں میں کھانا تیار کرنے، شکار کرنے اور قربانی دینے کے مناظر بہت خوبصورتی کے ساتھ نقش دیوار کیے گئے ہیں۔ فوٹو لینا منع ہے۔ لیکن وہاں کے نگران کو ہم نے بخشش دی تو وہ اوجھل ہو گیا اور منیر صاحب نے کچھ مناظر کیمرے کی آنکھ میں بند کر لیے۔

کیمرے کی آنکھ کے علاوہ میں نے اپنی آنکھوں سے بھی مختلف مناظر دیکھے۔ ایک تصویر میں ایک کالی رنگت کا لڑکا ایک نومولد بچھڑے کو کندھوں پر اٹھائے دریا پار کر رہا ہے۔ ایک منظر میں بہت سی عورتیں فرعون کے سامنے ڈانس کر رہی ہیں۔ کچھ شکار کرنے کے مناظر بھی ہیں۔

ان مقبروں سے باہر نکلے تو میرے ساتھی اپنی اپنی پسند کی چیزیں دیکھنے میں مصروف ہو گئے اور میں ایک چٹان پر بیٹھ کر اس شاہی قبرستان کا جائزہ لینے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ دنیا کے ظالم ترین حکمران فراعنہ جن کا زندگی میں دبدبہ تھا آج اُن کے مزار اور قبریں لوگوں کیلئے عبرت

کا سامان مہیا کر رہی ہیں۔ ان لوگوں کے ڈر اور خوف سے لوگ تھر تھر کانپتے تھے۔ یہ جلادوں سے بھی زیادہ ظالم اور متکبر تھے۔ دنیا میں اپنے آپ کو خدا کہلواتے اور لوگ انہیں خدا ہی تسلیم کرتے اور اُن کی عبادت کیا کرتے تھے۔ لیکن ایک وقت آیا جب اُن کی مصنوعی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ چونکہ بقا تو اُسی ذات کو ہے جسے ہم رب العالمین کہتے ہیں۔

آٹھ میل کے علاقہ میں پھیلے ہوئے اس قبرستان کو جب فراعنہ نے آباد کر رکھا تھا تو مقبروں، قبروں کے ساتھ ساتھ یہاں عبادت گاہیں اور قربان گاہیں بھی تھیں۔ جہاں لوگ فراعنہ کے مذہب کے مطابق قربانی دیا کرتے تھے۔ یہاں نہ صرف انسانوں کو دفن کیا جاتا تھا بلکہ بادشاہوں، وزرا اور امیر لوگوں کے منظور نظر پرندوں اور جانوروں کے مرنے کے بعد انہیں حنوط کر کے اُن کیلئے مقبرے بنوا کر وہاں محفوظ کر دیا جاتا تھا۔ سقارہ جہاں کسی زمانے میں بادشاہوں کے کروفر اور ہر وقت رونق میلہ رہتا تھا آج وہاں رات کو الو بولتے ہیں۔ اور دن کو دنیا بھر کے سیاح آ کر عبرت حاصل کرتے ہیں۔

ہم کافی عرصہ سقارہ کی پہاڑی پر گھومتے پھرتے مغرور بادشاہوں اور وزرا کے مقبرے دیکھتے اور عبرت حاصل کرتے رہے۔ دنیا کے سیاح فراعنہ کے دور کو یاد کرتے ہیں اور اہرام کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے لیکن بہت کم لوگ اُن کاریگروں اور لاکھوں مزدوروں کو یاد کرتے ہیں جنہوں نے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر یہ اہرام تعمیر کیے۔ ہزاروں غلاموں نے جان کی قربانیاں دیکر اِن عظیم عجائبات عالم کو وجود میں لائے۔

سقارہ کی پہاڑی کے دامن سے ممفیس کے شہر کی جگہ موجود باغات کی تصویریں لینے کے بعد ہم نے قاہرہ کا رخ کیا۔ راستہ میں سڑک انتہائی خوبصورت تھی۔ سڑک اگرچہ سنگل تھی لیکن تھی پختہ اور خوبصورت۔ سفر کرتے ہوئے مجھے یہی محسوس ہوتا رہا جیسے میں پنجاب کے کسی دیہہ سے گزر رہا ہوں۔ اُسی طرح کھیتوں میں پانی کے رہیٹ چل رہے تھے۔ کچھ کنوؤں پر بیلوں کے ذریعے پانی کھینچ کر نکالا جا رہا تھا۔ جس سے کھیت سیراب ہو رہے تھے۔ بعض جگہوں پر ٹیوب ویل بھی دیکھے۔ اور پھر خاص بات پنجاب کے کنواں پر جیسے جاگیردار کا ڈیرہ ہوتا ہے بالکل اُسی طرح دور کھیتوں میں ڈیرے دیکھے جن کے ساتھ مال مویشی کھیتوں میں چر رہے تھے۔ شٹالے کے ہرے بھرے کھیت۔ میں نے ہندو پاک سے باہر پہلی بار بھینسیں اور سامان کی

نقل مکانی کیلئے گدھے دیکھے۔

ہم اِن لہراتے کھیتوں میں سے گزر رہے تھے کہ سڑک کنارے ایک مسجد دیکھی جہاں نماز ظہر اور عصر ایک ساتھ ادا کیں۔ ہم نماز پڑھ کر باہر نکل رہے تھے کہ ہمارے ساتھ بغیر داڑھی کے ایک مسٹنڈا مصری بھی باہر نکلا۔ لیکن مسجد سے ایک اور مصری جس نے ابھی تازہ تازہ وضو کیا تھا نے اُسے آواز دیکر واپس بلایا۔ شکل وصورت دیکھ کر میں یہی اندازہ لگا رہا تھا کہ یہ اس سے سگریٹ یا چرس ادھار لے گا۔ لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ اُس نے نہ تو سگریٹ مانگا اور نہ چرس بلکہ اُس سے درخواست کی کہ براہ کرم امامت کروا تا کہ میں بھی باجماعت نماز ادا کرسکوں۔ چنانچہ اُس چرسی نما مصری نے آگے کھڑے ہوکر نماز پڑھائی اور دوسرا پیچھے اکیلے کھڑے ہوکر نماز ادا کرتا رہا۔ اس سے پتہ چلا کہ مصری باجماعت نماز ادا کرنے کے بڑے قائل ہیں۔

نماز کے بعد ہم ان ہی سرسبز کھیتوں کے بیچوں بیچ سفر کرتے ہوئے قاہرہ پہنچے۔ جہاں وہی شہر کے ہنگامے۔ جن میں ہم بھی گم ہو گئے۔



مصر کا عجائب گھر

فراعنہ کا شاہی دربار

ماضی کے مزار

فرعون کی لاش

مصر کا عجائب گھر

اگر آپ مصر جائیں اور قاہرہ کا عجائب گھر نہ دیکھیں تو یہی سمجھیں کہ آپ نے کچھ نہیں دیکھا! ہم نے دو مارچ 2006ء کو مصر کا عجائب گھر دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ ویسے بھی گیزہ، سقارہ اور ممفیس کے مقامات دیکھنے کے بعد یہ عجائب گھر دیکھنا اس لئے مفید ہے چونکہ دور فراعنہ کی تمام اہم چیزوں کو لا کر اس عجائب گھر میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ یہ صرف عجائب گھر ہی نہیں فراعنہ دور کی جیتی جاگتی زندگی کے مناظر نظروں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ عجائب گھر میں رکھی ہوئی اشیاء دیکھنے کے بعد آپ آسانی سے یہ بات سمجھ جاتے ہیں کہ فراعنہ دور کے بادشاہ، وزرا اور عوام زندگی کیسے بسر کرتے تھے۔ اور پھر اسے دیکھے بغیر فراعنہ کے انجام کا پتہ لگانا بھی مشکل ہے۔ چونکہ بڑے بڑے فراعنہ کی حنوط شدہ میتیں اسی عجائب گھر کی دوسری منزل پر انسانوں کیلئے عبرت کا سامان فراہم کر رہی ہیں۔

عجائب گھر شہر کے مرکزی چوک التحریر میں ہے۔ منیر حسین اور یعقوب آزاد کی رائے تھی کہ ہم اپنی کار میں گھومتے رہتے ہیں جس کی بناء پر ہمارا مقامی لوگوں سے کوئی رابطہ نہیں۔ چنانچہ مقامی لوگوں سے رابطہ اور مصر کی عام زندگی کو قریب سے دیکھنے کی خاطر ہم نے عجائب گھر جانے کیلئے پہلے ایک بس میں اور پھر انڈر گراونڈ یعنی زیر زمین ریل گاڑی کے ذریعے سفر کیا۔

یہ سفر بہت ہی دلچسپ تھا۔

ہم بارہ بجے قاہرہ کے عجائب گھر پہنچے۔اندر جانے سے قبل ہماری جامعہ تلاشی لی گئی۔ پھر ٹکٹ خریدے۔ایک ٹکٹ 35 مصری پونڈ کا تھا۔ ہمارے کیمرے سیکورٹی احکام نے اپنے پاس رکھ کر ہمیں رسید لکھ دی تاکہ سند رہے۔ اس کی وجہ غالباً یہی تھی کہ ہم مرحوم فراعنہ کی تصویریں نہ بناتے رہیں۔

عجائب گھر کے اندر داخل ہوتے ہی یعقوب آزاد اور منیر حسین مجھ سے الگ ہو گئے۔ غالباً انہوں نے اپنے شوق کے مطابق سیر کرنی تھی۔ آزاد صاحب نے ایک مصری نگہبان سے دوستی گھانٹھ لی اور یوں عجائب گھر کی سیر کی بجائے اُس کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو گئے۔ البتہ بکاری میرے ساتھ رہا۔

فراعنہ کا شاہی دربار

مصر کے عجائب گھر میں داخل ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کسی شاہی دربار میں پہنچ گئے ہیں۔ پہلی منزل پر صدر دروازے کے بالکل سامنے ایک بہت بڑا ہال ہے۔ جس میں جانے کیلئے چند سیڑھیاں اُترنی پڑتی ہیں۔ ہال میں فراعنہ بادشاہوں کے مجسمے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے فراعنہ ایک جگہ جمع ہیں اور انہوں نے مشترکہ شاہی دربار لگایا ہوا ہے۔ بالکل سامنے امونس سوئم اپنی ملکہ اور تین بیٹیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ یہ مجسمہ دس فٹ اونچا ہے۔ دہشت اور چہرے کے اثرات بادشاہوں والے ہیں۔ وہاں قریب ہی کچھ دوسرے بادشاہ فرعونی انداز میں اکڑ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ بائیں ہاتھ فراعنہ کے مزارات سے ملنے والی کچھ اشیاء موجود ہیں۔ ساٹھ فٹ لمبی ایک کشتی بھی ہے۔ یہ کشتی خوفو بادشاہ کے مزار میں رکھی گئی تھی کہ بادشاہ سلامت جب دوبارہ زندہ ہونگے تب اسے استعمال کریں گے۔ وہاں قریب ہی شہزادی نفرو فتاح کے مدفن سے نکالی گئی اشیاء طلائی منکے، گلوبند، کمر بند، بازو بند کے ساتھ چاندی کے برتن اور مرتبان رکھے ہوئے ہیں۔

عجائب گھر کی پہلی منزل پر فراعنہ کے جو مجسمے ہیں وہ زمانہ قدیم میں غالباً ممفیس، الاقصر اور عمرانہ نامی شہروں کے مختلف حصوں پر نصب تھے۔ کچھ عبادت گاہوں کے اندر اور باہر رکھے ہوئے تھے۔ اُس زمانے میں فوٹو گرافی ابھی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ فوٹو کی بجائے

آرٹسٹ مجسمے تیار کرتے تھے۔ ایک ایک مجسمہ ساٹھ ساٹھ فٹ بلند تھا۔ بلند وبالا مجسمے تیار کروانے کا مقصد غالباً اُن بادشاہوں کی عزت، وقار، رعب اور دبدبہ قائم کرنا مطلوب ہوتا تھا۔ اِن مجسموں کو دیکھتے ہوئے پانچ ہزار سال پہلے سے لیکر دو ہزار سال کے درمیانی دور پر محیط عرصہ کی ایک واضح تصویر میرے ذہن میں مرتب ہو رہی تھی۔

ان مجسموں میں ملکہ حسن نفرتیتی کا مجسمہ بھی ہے۔ جو سراپا حسن تھی۔ صراحی دار گردن اور غزالی آنکھیں۔ فراعنہ اُن پر جان نچھاور کرتے تھے۔ نفرتیتی کا حکم اُسی طرح چلتا تھا جس طرح شہنشاہ جہانگیر کی چہیتی بیگم نورجہاں کا حکم چلتا تھا۔ میں کافی عرصہ اس کے پاس کھڑا اِسے گھور گھور کر دیکھتا رہا۔ اس کی خوبصورت نیم واہ آنکھوں میں عجیب کشش اور سرور تھا۔ لباس بھی انتہائی شاندار۔ ایک لمبے ریشمی لباس میں ملبوس ملکہ حسن سیدھی کھڑی تھی۔ لباس کے اوپر کمر کس نما ایک پٹی باندھی ہوئی تھی۔ جس کے دونوں سرے لٹک رہے تھے۔ میں اس ملکہ حسن میں کچھ یوں کھویا کہ مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ یہ حقیقی ملکہ حسن نہیں بلکہ پتھر کا صنم ہے۔ وہی ''صنم'' جسے ہمارے اردو شعرا نے اپنے کلام میں بھرپور جگہ دی ہے۔ نفرتیتی کو دیکھتے دیکھتے میری نظریں قریب آمن ہوتپ **Amenhotep** کے مجسمے پر پڑیں تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے او...... نادان سیاح۔ سب کچھ دیکھنے کے باوجود بھی تم نے عبرت حاصل نہیں کی۔

ہم فرعون ہیں۔ فرعون!۔

کیا تو نے دیکھا اور پڑھا نہیں ہم اپنے ہی براعظم افریقہ کے ''شیدی'' غلاموں اور اپنے کسانوں کا کیا حشر کرتے رہے۔ بنی اسرائیل کے واقعات سے بھی تو واقف ہوگا۔ تجھ میں اتنی ہمت کہ تو میری ملکہ کو میلی نظروں سے دیکھے۔ نفرتیتی کے حسن کا جادو جو ابھی سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ فرعون کی دھمکی سے سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ اور اپنی عزت بچاتے ہوئے نفرتیتی پر جو وقتی طور پر دل بہلانے کیلئے آنکھ رکھی تھی اُسے اٹھایا اور آگے بڑھ گیا۔

ماضی کے مزار

عجائب گھر کی پہلی منزل دیکھ کر میں دوسری منزل پر جا پہنچا۔ پہلی منزل اگر فراعنہ دور

کی زندگی کی عکاسی کرتی ہے تو دوسری منزل فراعنہ کے مزارات اور انکی زندگی بعد از موت کے بارے میں نظریات کو اجاگر کرتی ہے۔ گیزہ، سقارہ اور الاقصر کے شاہی قبرستان کی قبروں سے جو کچھ ملا اُسے اس عجائب گھر میں بڑے قرینے سے سجا دیا گیا ہے۔ اہرام اور زیر زمین قبروں کے مناظر تو آپ پچھلے باب میں دیکھ چکے ہیں۔ یہاں اُن مزارات سے ملنے والی اشیاء ہیں۔ میں نے سینکڑوں تابوت دیکھے جن میں حنوط شدہ لاشوں کو رکھا جاتا تھا۔ ان پر انتہائی خوبصورت نقش و نگار تھے۔ تابوت میں رکھی میت کی تصویریں اور اُن کے عقیدہ کے مطابق اُن دیوتاؤں کی تصویریں جو بعد از موت کے انسان کی مدد کریں گے۔ کاریگروں نے انتہائی محنت سے یہ تابوت تیار کیے تھے۔ جنہیں عجائب گھر کے ایک بڑے ہال میں قرینہ کے ساتھ زمین اور کچھ کو دیواروں کے ساتھ بڑے بڑے شلف لگا کر اُن میں رکھا ہوا ہے۔ ان کے ساتھ پتھر کی وہ قبریں بھی موجود ہیں جن میں ان تابوتوں کو رکھ کر اہرام یا زیر زمین بنائی جانے والے خفیہ مکانوں میں رکھا جاتا تھا۔ ان پتھر کی قبروں کو دیکھ کر میں سخت حیران ہوا۔ پوری قبر جتنا لمبا چوڑا اور پانچ فٹ اونچا ایک ہی پتھر تھا۔ جسے کاریگروں نے کاٹ کاٹ کر قبر بنائی تھی۔ میں یہ سوچتا تھا کہ اتنے لمبے چوڑے انتہائی مضبوط پتھر یقیناً فراعنہ کے دور میں آباد شہروں کے قریب کہیں بھی موجود نہیں تھے۔ انہیں بہت دور کسی پہاڑی سے انسانوں نے کاٹا ہوگا پھر وہاں سے دریا یا کسی اور ذرائع سے لائے ہونگے۔ اور پھر پتہ نہیں کتنے کاریگروں اور مزدوروں نے ملکر اتنے چٹیل پتھر کو کاٹ کر قبر بنائی ہوگئی۔ ایسی کئی قبریں اس عجائب گھر میں موجود ہیں۔ جن کی گہرائی موجودہ زمانے کی قبروں جتنی ہے۔

شاہی خاندان، وزرا اور روسا کی قبریں اسی قسم کے پتھروں کی تھیں۔ اور پھر میت کو اس میں رکھنے کے بعد ایک اتنا ہی لمبی چوڑی پتھر کی سیل کو اوپر رکھ دیا جاتا تھا۔ پتھر کی قبریں اور اُن پر رکھے جانے والی پتھروں کی سینکڑوں سیلیں میں نے اس منزل پر دیکھیں۔ پھر حنوط شدہ لاشوں کی ایک بڑی تعداد وہاں موجود ہے۔ میں نے انہیں سرسری دیکھا چونکہ مجھے عام لوگوں کی بجائے فراعنہ سے ملنا تھا۔

فرعون کی لاش

عجائب گھر کی اسی منزل پر ایک کمرے میں فراعنہ کی شاہی لاشیں رکھی ہوئی ہیں۔

جنہیں دیکھنے کا الگ ٹکٹ ہے۔ چونکہ بادشاہ مر کر بھی بادشاہ ہیں۔ وہ عام لوگ تو تھے نہیں کہ انہیں ہرایرا غیرا نتھو خیرا بغیر نذرانہ پیش کیے دیکھ سکے۔ میں نے ستر مصری پونڈ ادا کر کے ٹکٹ خریدا اور اندر چلا گیا۔ یہ ایک عام سا کمرہ تھا جس میں گیارہ بادشاہوں کی میتیں ہیں۔ آٹھ لاشیں چاروں طرف کچھ یوں رکھی ہوئی ہیں کہ اُن کے درمیان بچ جانے والی جگہ تین فراعنہ کی لاشیں ہیں۔ وہ تین سب سے اہم ہیں اسی لئے دوسرے بادشاہوں نے انہیں اپنے حصار میں رکھا ہوا ہے۔ آیئے ایک ایک کر کے ان بادشاہوں سے بھی ملیں۔

دروازے کے ساتھ دائیں طرف رکھی ہوئی پہلی میت فراعنہ بادشاہ سقن رع تاعال ثانی کی تھی۔ جس نے مصر پر 1558-1553 ق م کے دوران حکومت کی۔ دراز قد نقش ونگار سندر۔ محسوس ہوتا تھا جیسے یہ کسی مرد کی نہیں بلکہ افریقی عورت کی میت ہے۔ اس کے سفید دانت چمکتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ساتھ آمن ہوتب اول Amenhotp1 کی میت ہے۔ جس پر پھول رکھا ہوا ہے۔ یہ وہی بادشاہ تھا جس کی بیوی نفرتیتی تھی۔ جو حسن کی ملکہ تھی۔ امن تب نے اپنے آباواجداد کے مذہب کو خیر باد کہہ کر متحد دیوتاؤں کی بجائے واحد دیوتا کی پرستش شروع کی تھی۔ اور اپنا دارحکومت بھی عمرانہ نامی شہر میں آباد کیا تھا۔ امن تب کی میت کے ساتھ ٹوتھموسس Tuthmosis اول، دوئم اور سوئم کی میتیں ہیں۔ جنہوں نے 1504 ق م سے 1425 ق م تک مصر پر حکومت کی۔ یہ تینوں بھی افریقی نسل کے نظر آ رہے ہیں۔ ٹوتھموسس سوئم مسکراتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس کی موت پرسکون حالت میں ہوئی۔ ان سب کے چمکتے ہوئے سفید دانت ابھی تک محفوظ ہیں۔ یہاں Amenthotep2 آمن ہوتب دوئم کی میت بھی ہے۔ جس نے 1428-1397 ق م تک حکومت کی۔ اس کی میت دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سخت عذاب میں فوت ہوا۔ سر کھینچا ہوا اور چہرے پر انتہائی کرب کے آثار ہیں۔ جسم پر کھدر کی چادر لپٹی ہوئی ہے۔ ٹوتھموسس پنجم Tuthmosis5 نے 1397-1388 ق م کے دوران مصر پر حکومت کی تھی۔ یہ بھی بڑے عذاب میں مبتلا ہو کر مرا۔ آنکھیں بند منہ کھلا ہوا۔ دانت سامنے نظر آ رہے ہیں۔ جسم پر پٹیاں تھیں۔ یہ سب لاشیں چاروں طرف تھیں۔ درمیان میں فرعون رعمیس اُس کے باپ اور بیٹے کی میتیں ہیں۔ وہی رعمیس جس کی حضرت موسیٰ سے ٹکر رہی۔

درمیان میں پہلی میت سیتی اول Seti کی میت ہے۔ جو رعمیس ثانی کا باپ تھا۔ اس

نے 1290-1279 ق م کے درمیان حکومت کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی موت بھی پرسکون ہوئی۔ سر کے علاوہ اس کا پورا جسم ڈھانپا ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ اسلام کی جس فرعون نے پرورش کی اُس کا نام رعمیس دوئم Ramesess 2 تھا۔ اسی نے فرعون کا لقب اختیار کیا تھا۔ اس سے قبل یہ لقب صرف شاہی خاندان کیلئے مخصوص تھا۔ لیکن بادشاہ فرعون نہیں کہلاتے تھے۔ رعمیس کی میت کا میں نے خصوصی طور پر بغور جائزہ لیا۔ پہلی نظر سے معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ بڑے عذاب میں مبتلا ہوکر مرا۔ اس کی کھینچی ہوئی گردن سامنے نظر آرہی ہے۔ گردن کی نلیاں واضح نظر آتی ہیں۔ سر کے بال درمیان سے غائب اور دونوں طرف کانوں کے اوپر موجود ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گنجا تھا۔ منہ زیادہ کھلا ہونے کی بناء میت حنوط کرنے والوں نے منہ میں کوئی چیز ٹھونس کر اسے بند کرنے کی کوشش کی تھی۔ دائیں طرف کے دانت نظر آرہے ہیں۔ اس کے سر کے بال، ہاتھ اور پاؤں کے ناخن بھی موجود ہیں۔ قد چھ فٹ کا تھا۔ جسم چھریرا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے بیٹے منفتاح Merenpta کی میت ہے۔ جس نے رعمیس کے بعد 1213-1203 ق م کے درمیان حکومت کی۔ اس کے سر کے بال موجود ہیں۔ اوپر کھدر کی چادر ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اسی نے حضرت موسیٰ کا پیچھا کیا تھا۔ اور سمندر میں ڈوب کر غرق ہوا تھا۔ اس واقعہ کو قرآن پاک سورہ یونس آیات 92 میں یوں بیان کیا گیا ہے:

اب تو ہم صرف تیری لاش ہی بچائیں گے تاکہ تو بعد کی
نسلوں کے لیے نشان عبرت بنے اگرچہ بہت سے انسان
ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں سے غفلت برتتے ہیں۔

جب قرآن پاک کی یہ آیات نازل ہوئیں تب سے لیکر گزشتہ صدی تک کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کی میت کو کسی خفیہ مقام پر اپنی حکمت کے تحت محفوظ رکھا ہوا ہے۔ اور کمال کی بات یہ بھی ہے کہ کبھی کسی نے اس بارے میں استفسار بھی نہیں کیا کہ قرآن پاک کے ارشاد کے مطابق وہ میت کہاں ہے؟ اب جب سائنس نے اس قدر ترقی کر لی ہے کہ وہ آثار قدیمہ کے سرمائے کی حفاظت رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو کسی انسان کو یہ سمجھ عطا کردی کہ فلاں مقام کو کھودو۔ الاقصر میں پہاڑیوں کے بیچ کھدائی ہوتی رہی اور آخر یہ میتیں مل گئیں۔ ایسے میں میں سوچتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کا ایمان کامل نہ ہوتا تو ممکن ہے اسی ایک نکتہ پر

کئی مسلمانوں کا ایمان متزلزل ہوتا۔

متکبر فراعنہ کی میتیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے رہتی دنیا کیلئے عبرت کے طور پر محفوظ کیا ہوا ہے کو دیکھا۔ عبرت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ کی واحدنیت پر ایمان اور پختہ ہوا۔ جب میں اس شاہی میت گاہ سے باہر نکلا تو مجھے اللہ کے ان احکامات کو گہرائی میں سمجھنے کا موقع ملا جس میں اللہ تبارک تعالیٰ قرآن پاک میں متعدد بار انسانوں کو ہدایت کرتے ہیں کہ دنیا میں گھومو پھرو اور اُن لوگوں کا انجام دیکھو جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ اگر میں مصر نہ آتا اور فراعنہ کی میتیں اور انکی اعلیٰ شان محلات اور شاہی قبرستان نہ دیکھتا تو مجھے ان متکبر لوگوں کے انجام سے اُس طرح آگاہی نہ ہوتی جس طرح انہیں دیکھ کر آگاہی اور عبرت حاصل ہوئی۔

اَوَلَم یَسِیرُوا فِي الاَرضِ فَیَنظُرُوا کَیف کَانَ عَاقِبَۃُ الَذِینَ مِن قَبلِہِم کَانُوآ اَشَدَمِنھُم قُوَۃً وثَارُوا الارضَ وَعَمَرُوھَآ اکثَرَمِمَا عَمَرُوھَا وَجَآءَ تہُم رُسُلُہُم بِالبیِنتِ فَمِاکَانَ اللہ لِیَظلِمَھُم وَلکِن کَانُوآ اَنفُسَہُم یَظلِمُونَ ۝

کیا یہ لوگ کبھی زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ انہیں اُن لوگوں کا انجام نظر آتا جو اِن سے پہلے گزر چکے ہیں؟ وہ اِن سے زیادہ طاقت رکھتے تھے؟ اُنہوں نے زمین کو خوب اُدھیڑا تھا اور اُسے اتنا آباد کیا تھا جتنا انہوں نے نہیں کیا ہے۔ اُن کے پاس ان کے رسول روشن نشانیاں لے کر آئے۔ پھر اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا، مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔

(سورہ روم آیات ۹ پارہ ۲۱)

آثار مقبرہ توت عنخ آمون

شاہی میت گاہ سے باہر نکلا تو سامنے ایک بہت بڑے ہال میں داخل ہوا۔ جس میں فراعنہ کے مشہور زمانہ بادشاہ توت عنخ آمون کے مقبرے سے نکالی ہوئی چیزیں اس انداز میں

رکھی ہوئی ہیں جیسے وہ مقبرے کے اندر تھیں۔ یہ واحد بادشاہ تھا جس کا مقبرہ لٹیروں سے محفوظ رہا۔ چنانچہ اُس کے مقبرے سے نکالی جانے والی تمام چیزیں اصل حالت میں یہاں موجود ہیں۔ سب سے پہلے میں نے وہ تابوت دیکھا جس میں اس شہنشاہ کی میت تھی۔ لکڑی پر سونے چاندی کے پترے لگے ہوئے ہیں۔ جس کے ساتھ مشہور زمانہ سونے کا وہ ماسک ہے جو حنوط کرنے کے بعد میت کے منہ پر چڑھا دیا گیا تھا۔ یہ سب کا سب خالص سونے کا ہے۔ چیتے کی کھال سے تیار کردہ ایک تختہ تھا جسے تابوت کے اوپر رکھا گیا تھا۔ مٹی کے مرتبان کی شکل کے برتن تھے جو سونے چاندی سے بھرے ہوئے تھے۔ کچھ میں پانی اور شراب بھی بھر کر ساتھ رکھ دیا گیا تھا۔ کرسی خالص سونے کی ہے۔ جس کے بازو کے سامنے شیر منہ کھولے ہوئے ہیں۔ اور پشت پر بادشاہ اور اس کی ملکہ کی ایک تصویر ہے۔ جس میں بادشاہ کو کرسی پر بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ بادشاہ کے پلنگ انتہائی اچھی حالت میں ہیں۔ جو غالباً باریک سوتڑی سے تیار کیے گئے تھے۔ اُن میں دامن نہیں بلکہ سارے کا سارا حصہ سوتڑی سے بنا ہوا ہے۔ پلنگ کے بازو کے آگے شیر منہ کھولے یوں کھڑے ہیں جیسے پلنگ دو شیروں نے اپنی پشت پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ ایک اور پلنگ جس کے پاؤں بیل کے تھے اور سر کے اوپر دونوں سینگوں کے درمیان پلیٹس تھیں۔ یہ پانچ فٹ اونچا تھا۔ جس کے اوپر اور نیچے سامان رکھنے کیلئے جگہ تھی۔ میت کے ساتھ کچھ بچوں کے مجسمے بھی دفن تھے۔ بچوں کے ساتھ بادشاہ کے دیوتاؤں کے مجسمے بھی ملے ہیں جو یہاں رکھے ہوئے ہیں۔ ایک دیوتا انسانی جسم کا اور اوپر شیر کا منہ۔ دوسرے میں سانپ پھن کھلائے کھڑا ہے۔ مور کے پروں کو جمع کر کے لکڑی کی ہتھی لگا کر ایک پنکھا بنایا گیا تھا۔ جو ابھی تک اُسی حالت میں ہے۔

بادشاہوں کے لباس بھی موجود تھے۔ ایک جگہ تہبند دیکھا۔ فرعون تہبند کا استعمال کرتے تھے۔ اس کے کنارے پر انتہائی نفیس نقش نگاری کی گئی تھی۔ کپڑا انتہائی باریک تھا۔ ساتھ جوتے بھی تھے۔ کچھ جوتوں کے تلوؤں کے اوپر بھی نقش و نگاری کی گئی تھی۔ ایک بچے کا موزہ نما جوتا تھا جو ہیرے جواہرات سے بنایا گیا تھا۔ تاج کے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں جن میں گندم، مختلف پھل جس میں کھجور اور انگور کے ساتھ اُس زمانے کے کسی پھل کے کچھ دانے اور پتے بھی ہیں۔ کھانے پینے کیلئے جوار کی تین موٹی موٹی روٹیاں جو دیکھنے میں بالکل مکئی کی روٹی

نظر آتی تھی ایک چنگیر (روٹی رکھنے کیلئے ٹوکری) میں رکھی ہوئی تھیں۔ چنگیر بالکل ویسی ہی تھی جیسے ہمارے ملک میں آج بھی استعمال ہو رہی ہیں۔ روٹی کے ساتھ ایک پلیٹ میں پھگواڑے (انجیر) اور انگور تھے۔ جبکہ ٹرے میں بطخ اور خشک مچھلی تھی۔ کھانے پینے کی اشیاء کے علاوہ موزے، دستانے۔ عبادت یا حلف برداری کے وقت استعمال کی جانے والی چھڑیاں جو کھونڈے کی طرز کی ہیں۔ جن پر سونا چڑھا ہوا ہے۔ ایک بادشاہ لنگڑا تھا وہ سہارے کیلئے سوٹی استعمال کرتا تھا۔ وہ سوٹی بھی اُس کی میت کے ساتھ قبر میں رکھ دی گئی تھی تا کہ دوسرے جنم میں اس کے سہارے چل پھر سکے گا۔ ایک فولڈنگ کرسی بھی موجود ہے۔ ایک اور کرسی جس کے سامنے پاؤں رکھنے کیلئے الگ ایک چھوٹا سا سٹول ہے۔ وہ بھی سونے کا ہے۔ کشتیوں کے ماڈل جن پر مستول لگے ہوئے ہیں۔

شاہی سامان رکھنے کیلئے بڑے بڑے صندوق بھی موجود تھے۔ میں نے ایک صندوق دیکھا جو غالباً سات فٹ اونچا، بارہ فٹ لمبا اور چھ فٹ چوڑا تھا۔ ایک جگہ لوہے کا ایک شکنجا دیکھا۔ یہ فراعنہ کے پلنگ کے سرہانے نصب تھا۔ جس پر وہ گردن رکھ کر آرام سے سوتے تھے۔ اس پر میت کا سر بھی رکھ دیا جاتا تھا۔ اسے دیکھ کر بکاری نے مجھے بتایا کہ صومالیہ کے شتربان ابھی تک اسے استعمال کرتے ہیں۔ جسے صومالی زبان میں برشی Barshi کہتے ہیں۔ شتربان اسے ساتھ رکھتے ہیں۔ صحرا میں جہاں آرام کرنا ہو اسے سرہانے رکھ کر سو جاتے ہیں۔ بکاری حیران تھا کہ جو چیز ہم آج استعمال کرتے ہیں فرعون پانچ ہزار سال پہلے استعمال کرتے تھے۔

شاہی تاج اور زیورات

اسی منزل پر دو الگ کمروں میں فراعنہ کے تاج اور انکی بیگمات کے زیورات بھی موجود ہیں۔ میں اندر گیا تو فرطِ حیرت سے منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اتنا سونا میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سونے کے ڈھیر تھے۔ سونے کے بڑے بڑے ہار، خوبصورت انگوٹھیاں، چوڑیاں، سونے کے گلاس، کھانے کی پلیٹیں۔ سونے کے جوتے، میخیں جو بادشاہ کے تابوت کو لگائی جاتی تھیں۔

میں مسلسل تین گھنٹے یہ عجائب گھر دیکھتا رہا۔ اسے دیکھ کر فراعنہ کا رہن سہن، لباس کھانا

پینا، طرز حکومت، مذہب، موت کے مناظر کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کے رہن سہن کے اتنے واضح ثبوت ملتے ہیں کہ آج کا انسان انہیں دیکھ کر حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ اس قدر کسی بھی تہذیب کے آثار محفوظ نہیں جس طرح فراعنہ کے ہیں۔

عجائب گھر دیکھنے کے دوران جہاں فراعنہ کے ظلم اور جبر کے راز معلوم ہوئے وہاں اُن کاریگروں کو داد دیئے بغیر نہ رہ سکا جن کے فنی کمالات سے فراعنہ کی میتیں ہزاروں سال سے محفوظ ہیں۔ اور اس قدر محفوظ ہیں کہ بعض کے بال، دانت اور ناخن تک صحیح سلامت ہیں۔ نقش و نگاری کپڑوں کی باریکی، جوتوں کے ڈیزائن جن کے رنگ ابھی تک پھیکے نہیں پڑے۔ سونے کے زیورات، تاج، انگوٹھیاں جن میں ہیرے اور موتی جڑے ہیں۔ گلے کے مختلف طرز کے ہار، چوڑیاں، بازو بند، چوڑیاں آج بھی جدید ترین نظر آتے ہیں۔ مختلف قسم کا فرنیچر، سونے کے پلنگ، کرسیاں جو یقیناً فراعنہ کی ایجاد ہے۔

قبر کا تصور فراعنہ کے ہاں وہی تھا جو آج ہمارا ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہ امرا، وُزراء اور دوسرے لوگوں کے مراتب کے مطابق قبریں تیار کرتے تھے۔ جبکہ بادشاہوں کے اہرام بنائے جاتے تھے۔ جن کی بلندی اور وسعت بادشاہ کے مرتبے کے مطابق تیار کی جاتی تھی۔

مذہبی رہنماؤں کی اپنی ایک دنیا تھی۔ اُن کی ٹھاٹھ انوکھی تھی۔ کسان جدید ترین طریقے سے کاشت کاری کرتے تھے۔ ہل، کھیت، بیل اور اُس میں کام کرتے ہوئے کسانوں کے کئی مناظر تصویری شکل میں موجود ہیں۔ مٹی کے بنے ہوئے گھڑے بالکل آج کے زمانے کی مانند۔ مٹکے اور صراحی جن کا منہ تنگ نہیں بلکہ انسان اُس میں ہاتھ ڈال سکتا تھا۔

عجائب گھر میں موجود چیزوں سے فراعنہ دور کی شہری زندگی بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ ان کے تہوار، میلے اور ناچ گانے کے مناظر بھی دیکھے۔ یہ اپنے دیوتاؤں کو خوش کرنے کیلئے ناچ گانے بالکل اُسی طرح کرتے تھے جس طرح ہندو اور چند دوسرے مذاہب میں آج بھی موجود ہے۔ بادشاہ، وُزراء، روساء انتہائی عیاش تھے۔ کثرت سے شراب پیتے تھے۔ شہروں کی کھدائی سے فراعنہ دور کے شراب کے کارخانے بھی دریافت ہوئے ہیں۔ عام لوگوں سے اپنے آپ کو الگ رکھنے کی خاطر اپنی بہنوں، ماؤں اور بیٹیوں کے ساتھ شادیاں کرتے تھے تا کہ شاہی خون اپنے گھر میں ہی رہے۔

شہر کی اہم شاہرات ، مندروں اور دوسری جگہوں پر فراعنہ کے اپنے اور اُن کے دیوتاؤں کے بڑے بڑے بت نصب ہوتے تھے۔ جن میں سے کچھ اسی عجائب گھر میں محفوظ ہیں۔ اہرام کی تعمیر سے لیکر کاشت کاری تک سارے کام مصری لوگ کرتے تھے۔ بڑے ظالم تھے فرعون۔

میرے خیال میں جب تک آپ فراعنہ دور کے شاہی قبرستان، عجائب گھر میں رکھی ہوئی چیزیں دیکھ نہیں لیتے اُس وقت تک آپ فراعنہ کے دور کو مکمل طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ اگر شوق ہے تو جایئے مصر اور اپنی آنکھوں سے اُس تاریخ کو دیکھئے جو پانچ ہزار سال سے آپ کی راہ دیکھ رہی ہے۔



قاہرہ سے الاقصر تک

الاقصر
ویلی آف کنگ
دیرالبحری

قاہرہ سے الاقصر تک

گیزہ، ممفیس، سقارہ اور مصر کا عجائب گھر دیکھنے کے بعد اب ہمیں الاقصر جانا ہے۔ اس شہر کو یہ نام عربوں نے دیا۔ جسے معمول کے مطابق انگریزوں نے بگاڑ کر ''لکسر Luxor'' بنا دیا۔ پہلے اس شہر کا نام تھیبس تھا۔ جہاں کئی سو سال تک فراعنہ کے کروفر رہے۔ یہ شہر اُن کی طاقت کا سرچشمہ اور ممفیس کے بعد پانچ سو سال تک دارالحکومت رہا۔ اس کا عروج 1500 ق م میں اُس وقت ہوا جب مصر کے شمالی علاقے پر چرواہے بادشاہوں نے قبضہ کیا تو فرعون بھاگ کر جنوب میں تھیبس جا پہنچے۔ جہاں انہوں نے ایک نیا شہر آباد کیا۔ جیسے ہی فراعنہ نے دوبارہ طاقت حاصل کی تو غرور اور تکبر میں انہوں نے لوگوں پر ظلم ڈھانے شروع کر دیئے۔ تھیبس شہر نے فراعنہ کے ظلم و جبر کو بڑے قریب سے دیکھا۔ اس خطہ کے دریا، پہاڑ، صحرا سب فراعنہ کے مظالم کے گواہ ہیں۔ فرعون کتنے ظالم اور جابر تھے۔ اس کا اندازہ قرآن پاک کی اس آیات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوسٰی اِلَا ذُرِیَۃٌ مِن قَومِہٖ عَلٰی خَوفٍ مِن
فِرعَونَ وَمَلَا ءِ ھِم اَن یَفتِنَھُم وَاِنَ فِرعَونَ لَعَالٍ فِی
الاَرض وَاِنَہ لَمَنَ المُسرِفِینَ 0

(پھر دیکھو کہ) موسیٰ کو اس کی قوم میں سے چند نوجوانوں کے سوا کسی

نے نہ مانا، فرعون کے ڈر سے اور خود اپنی قوم کے سر برآوردہ لوگوں کے ڈر سے (جنہیں خوف تھا کہ) فرعون ان کو عذاب میں مبتلا کرے گا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ فرعون زمین میں غلبہ رکھتا تھا اور وہ اُن لوگوں میں سے تھا جو کسی حد پر رکتے نہیں ہیں۔

(سورہ یونس آیات 83)

آخر فراعنہ کا دور کچھ اس طرح ختم ہوا۔ کہ آج دنیا بھر کے لوگ اُن جابر اور قہار فراعنہ کی لاشوں کو عجائب گھروں میں دیکھ کر عبرت حاصل کرتے ہیں۔ یہ اللہ کا وعدہ بھی ہے۔ اوپر سورہ یونس میں دور فراعنہ کے ظلم و جبر اور عام لوگوں پر فرعون کا رعب اور خوف کو بڑے واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ بالکل یہی صورت حال آج کے دور میں بھی ہے۔ مسلمان نوجوان تو ظالم اور قہار حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں لیکن فرعون وقت کے خوف سے ہمارے لیڈران قوم کانپ رہے ہیں اور پھر اپنی نوجوان نسل کے اندر بھی یہ خوف پھیلا رہے ہیں۔ لیکن ایسے میں فرعون وقت اور دنیا کے ''جھولی چک'' لیڈر جو اُس کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں وہ ممکن ہے فرعون مصر کے انجام پر غور نہیں کرتے اگر غور کیا ہوتا تو آج دنیا میں اس قدر اندھیر گردی نہ ہوتی۔ اِن حالات میں روشن صدی کے خواب دیکھنے والے جانثاروں کی قربانیوں کو دیکھتے ہوئے میں علامہ اقبال کی طرح میں یہی سوچتا ہوں کہ:

اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

آج جب ہم فراعنہ کی تین ہزار سالہ تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ زمانہ ایک پل میں گزر گیا۔ جب کہ حقیقت میں اُس زمانے کا ایک ایک لمحہ بھی صدیوں پر بھاری تھا۔ کھنڈرات سے ملنے والی سونے چاندی اور زندگی کی آسائش کی چیزیں دیکھ کر ہم یہی اندازہ لگا سکتے ہیں فرعون غریبوں کا خون چوس چوس کر اپنے مقبروں میں دولت کے انبار لگاتے رہے تا کہ دوسرے جہاں میں کام آسکے۔ لیکن وہ دولت نہ اُن کے کام آسکی اور نہ اُن غریبوں کے جن پر ظلم کے پہاڑ ڈھا کر دولت جمع کی گئی تھی۔ اگر چہ اب فراعنہ کا دور نہیں لیکن پھر بھی کچھ ملکوں کے حکمران فراعنہ کے نقش وقدم پر چلتے ہوئے ملکی دولت دونوں ہاتھوں سے لوٹ کر بیرون

ملک بنکوں میں جمع کرواتے ہیں تاکہ مسند سے محرومی کے بعد وہ دولت کام آئے۔

الاقصر قاہرہ سے سات سو کلو میٹر کی مسافت پر ہے۔ یہ سفر ہم نے ریل گاڑی میں طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ قاہرہ کے مرکزی ریلوے سٹیشن رعمیس سے الاقصر کیلئے ریل کے فرسٹ کلاس ٹکٹ خریدنے لگے تو قیمت سن کر میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ سات سو کلو میٹر ایک طرف اور سات سو واپسی کے یعنی کل چودہ سو کلو میٹر سفر فرسٹ کلاس میں طے کرنے کا کرایہ 130 مصری پونڈ تھے۔ یعنی تیرہ برطانوی پونڈ۔ ہمارے لئے یہ بہت رعایت تھا۔ برطانیہ میں اتنے پیسے سے ہم بامشکل دس میل کا سفر فرسٹ کلاس میں طے کر سکتے ہیں۔

جب میں اور بکاری ٹکٹ خرید رہے تھے۔ تب منیر حسین اِدھر اُدھر گھوم پھر کر کسی زلیخا کی تلاش میں تھے۔ میں ٹکٹ خرید اکر واپس پلٹا تو منیر حسین کا چہرہ کھل کھلا رہا تھا۔ ہونٹوں پر مسکرائٹیں یعنی مسکڑیاں ہی مسکڑیاں۔ میں نے اس چہک مہک کی وجہ پوچھی تو بولے: ''بادشاہوں آپ سے دل کی بات کرتے بھی ڈرتا ہوں۔ کئی آپ اپنے سفر نامہ میں نہ لکھ دیں''۔ میں نے اپنی طرف سے تسلی دی۔ تو بولے: ''میں نے ابھی زلیخا کو دیکھا ہے۔ وہی صورت وہی ناز و انداز اور وہی چال۔'' میں نے پوچھا کہاں ہے۔ انہوں نے ایک طرف اشارہ کیا۔ لیکن اُس وقت زلیخا ہجوم میں کہیں گم ہو گئی تھی۔ یوں میں زلیخا کے دیدار سے محروم رہا۔

قاہرہ سے گاڑی رات دس بجے چلتی ہے۔ جو رات بھر سفر کے بعد صبح سات بجے الاقصر پہنچتی ہے۔ ہم دن بھر گھومتے پھرتے رہے۔ رات ساڑھے نو بجے ریلوے سٹیشن پہنچے تو گاڑی کھڑی تھی۔ ہم اپنے کمپارٹمنٹ میں جا بیٹھے۔ جہاں چھ مسافروں کیلئے جگہ تھی۔ ہم چار تھے ۔ یوں دو مسافر مزید ہمارے ساتھ بیٹھ سکتے تھے۔ ابھی ہم نے اپنا سامان رکھا ہی تھا کہ دیکھا ایک میم صاحبہ سامان سے لدی پھندی ہمارے کمپارٹمنٹ میں آن گھسی۔ آتے ہی اُس نے بات کی تو وہ میرے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ سوچا دو چار دن ولایت سے باہر رہنے سے ممکن ہے میں انگریزی بھول گیا ہوں۔ یہ سوچ رہا تھا کہ ہمارے ساتھی بکاری نے ٹک ٹک بولنا شروع کر دیا۔ پتہ چلا کہ دونوں اطالوی زبان میں باتیں کرر ہے ہیں۔ یہ محترمہ ہسپانوی تھی۔ بکاری نے ٹکٹ دیکھ کر اُسے بتایا کہ تمہاری نشست دوسرے کمپارٹمنٹ میں ہے۔ اور پھر بکاری نے اُس کا سامان اٹھایا اور ساتھ والے کمپارٹمنٹ میں اُسے چھوڑ کر واپس آ گیا۔

ٹھیک دس بجے گاڑی قاہرہ کے ریلوے سٹیشن سے روانہ ہوئی۔ وقت کی پابندی دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ورنہ میرے ذہن میں تو وطن عزیز میں چلنے والی ریل گاڑیوں کا نقشہ تھا۔ گاڑی ابھی چلی ہی تھی کہ وہ ہسپانوی دوشیزہ ہنستی مسکراتی بل کھاتی ہمارے کمپارٹمنٹ میں دوبارہ آ گئی۔ اور انگریزی میں باتیں کرنے لگی۔ ہمیں بتانے لگی کہ میرے ساتھ ایک عرب فیملی آ کر بیٹھ گئی ہے۔ میں اُن سے عربی میں بات چیت تو کر سکتی نہیں۔ سوچا بہتر ہے آپ لوگوں کے ساتھ باتیں کروں۔ یہ کہہ کر اُس نے خود ہی ایک سیٹ سنبھال لی اور باتیں شروع کر دیں۔ اس کا نام مریامہ خشوش تھا۔ اور ہسپانیہ کے ایک ہسپتال میں ملازمت کرتی تھی۔ سیر وسیاحت اُس کا مشغلہ تھا۔ ہر سال دس ماہ ڈٹ کر کام اور پھر دو ماہ ڈٹ کر سیر۔ سیر وسیاحت سے اس قدر پیار کرتی تھی کہ اپنے دل میں کسی مرد کو گھسنے ہی نہیں دیا۔ اگر کوئی آیا بھی تو ایسے ہی جیسے کوئی مسافر۔ جو رات بسر کرنے کے لئے کمرہ کرائے پر لیتا ہے۔ اور صبح اپنی منزل کی طرف چلا جاتا ہے۔ مریامہ ہنس مکھ تھی اور ہاتھ ہلا ہلا کر باتیں کرنے کی عادی تھی۔ سنا ہے۔ ہسپانوی عورتیں زبان کے ساتھ ساتھ ہاتھوں سے بھی کام لینا اچھی طرح جانتی ہیں۔ مریامہ نے سیاحتی زندگی کا آغاز برطانیہ سے کیا تھا۔ تب وہ 23 سال کی تھی۔ اس کا برطانیہ جانے کا تجربہ اچھا نہیں رہا۔ برطانوی لوگ اسے مغرور اور کم گو محسوس ہوئے۔ جو اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مریامہ امریکہ بھی نہیں گئی چونکہ امریکی بھی مغرور اور دنیا کو فتح کرنے کی فکر میں ہیں۔ اپنے تجربے کی روشنی میں مریامہ کہنے لگی میں برٹش اور امریکی لوگوں سے نفرت کرتی ہوں۔ نفرت!

میں نے چھیڑتے ہوئے کہا مریامہ: ''ہم بھی تو برٹش ہیں۔'' اس پر مریامہ نے ایک دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ آنکھ مارتے ہوئے کہا آپ تو میرے اپنے ہیں۔ اور پھر ایک زور کا قہقہ لگاتے ہوئے بے تکلف دوستوں کی طرح میرے ہاتھ پر اس زور سے ہاتھ مارا کہ کافی دیر مجھے اس کا درد محسوس ہوتا رہا۔

یہ سچ ہے کہ ''حسن زن سے ہے کائنات میں رنگ'' مریامہ نے ہمارے مردانہ ماحول میں صنف نازک کی کچھ اس طرح خوشبو پھیلائی کہ ہمارے روکھے اور خشک ماحول کو اپنی آمد سے معطر کر دیا۔ رنگ برنگی ہر موضوع پر کھلم کھلی باتیں اور قہقہوں سے ہمارے کمپارٹمنٹ میں گرمی پیدا ہونے لگی۔ چند منٹ پہلے سردی سے ہمارا برا حال تھا۔ ہم نے گاڑی میں ہیٹر آن کیا

تھا۔لیکن مریامہ کی آمد سے ماحول میں کچھ اس طرح کی گرمی پیدا ہوئی کہ اس نے پہلے اپنا کوٹ اتار کر سیٹ پر رکھا، پھر سویٹر اتاری، قمیض اُتارنے والی تھی کہ بکاری نے اٹھ کر ہیٹر بند کیے اور کھڑکی کھول دی ۔مریامہ ان باتوں سے بے نیاز مشین کی طرح باتیں کر رہی تھی۔ جب انگریزی بولتے بولتے تھک جاتی تو اطالوی میں بکاری سے باتیں شروع کر دیتی۔ بکاری اُس سے باتیں کر کے بلیوں اُچھلتا۔ بکاری کا راستہ روکنے کیلئے منیر حسین انگریزی میں باتیں کرتے تو بکاری اپنی منقار زیر پر کر کے یوں پریشان ہوتا جس طرح مور اپنے پاؤں دیکھ کر پریشان ہوتا ہے۔ میں اور آزاد صاحب دو عاشقوں کے درمیان ایک محبوبہ کو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے دیکھ رہے تھے۔ ایک موقع ایسا آیا کہ مریامہ سے دونوں صاحبان شکست کھاتے نظر آئے ایسے میں یعقوب آزاد میدان میں اُترے اور اپنی خاص ادا سے مریامہ کا دل موم کرنے کی کوشش کی۔

یعقوب آزاد بولے: ''مریامہ یہ آپ کا نہیں میرا قصور ہے کہ میں تمہیں سمجھنے میں ناکام رہا۔ تم تو خواتین کی رول ماڈل ہو۔ جو اکیلی ہسپانیہ سے چل کر دور دراز کے ملکوں میں اکیلی گھومتی پھرتی ہو۔ تم بہت حسین ہو۔ تمہاری دلفریب باتوں نے مجھ پر کچھ ایسا جادو کیا کہ میں بولے بغیر نہ رہ سکا۔'' حسن کی تعریف سن کر مریامہ کا دل موم کی طرح پگھلنے لگا۔ چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ تیر نشانے پر لگا ہے ۔ یوں اپنی تعریف کی لپیٹ میں آ کر مریامہ نے شکست کھائی تو آزاد صاحب نے سینہ تان کر کہا: ''منیر حسین اور حاجی بکاری آپ دونوں تو اس ہسپانوی دوشیزہ کو رام نہ کر سکے لیکن میں اکیلا ہی اسے رام کرنے میں کامیاب ہو گیا ہو۔'' آزاد صاحب کی باتیں سن کر مجھے غالب یاد آنے لگے:

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ میرے آگے

منیر حسین اور بکاری نے شکست مان لی چونکہ وہ سونا چاہتے تھے۔ لیکن مریامہ ہمارے کمپارٹمنٹ سے جانے کا نام نہیں لیتی تھی۔ ہمیں رنگ رنگ کی باتیں، سیاحت کے تجربات اور اس دوران مختلف مردوں کے ساتھ حسین لمحے گزارنے کے واقعات کی جذیات تک سناتی رہی۔ رات تین بجے تک میں آنکھیں بند کیے اور کان کھول کر ان کی باتیں سنتا رہا لیکن پھر میری ہمت جواب دے گئی اور مجھے گہری نیند نے شکست دیکر اپنی آغوش میں لے لیا۔ مریامہ نے رات کس

کی آغوش میں بسر کی اس کا مجھے پتہ نہیں!

صبح چھ بجے سورج کی روشنی نے مجھے بیدار کیا۔ باہر دیکھا تو سورج کی کرنیں سرسبز کھیتوں کو چھو رہی تھیں۔ مجھے دریائے نیل کے کنارے سرسبز کھیتوں میں کسان کام کرتے نظر آئے۔ کوئی اپنی کھوتی (گدھی) پر سبزہ لاد رہا تھا۔ تو کہیں کوئی عورت سر پر لسی کا گڈوا (برتن) اور روٹی اٹھائے خاوند کیلئے ناشتہ کھیت میں لے جا رہی تھی۔ کچھ گھروں کے باورچی خانوں سے دھواں اٹھتا نظر آ رہا تھا۔ ممکن ہے کوئی عورت اپنے بچوں کیلئے ناشتہ تیار کرنے کیلئے چولہے میں آگ جلا رہی ہو۔ ایک جگہ ایک صاحب اپنی بھینسوں کا دودھ نکال رہے تھے۔ ساتھ اس کی بیوی مال مویشی کو چارہ ڈال رہی تھی۔ ایک صحن میں مرغے اور مرغیاں چر چگ رہے تھے۔ ایک عورت گھر کے قریب بھینس کے گوبر سے اوپلے بنا کر دیوار پر لگا رہی تھی۔ ایک بڑھیا ہاتھ میں سوٹی لیے کھیت کے بیچ میں سے گزر رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر ایک بدو کھیت میں بیٹھا اپنا معدہ خالی کرنے میں مصروف تھا۔

اس طرح کے مناظر دیکھتے سفر کرتے گاڑی الاقصر کے قریب پہنچی تو مسافروں نے اپنا اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ گاڑی آہستہ آہستہ الاقصر کے ریلوے سٹیشن پر آ کر رک گئی۔ مسافروں نے اپنا اپنا سامان اٹھایا اور گاڑی سے اُتر گئے۔

الاقصر Luxor

یہ ایک عام سا ریلوے سٹیشن تھا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ الاقصر بڑا شہر اور اُس کا ریلوے سٹیشن بھی بڑا ہو گا۔ لیکن یہ مجھے جہلم کے سٹیشن جیسا لگا۔ یہاں کوئی خاص رونق میلہ نہیں تھا اور نہ وطن عزیز کی طرح خوانچہ والے نظر آئے۔ لال قمیض پہنے قلی بھی غائب تھے۔ ہاں اگر کوئی تھا تو وہ تھے سوٹڈ بوٹڈ فر فر انگریزی، فرانسیسی، اطالوی اور ہسپانوی بولتے گائیڈ۔ گاڑی سے اُترتے ہی یہ مسافروں کو گھیر لیتے ہیں۔ ہم نو گھنٹے سفر کے بعد ریل سے اُترے ہی تھے کہ اُن گائیڈز نے ہم پر ہلہ بول دیا۔ اس اچانک حملے سے ہم بوکھلا گئے۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ ایک گائیڈ مجھے کھینچ رہا ہے تو دوسرا یعقوب آزاد کو اور تیسرا امیر صاحب کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ مجھے فکر تھی کہ اس کھینچا تانی میں کہیں میرے کپڑے نہ پھٹ جائیں اور اگر ایسا ہو گیا تو پھر ننگا فراعنہ کے مقبروں کی سیر کیسے کروں گا۔ اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ شاہی مقبروں میں اگر نفرتیتی

سے ملاقات ہوجائے۔تو ایک معزز سیاح کو ننگ دھڑنگ دیکھ کر وہ کیا سوچے گی۔ بکاری سے گائیڈ بات نہیں کر رہے تھے۔اُس کی وجہ غالباً یہی تھی کہ بکاری نے جب عربی میں باتیں شروع کیں تو گائیڈ سمجھ گئے ان تلوں میں تیل نہیں۔

ہم گائیڈز سے ہاتھا پائی کرتے سٹیشن سے باہر نکلے تو تانگے قطاروں میں کھڑے تھے۔ کچھ کوچوان گھوڑوں کو چارہ ڈالتے ہوئے دوسرے کوچوانوں سے باتیں بھی کرتے اور گاہکوں پر نظر بھی رکھے ہوئے تھے۔سٹیشن کے سامنے ایک چھوٹا سا چوک ہے۔ جو غالباً شہر کا واحد مرکزی چوک ہے۔

ہم شہر کو دیکھنے آئے تھے۔لیکن گائیڈز نے ہماری ''مت مار'' دی تھی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ان سے جان چھڑانے کی خاطر کسی ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پی جائے۔ ابھی ہم نے بات ہی کی تھی کہ انہوں نے ہمیں چائے پینے کیلئے اچھے ہوٹلوں کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ ہم تنگ آ کر ریلوے سٹیشن کے قریب ہی ایک غریب نواز ہوٹل میں بیٹھ گئے۔ چند گائیڈ بھی ہوٹل کے باہر بیٹھ گئے کچھ گدھوں کی طرح اِدھر اُدھر گھوم پھر کر ہم سے بات کرنے کے بہانے تلاش کرتے تا کہ وہ اپنی چرب زبان سے ہمیں رام کر سکیں۔ ہماری طرف سے مسلسل سرد مہری کی وجہ سے وہ مایوس ہوئے اور کسی نئے شکار کی تلاش میں چلے گئے۔

ناشتہ کے بعد تھوڑا ہوش آیا۔ ہم تازہ دم ہو کر ہوٹل سے باہر نکلنے اور دریائے نیل کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ ابھی چند قدم ہی چلے تھے کہ الاقصر کا مندر نظر آنے لگا۔ جس کے ساتھ دریا نیل ایک حسینہ کی مانند خراماں خراماں بہہ رہا تھا۔ ہم دریا کے کنارے کھڑے ہوئے۔ تو دیکھا دریا کا گھاٹ بہت بڑا ہے۔ میں نے زندگی میں کسی دریا کا اتنا بڑا گھاٹ نہیں دیکھا تھا۔ دریائے سندھ، دجلہ اور فرات سے بھی بڑا۔ اس کی چوڑائی نصف میل سے کسی بھی صورت کم نہیں تھی۔ روز اول سے آج تک اس پر پل تعمیر نہیں ہو سکا اور ممکن ہے ابھی اور سو سال تک یہ کام نہ ہو سکے۔ فراعنہ نے اہرام اور ابوالہول بنوائے لیکن وہ بھی اس دریا پر پل تعمیر کرنے میں ناکام رہے۔

الاقصر کا شہر فراعنہ کے دور میں کتنا بڑا تھا یہ بتانا مشکل ہے۔ آج کا شہر جو میں نے دیکھا اُسے اگر قصبہ کہیں تو بہتر ہوگا۔ اس کی چوڑائی ایک میل سے زیادہ نہیں۔ ایک طرف

ریلوے سٹیشن ہے جس کے سامنے کل پانچ گلیوں پر مشتمل یہ شہر آباد ہے۔ شہر کے مرکز میں الاقصر کا مندر ہے۔ اور ساتھ دریا نیل بہہ رہا ہے۔ دریا نیل کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف جائیں تو تقریباً دو میل کے فاصلہ پر کارنک کے مندر کے کھنڈرات ہیں۔ یہ شہر کے آخر میں واقع ہے۔ یوں شہر کی لمبائی بھی ڈھائی تین میل سے زیادہ نہیں۔ لوگوں کا ذریعہ معاش سیاحت ہے۔ جنوب کی طرف اب چند جدید ہوٹل تعمیر ہوئے ہیں۔ بازار پرانی اور بوسیدہ دکانوں پر مشتمل ہے۔ مقامی لوگوں کا لباس مصری طرز کے لمبے کرتے ہیں۔ لوگ بالکل پینڈو نظر آتے ہیں۔ قاہرہ شہر میں جو ماڈرن لوگ نظر آتے ہیں اُن کا اس شہر میں فقدان ہے۔ تانگے اور ٹیکسی کی سروس کے علاوہ دریا میں کشتی رانی بھی ایک بڑا کاروبار ہے۔

دریائے نیل کے کنارے الاقصر کی عبادت گاہ ہے۔ ہم نے اس کا جائزہ لیا تو ایک بڑے قطعہ اراضی پر اس کے کھنڈرات پھیلے ہوئے دیکھے۔ ایک ایسی عبادت گاہ جس کی فراعنہ دور میں بڑی اہمیت رہی۔ اس عبادت گاہ کو رعمیس ثانی نے تعمیر کیا تھا جو آمن کے کارنک ٹمپل کی بہن تصور کیا جاتا تھا۔ فراعنہ کے دیوتاؤں کے رشتہ دار بھی ہوتے تھے یعنی اُن کی ماں، بہن، بھائی جن کے ملک کے مختلف حصوں میں عبادت گاہیں تعمیر کی جاتیں تھیں۔ الاقصر کی اس عبادت گاہ کے مین گیٹ پر رعمیس دوم کے دو بڑے بڑے مجسمے دائیں اور بائیں نصب ہیں۔ ان مجسموں میں رعمیس کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ عبادت گاہ کے مختلف حصے تھے۔ رعمیس کا کورٹ یارڈ اب بھی موجود ہے۔ بڑے بڑے پتھروں سے تعمیر ہونے والا یہ مندر بہت اونچا تھا۔ عمارت انتہائی پرشکوہ تھی۔ ستونوں پر انتہائی اعلیٰ قسم کی نقش نگاری کی گئی ہے۔ اور اس عبادت گاہ اور فراعنہ کے بارے میں مختلف کہانیاں در و دیوار پر لکھی ہوئی ہیں۔

الاقصر کے شمال میں شہر کے آخری کنارے پر کارنک کے مندر کے کھنڈرات ہیں۔ اس کی اہمیت سب سے زیادہ تھی۔ اور تقریباً ڈیڑھ ہزار سال تک اس کی مرکزی حیثیت کو تسلیم کیا جاتا رہا۔ 980 ایکڑ قطعہ ارضی پر پھیلی ہوئی یہ عبادت گاہ فراعنہ کے امن دیوتا کا مندر کہلاتا تھا۔ یہ عبادت گاہ ہی نہیں تھی بلکہ اس میں پوری دنیا آباد تھی۔ ہر فرعون نے اس کی حیثیت کو تسلیم کیا اور پھر اس میں اضافی عمارتیں تعمیر کیں۔ اس کے ستون، دیواریں بلکہ چھت کے اوپر بھی نقش و نگار اور قدیمی زبان میں تحریریں لکھی ہوئی ہیں۔ دیواروں پر جو نقش و نگار ہیں وہ تصویری کہانیاں

ہیں۔ یہاں بڑے بڑے سکالر موجود رہتے تھے جو مذہبی تعلیم دیتے تھے۔ بادشاہوں کی تاج پوشی یہاں ہوتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مندر طاقت کا سرچشمہ تھا۔ اس کا صدر دروازہ 141 فٹ اونچا اور 425 فٹ چوڑا تھا۔ اس سے بخوبی اس عبادت گاہ کی وسعت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ صدر دروازے سے اندر داخل ہونے پر چاروں طرف کھلے دلان تھے۔ جس کے بعد ایک اور گیٹ تھا اسی طرح مختلف گیٹ گزرنے کے بعد مرکز میں فراعنہ کے سب سے بڑے دیوتا کا بت رکھا ہوا تھا۔ وہاں تک بادشاہوں، شاہی خاندان، وزرا اور پادریوں کو رسائی حاصل تھی۔ عوام تو بس اس عبادت گاہ کے باہر سے گزر جاتے تو اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتے تھے۔

الاقصر اور کارنک کی عبادت گاہوں کے قریب شاہی محلات تھے۔ جن کے اب کھنڈرات بھی موجود نہیں۔ دریا نیل کے اُس پار فراعنہ کے قبرستان تھے۔ بادشاہوں کیلئے الگ قبرستان تھا جو اب ویلی آف کنگ کے نام سے مشہور ہے۔ اسی طرح شاہی خاندان کی خواتین اور ملکائیں الگ قبرستان میں دفن تھیں۔ یہ قبرستان اب ویلی آف کوئین کہلاتا ہے۔ وُزراء اور روساء کا الگ اور کاریگروں کا الگ قبرستان تھا۔ ان قبرستانوں کے ساتھ ساتھ کچھ مندر بھی تھے جہاں میت کی آخری رسومات ادا کی جاتی تھی۔ ان چیزوں کو دیکھنے کیلئے آیئے دریا نیل کے پار چلتے ہیں۔

ویلی آف کنگ

الاقصر کے مندر کے قریب سے بڑی بڑی دومنزلہ سٹیمر نما کشتیاں ہیں۔ جن کے ذریعے لوگ دریائے نیل کو عبور کرتے ہیں۔ ہم نے ٹکٹ خریدے اور ایک بڑی جہاز نما کشتی میں بیٹھ گئے۔ ہمارے ساتھ کچھ مصری بھی اس کشتی میں سوار تھے۔ جوں ہی ہم دوسرے کنارے پر اُترے تو ہمارے ساتھ سفر کرنے والے ایک صاحب نے کہا کہ میں ریلوے سٹیشن سے آپ کے ساتھ ساتھ اس آس پر سفر کررہا ہوں کہ آپ میری گاڑی میں بیٹھیں گئے۔ ہمیں اس پر ترس آیا۔ یوں بھی ہمیں یہ معقول آدمی نظر آیا۔ جس نے نہایت مناسب دام بتائے۔ ہم اس کی ٹیکسی میں بیٹھے اور ویلی آف دی کنگ کی طرف چل پڑے۔

دریا کے دوسری طرف بھی علاقہ ہموار تھا۔ سڑکیں موجود تھیں۔ دریائے نیل کو عبور

کرنے کے لئے کوئی پل نہیں۔ چنانچہ دریا کے پار جو گاڑیاں کھڑی ہوتی ہیں وہ وہاں ہی رہتی ہیں۔لوگ کشتیوں یا سٹیمر کے ذریعے دریا پار کر کے جب دوسری جانب جاتے ہیں تو وہاں کھڑی گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی اپنی گاڑیاں دریا کے اُس پار کھڑی کر کے دوسرے کنارے جا کر ریلوے سٹیشن یا دوسری جگہوں سے مسافروں کو اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ہم نے سفر شروع کیا تو دور بھوری پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ ہمیں اُن ہی پہاڑیوں میں جانا تھا۔

دریا نیل کے دوسرے کنارے نیوقرنہ نامی گاؤں ہے۔ نیو اس لئے کہ پرانا قرنہ ویلی آف دی کنگ میں واقع ہے جہاں فراعنہ کے زمانے میں دستکاروں کی بستی ہوتی تھی۔ یہاں سے ہم ویلی آف دی کنگ کی طرف جانے لگے تو سڑک کے دائیں طرف دو بڑے بڑے مجسمے دیکھے۔جن کے اردگرد ہرے بھرے کھیت تھے۔ان کھیتوں کے درمیان یہ دو مجسمے ٹمپل آف امن فس سوئم کے مندر کے ہیں۔ باون فٹ بلند یہ دیو ہیکل مجسمے میمنون بادشاہ کے ہیں جو اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اس مقام پر کبھی امنوفس سوئم کا مندر تھا۔کھیتوں کے درمیان سے ایک پختہ سڑک کے ذریعے ہم ویل آف دی کنگ کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں سیتی اول کا مندر کے کھنڈرات بھی دیکھے جسے رعمیس دوئم نے مکمل کیا تھا۔اس مندر کے باہر رعمیس کے ساٹھ ساٹھ فٹ اونچے مجسمے تھے۔جن کا وزن نو سوٹن تھا۔ آفات زمانہ اور زوردار زلزلہ سے یہ مجسمے ٹوٹ گئے۔جن کے کچھ حصے اب بھی وہاں پڑے ہوئے سیاحوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ جب میں ان مجسموں کو دیکھ رہا تھا تب مجھے انگریزی کے مشہور شاعر شیلے کی ایک نظم بہت یاد آئی۔ جس میں شیلے لکھتے ہیں کہ:

Ozymandias

میری ملاقات ایک سیاح سے ہوئی
جو ایک قدیمی ملک کا باشندہ تھا
اُس نے مجھے بتایا کہ
جسم سے الگ بڑی بڑی ٹانگیں ایک صحرا میں کھڑی ہیں
اُن کے نزدیک ریت میں آدھا دھنسا ہوا ایک چہرہ ہے

جس کی آنکھوں سے خفگی ظاہر ہے
ہونٹوں پر شکن پڑے
جو حکم دینے سے معذور ہیں
وہ تراشا ہوا پتھر کا ایک صنم ہے
زندہ لوگ اس کے جذبات سمجھتے ہیں
زندگی سے محروم ان چیزوں پر کچھ لکھا ہوا ہے
ہاتھ جیسے کسی کی نقل اُتار رہے ہوں
اور دل جیسے اُنہیں سہارا دے رہا ہے
پیدل چلنے والوں کو یہ کہتے ہیں کہ
میرا نام اوزی مینڈلیس ہے
بادشاہوں کا بادشاہ
میرے کارنامے دیکھیں
میری ہمت اور پریشانی
کوئی بھی میرے پیچھے نہیں رہی
اُس قدیمی بڑے مجسمے کے اردگرد کی خرابی
بکھری ہوئی اور خالی خالی
اکیلا زمین پر پڑا ہوا
بہت دور تک پھیلا ہوا ہے

یہ مجسمے جس مندر کے کھنڈرات میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ شاہی میتوں کی آخری رسومات کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اور یہاں قریب ہی وہ جگہ تھی جہاں دور فراعنہ میں لاشوں کو حنوط کیا جاتا تھا۔

دریائے نیل کے کنارے سے تقریباً پانچ میل کا سفر طے کر کے ہماری گاڑی بھوری ریت کے ٹیلوں تک پہنچی تو ڈرائیور نے گاڑی دائیں ہاتھ موڑ دی۔ تقریباً ایک میل کا سفر ہم نے دو پہاڑیوں کے درمیان کیا تو گاڑی پہاڑیوں کے درمیان ایک کار پارک میں کھڑی کر دی گئی۔

یہ ویلی آف دی کنگ کا آغاز ہے اوراس کے آگے کسی بھی گاڑی کو جانے کی اجازت نہیں۔کار پارک کے دونوں طرف سٹال تھے جن پر مصری لوگ اپنی پرانی تہذیب کی مناسبت سے چیزیں فروخت کرنے میں مصروف تھے۔ آج مارچ کی پانچ تاریخ تھی۔ میں نے دھوپ سے بچنے کیلئے ایک پی۔کیپ خریدا۔

ویلی آف دی کنگ یا وادی الملوک سرخ ریت کے ٹیلوں کے درمیان میں ایک نالے کی مانند ہے۔پہلی نظر دیکھنے پر مایوسی ہوتی ہے کہ ان ٹیلوں کے درمیان کچھ بھی نہیں۔یہ ٹیلے بالکل ایسے ہی ہیں جیسے میرپور کا نیا شہر آباد کرنے سے قبل بلاہ گالہ میں ٹیلے تھے۔ بلکہ اب بھی شہر سے بن خرماں کی طرف پہاڑی کے دامن میں اس طرح کے ٹیلے دیکھے جاسکتے ہیں جنہیں مقامی لوگ پببی کہتے ہیں۔

ویلی آف کنگ کے ان ویران ٹیلوں کے دامن میں تقریباً ستر مقبرے ہیں۔یہ بالکل ایک گھاٹی ہے۔اس کے دائیں بائیں دونوں طرف آپ چھوٹے چھوٹے گیٹ دیکھیں گئے۔ جن کے باہر جس بادشاہ کا مقبرہ ہوتا تھا۔اُس کی تفصیلی لکھی ہوئی ہے۔ ہم سب سے پہلے رعمیس دوم کے باپ کے مقبرے کے اندر گئے۔اس مقبرے کا نمبر 17 تھا۔باہر سے یہ تنگ تھا لیکن جوں ہی ہم اندر داخل ہوئے تو ایک سرنگ نما راستہ اندر ہی اندر جارہا تھا۔اس سرنگ نما راستے کے دائیں بائیں اور چھت پر خوش نما پھول بوٹے اور فراعنہ کے دور کی زبان ہیروغلافی Hieroglyphic میں تعریفی کلمات لکھے ہوئے تھے۔یہ سرنگ ایک کمرے پر جاختم ہوتی تھی اُس کمرے میں بھی بہت ہی نقش ونگار تھے۔فراعنہ کے دیوتاؤں کے بڑے بڑے بت رکھے ہوئے تھے۔اس طرح ایک کمرے کے بعد دوسرا کمرہ آجاتا تھا۔درمیان میں ایک جگہ ایسی تھی جس کے دونوں طرف زمین سے اوپر خوبصورت کمرے تھے۔ جہاں جانے کے لئے اوپر چڑھنا پڑتا تھا۔پھر دائیں مڑکر آگے وہ کمرہ تھا جہاں کسی زمانے میں بادشاہ کی میت رکھی ہوئی تھی۔یہ مقبرہ زیرزمین اندر ہی اندر تین سوفٹ تک چلاجاتا ہے۔

مقبرے زیرزمین ہونے کی بنا اندر سے ٹھنڈے تھے جبکہ باہر وادی میں بہت گرمی اور دھوپ تھی۔سینکڑوں سیاح جن میں اکثریت یورپ سے آئی ہوئی تھی ایک ایک مقبرے کو بڑے غور سے دیکھتے تھے۔یہ مقبرے جو زیرزمین غاروں میں بنئے ہوئے ہیں اندر سے اُن کی

بناوٹ ایک جیسی ہے۔ صرف کسی میں نقش ونگار زیادہ ہیں تو کسی میں کم۔ اوراسی طرح دیواروں پر لکھی ہوئی تاریخ یا اُس زمانے کی کہانیاں اور بادشاہوں کی فتوحات کے بارے میں مکمل تفصیلات تھیں۔

رعمیس دوئم کے مقبرے میں اُس کی جنگی فتوحات کے بڑے بڑے واقعات لکھے ہوئے ہیں۔ جب اُس نے مصر کے جنوب میں نمبیہ کے لوگوں سے جنگ کی اوراُن پر فتح پانے کے بعد مغلوب لوگ بادشاہ کے حضور حاضر ہوئے تو جو تحفے تحائف لائے تھے اُس کی خوبصورت منظرکشی اس کے مقبرے کے درو دیواروں پر موجود ہے۔ جس کمرے میں میت ہوتی تھی۔ اُس کے بعد آگے اور خفیہ کمرے ہوتے تھے جن میں سونے چاندی اور دوسری قیمتی چیزیں رکھی جاتی تھی۔ یہ سب کچھ خفیہ رکھنے کا ایک ہی مقصد تھا کہ یہ چیزیں محفوظ رہیں۔ دنیاوی آفات اور چور لٹیروں سے۔

وادی الملوک میں سیاحوں کی توجہ توتن اخمون کے مقبرے کو حاصل ہے۔ یہ واحد مقبرہ ہے جسے اصل حالت میں پایا گیا تھا اوراُس کی تمام چیزیں یہاں سے نکال کراب مصر کے عجائب گھر میں سجائی ہوئی ہیں۔ خاص کراُس کے چہرے کا ماسک جو خالصتاً سونے کا ہے کو جس باریک بینی اور خوبصورتی سے تیار کیا گیا تھا اُسے دیکھ کرلوگ اُس زمانے کے کاریگروں کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ اس مقبرے کی دریافت کیسے ہوئے اُس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ویلی آف دی کنگ اور کوئین میں اگر چہ میت انتہائی خفیہ رکھے جاتے تھے لیکن پھر بھی وہ راز چوروں اور ڈاکو سے محفوظ نہ رہ سکے۔ پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ پادری یہاں سے لاشیں نکال کر پہاڑی کے اُس طرف واقع مندر دیرالبحری مین لے گئے۔

وادی الملوک میں شاہی مقبروں کے علاوہ سیاحوں کا دل لبھانے کیلئے اور کچھ نہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ سیاح ایک مقبرے کو دیکھ کر باہر کسی ٹیلے کے سائے میں بیٹھ کر اپنے ساتھیوں کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ میں اپنے ساتھیوں یعقوب آزاد، منیر حسین اور بکاری کے ساتھ جب پہلے مقبرے کو دیکھ کر دوسرے مقبرے کی طرف جانے لگا تو میرے ساتھ صرف منیر حسین تھے۔ دوسرے دو ساتھی ایک سائے میں بیٹھ گئے اور فراعنہ کے مقبروں کی بجائے یورپی سیاحوں کو دیکھ دیکھ کر دل پشوری کرنے لگے۔

ویلی آف کنگ میں بادشاہوں کے اور ویلی آف کوئین میں مصری شہزادیوں اور شاہی بیگمات کے مقبرے ہیں۔ ویلی آف کوئین میں سب سے اچھا اور دیکھنے کے قابل مقبرہ ملکہ نفرتری کا ہے۔نفرتری رعمس دوئم کی چہتی بیگم تھی۔انتہائی حسین اور ذہین تھی۔ شاہی تقریبات میں اس کا وہی رول رہتا تھا جو آج کے دور میں خاتون اول ادا کرتی ہیں۔فرعون رعمیس جہاں بھی جاتا یہ بیگم اُس کے ساتھ ساتھ ہوتی تھی۔رعمیس کی اگرچہ درجنوں بیویاں اور سو سے زیادہ بچے تھےلیکن بیگم اول نفرتری تھی۔ملکہ نفرتری کا حکومتی معاملات میں بھی بڑا اثر تھا۔جب فراعنہ نے نبیہ کے خلاف جنگ کی تو یہ اپنے خاوند کے ساتھ ساتھ تھی۔ممکن ہے یہی وجہ ہو کہ ابوسمبل کے باہر فرعون رعمیس کے جو دیوہیکل مجسمے ہیں اُن میں بادشاہ کے ساتھ نفرتری ہی بیٹھی ہوئی ہے۔

ویلی آف کوئین میں نفرتری کا مقبرہ سب سے آخر میں ہے۔یہ آٹھ فٹ زیر زمین جا کر آگے شروع ہوتا ہے۔اسے **1904**ء میں اطالوی ماہر آثارقدیمہ نے دریافت کیا تھا۔جب وہ اسے کھود کر اندر پہنچے تو رعمیس دوم کی ملکہ حسن نفرتری کی لاش ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی تھی۔ اور سونا چاندی بھی غائب تھا۔ یہ کاروائی پرانے زمانے کے کفن چوروں اور لٹیروں کی ہوگی۔ اگرچہ مقبرے سے سونا چاندی تو نہ ملالیکن اس کی در و دیوار پر اتنے خوبصورت نقش و نگار ہیں کہ انہیں دیکھتے ہوئے انسان یوں محسوس کرتا ہے جیسے ہم خود اپنی آنکھوں سے وہ تمام منظر دیکھ رہے ہیں۔آیئے مقبرے کے اندر کے چند سین دیکھیں۔

دروازے سے داخل ہوتے ہی دیوار کے دائیں اور بائیں ملکہ نفرتری کی خوبصورت تصویر جس میں اُس نے سفید لباس پہن رکھا ہے۔کمر بند کے اوپر جو رسہ نما چیز باندھی ہوئی تھی اُس کے سرے لٹک رہے ہیں۔اور سر پر سنہری تاج ہے۔ماتھے کے اوپر تاج میں ایک ناگ پھن پھیلائے کاٹ دوڑنے کو تیار ہے۔تاج کے نیچے کالے رنگ کا ایک دوپٹہ جس کی جالر شانوں پر لٹک رہی ہے۔قمیض کے بازو لمبے نہیں بلکہ آدھے بازو تک ہیں۔ جو فیشن کی بدولت لٹک رہے ہیں۔ گلے میں بہت بڑا سونے کا ہار ہے۔کانوں میں سفید بندے ہیں۔اور بازو میں خوبصورت بازو بند ہیں۔آنکھیں موٹی موٹی۔ناک ستواں اور دہن چہرے کے مطابق نہ بڑا نہ چھوٹا۔اور دونوں ہاتھوں میں شراب کے پیالے بھرے ہوئے ہیں جنہیں وہ اگلے جہاں کے دیوتا کو پیش کر رہی ہے۔تاکہ سفر آخرت آرام سے گزرے۔

ایک اور سین میں ملکہ نفرتری نے وہی سفید لباس زیب تن کیا ہوا ہے اور اگلے جہاں کے دیوتے کا ہاتھ پکڑے جارہی ہے۔ ایک اور تصویر میں وہ دوسرے دیوتاؤں کے حضور حاضر دکھائی گئی ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ ملکہ نفرتری مذہبی خاتون تھیں اور اپنے عقیدے کے مطابق اپنے تمام دیوتاؤں کو مانتی تھی۔ ایک اور تصویر میں یہ کرسی پر بیٹھی کوئی کھیل کھیل رہی ہے۔ مقبرے کی ایک دیوار پر چھ گائیں اور ایک بیل دکھایا گیا ہے۔ جس کے ساتھ قدیمی زبان میں کوئی کہانی لکھی ہوئی ہے۔ یہ مقدس گائے اور بیل اگلے جہاں میں خوراک دینے کا سامان مہیا کریں گے۔ اس طرح کی ہزاروں تصویریں ملکہ نفرتری کے مقبرے کی دیواروں اور چھت پر موجود ہیں۔ جن کے رنگ ابھی تک پھیکے نہیں پڑے۔

ملکہ نفرتری انتہائی خوبصورت اور نیک دل خاتون تھیں۔ جب ملکہ کے خاوند فرعون رعمیس ثانی نے بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرنے کا حکم دیا تو کچھ دائیاں بچوں کو چوری چھپے زندہ رہنے دیتی تھی۔ اس طرح زندہ بچ جانے والے بچوں میں حضرت موسیٰ بھی شامل تھے۔ جنہیں ماں نے فرعون کے خوف سے دریا میں بہادیا تھا۔ تو محل کے قریب یہی ملکہ نفرتری تھی جس نے حضرت موسیٰ کو گود لیا اور پھر اسے شاہی محل میں پروان چڑھایا تھا۔ فرعون رعمس کا دارالحکومت تو الاقصر میں تھا لیکن شاہی محل شمال میں ڈیلٹا کے مقام پر تھے جہاں حضرت موسیٰ کا یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ اس پر مزید بات چیت آگئے چل کر کریں گئے۔

ویلی آف دی کنگ کی سیاحت سے دل بھرا تو ایک سٹال سے ٹھنڈا مشروب پینے لگے تو منیر حسین بولے بادشاہو! شکر ہے میں دور فراعنہ میں پیدا نہیں ہوا۔ ورنہ فرعون مجھے آرٹسٹ سمجھ کر ہر روز صبح سویرے اپنے کسی مقبرے میں اُتار کر حکم دیتے کہ اب دن بھر ہمارے مقبروں میں تصویریں بناؤ۔ اور یوں میں اپنی زندگی ان مقبروں میں پھول بوٹے بناتے بناتے ضائع کر دیتا۔

مشروب پینے کے بعد ٹیکسی میں بیٹھ کر دیرالبحری کے بڑے صنم کدہ کو دیکھنے کیلئے روانہ ہوئے۔ راستے میں دارالمدینہ نامی گاؤں دیکھا جو کاریگروں کی بستی کے نام سے شہرت رکھتا ہے۔ یہ گاؤں وادی الملوک اور دیرالبحری کے درمیان میں ایک موڑ پر آباد ہے۔ اس وقت بھی یہاں ایک چھوٹی سی بستی موجود ہے۔ فراعنہ کے زمانے میں یہاں کاریگر اور ہنرمند لوگ

رہتے تھے جو وادی الملوک اور ویلی آف دی کوئین میں شاہی مقبرے تیار کرتے تھے۔ لیکن چھٹی والے دن یہ اپنے مقبرے بھی بناتے تھے۔ جو اس وقت بھی اپنی اصلی حالت میں ہیں۔ ان مقبروں میں لوگوں کی روزمرہ کی طرز زندگی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

دیرالبحری

ویلی آف کنگ اور کوئین کے اس علاقہ میں دیرالبحری کو بڑی اہمیت ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ الاقصر میں جس عبادت گاہ کو سب سے زیادہ دیکھنے کیلئے سیاح جاتے ہیں وہ دیرالبحری ہے۔ سرخی مائل بھوری مٹی کی پہاڑیوں کے دامن میں ایک لمبی چوڑی ٹیرس نما عمارت کا فوٹو اکثر کتابوں، رسائل اور ٹیلی ویژن پر دکھایا جاتا ہے۔ یہی دیرالبحری ہے۔ یہ دریائے نیل سے ساڑھے تین میل دور ہے۔ اسے توتن موس اول کی بیٹی ملکہ Hatshepsut نے تعمیر کروایا تھا۔ فراعنہ کی تاریخ میں یہ واحد خاتون تھی جس نے خودمختار حیثیت سے مصر پر حکمرانی کی۔ اس کے زمانے میں مصر کی تجارتی منڈی شمال میں صومالیہ تک پہنچ گئی تھی۔ پھر اس کے سوتیلے بیٹے تیوتھومس سوئم نے اسے شکست دیکر اقتدار پر قبضہ کرلیا تھا۔

جب فراعنہ دور ختم ہوا اور عیسائیت نے مصر میں قدم جمانے شروع کیے تب اس مندر کی جگہ عیسائیوں نے قبضہ کرلیا اور اس کا نام دیرالبحری رکھا۔ اور اسے عیسائیت کا شمالی علاقوں کا مرکز قرار دیا۔ دیرالبحری کا مطلب بھی ''شمالی چرچ کا مرکز'' ہے۔

جب ہم دیرالبحری پہنچے تب دن کے بارہ بجے تھے۔ دھوپ اپنے جوبن پر تھی۔ یورپی سیاح سائے کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ لیکن دور دور تک کوئی سایہ نہیں تھا۔ سامنے پہاڑی کے دامن میں یہ مندر تھا۔ اور بائیں طرف کھلے میدان دور دور ہرے بھرے کھیت نظر آرہے تھے جو پھیلتے پھیلتے پشت کی طرف دریائے نیل تک چلے جاتے ہیں۔ منیر حسین نے ہمارے فوٹو بنائے پھر کچھ قدرتی مناظر کے سین اپنی پسند کے مطابق کھینچے۔ اور یوں ہم آہستہ آہستہ یعقوب آزاد کی قیادت میں دیرالبحری کی طرف پیدل چلتے ہوئے پہلی منزل پر پہنچے۔ بڑے بڑے ستونوں پر قائم یہ عمارت کسی زمانے میں عالیشان تھی۔ اس کے اردگرد فضاء میں خوشبو پھیلانے والے درخت تھے۔ ہم کافی عرصہ اس دیر میں گھومتے پھرتے ماضی کی یادوں

کو تازہ کرتے رہے۔ شاہی میت کو مقبرے میں پہنچانے سے قبل اُن کی آخری رسومات یہاں ادا کی جاتی تھیں۔

فراعنہ دور کے مذہبی لوگ اس دیر البحری میں رہتے تھے۔ جنہیں فراعنہ کی میتوں کو محفوظ رکھنے کی بڑی فکر ہوتی تھی۔ غالباً یہی سبب تھا کہ جب چوروں لٹیروں نے شاہی مقبرے لوٹنے شروع کیے تو ان پادریوں نے شاہی مقبروں سے تقریباً چالیس شاہی میتیں نکال کر اس دیر کے ساتھ ایک گہری غار کھود کر اُس میں چھپا دی تھیں۔ جو گذشتہ صدی میں دوسرے آثار قدیمہ کے ساتھ ساتھ دریافت ہوئے۔ ان شاہی میتوں میں سیتی اول، اُس کے بیٹے رعمیس ثانی جیسے بادشاہوں کی میتیں تھیں۔ ان میتوں کو جب الاقصر سے قاہرہ دریائے نیل کے ذریعے لایا جانے لگا تو لوگ دور دور تک دریائے نیل کے دونوں کناروں پر کھڑے ہوگئے۔ خواتین بال کھولے ماتمی لباس میں تھیں۔ چونکہ قدیم مصر میں میت کو رخصت کرنے کا یہی طریقہ تھا۔ جو دور فراعنہ سے آج تک چلا آ رہا ہے۔ ماتمی لباس میں خواتین اور مرد دریائے نیل کے ساتھ ساتھ کافی عرصہ اُس کشتی کے ساتھ ساتھ دوڑتے رہے جس میں شاہی میتیں قاہرہ جا رہی تھیں۔ یوں اہل الاقصر نے فراعنہ کو آخری بار اپنے آبائی علاقہ سے بڑے اعزاز کے ساتھ رخصت کیا تھا۔

بدلتے زمانے کے ساتھ ساتھ اس دیر البحری کے آثار بھی نظروں سے اوجل ہو گئے تھے۔ 1891ء میں آثار قدیمہ نے اس کے آثار دیکھے تو کھدائی شروع کی تو دیر البحری کے کھنڈرات ملے۔ جنہیں ماہرین نے بڑی محنت سے اصل حالت میں بحال کیا ہے۔

افریقہ کی گرمی نے جب ہمیں آن دبوچا تو ہم دیر البحری سے نیچے اُتر کر اپنی کار تک آئے۔ کار پارک کے ساتھ سٹال لگائے مصری لوگ سیاحوں کو اشیاء فروخت کر رہے تھے۔ میں نے بیگم اور بچوں کیلئے تحائف خریدے لیکن آدھا گھنٹہ کی بحث تکرار کے بعد چونکہ اس کے بغیر چارہ ہی نہیں۔ خریداری کے بعد ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر واپس آئے تو راستے میں ہرے بھرے کھیتوں میں سے گاڑی فراٹے بھرتی جلد ہی دریائے نیل کے کنارے آن رکی۔ دریا کنارے ٹیکسی نے ہمیں اُتار اور ہم کشتی نما سٹیمر میں بیٹھ کر دریائے نیل کے دوسرے کنارے الاقصر کے ٹیمپل کے پاس آ کر اُترے۔

دوپہر کا وقت تھا بھوک بھی چمک رہی تھی۔ چنانچہ قریب ہی میکڈونلڈ ریسٹورنٹ میں

بیٹھ کر امریکی کھانا کھایا۔ ایر کنڈیشن کی وجہ سے اندر ٹھنڈک تھی۔ شکم سیری کے بعد ہم دوبارہ دریائے نیل کے کنارے گئے تا کہ دریا کی سیر کی جائے۔ وہاں ہمیں کشتی بانوں نے گھیر لیا۔ آزاد صاحب مصر کی سیاحت کے دوران ونڈرفل Wonderful کا تکیہ کلام استعمال کرتے رہے۔ دریائے نیل کے کنارے ایک نوجوان نے یعقوب آزاد سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کی غرض سے ان کا نام پوچھا۔ مصر میں ایسا اکثر ہوتا ہے۔ اس سوال پر آزاد صاحب نے کہا ''ونڈرفل''۔ لڑکے نے پوچھا کیا آپ کا نام ''مسٹر ونڈرفل'' ہے۔ اس سوال پر ہم ہنس پڑے تو لڑکا سمجھ گیا۔ تب وہ جھٹ بولا اگر آپ مسٹر ونڈرفل ہیں تو میں مسٹر پرفیکٹ Mr Perfect ہوں۔ میں نے لڑکے کی حاضری جوابی پر اُسے داد دی۔

دریائے نیل اور باغات

کشتی بانوں کے جھرمٹ سے آخر ہمارا ایک کشتی بان سے تیس مصری پونڈ میں سودا ہوا۔ کہ وہ ہمیں دریائے نیل میں شمال کی طرف لے جا کر ایک گاؤں میں اُتارے گا جہاں کے باغات اور گاؤں میں گھوم پھر کر ہم مصر کی دیہاتی زندگی کو قریب سے دیکھ سکیں گے۔ ہم نے بعد دوپہر کا وقت اسی گاؤں میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔

کشتی کا جوں ہی سفر شروع ہوا تو فرحت بخش ہوا نے ہمیں تازگی بخشی۔ کشتی کافی بڑی تھی چنانچہ ہم اُن پر نوابوں کی طرح لیٹ گئے۔ ابھی تھوڑا ہی سفر کیا تھا کہ کشتی دریائے نیل میں کھڑی ''کروز شپ'' کے پاس سے گزرنے لگی۔ ہم نے دیکھا یہ کروز کئی منزلہ ہیں جو مسافروں کو لیکر اسوان جانے کی تیاری میں تھے۔ جہاز کے اندر مسافروں کے رہنے سونے اور کھانے پینے کیلئے جہاں کمرے تھے وہاں چھت کے اوپر سوئمنگ پول تھا۔ جس میں یورپی دوشیزائیں لباس فطرت میں غسل آفتابی فرما رہیں تھیں۔ ہمارے ساتھی جو سفر کی تھکن سے سونے والے تھے نے چٹی چمڑی کو اصل حالت میں دیکھ کر آنکھیں کھول لیں۔ اور یوں محسوس ہونے لگا کہ ہم مصر کی بجائے برطانیہ کے ساحل سمندر برائٹن میں پہنچ گئے ہیں۔ برائٹن کا ساحل سمندر فطرتی لباس میں گھومتے گورے اور گوریوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ میں آج صبح کی سیاحت کے نوٹ لکھنے لگا تو منیر حسین نے مجھے متوجہ کیا بادشاہو۔ نوٹ بعد میں بھی لکھے جاسکتے ہیں۔ پہلے آنکھیں ٹھنڈی کرلو تا کہ رات کی نیند سے چھٹکارا حاصل کیا جاسکے۔ میں نے منیر کا دل رکھنے کی خاطر ڈائری کو

ایک طرف رکھا اور ہمہ یاراں دوزخ کے مقولے پر عمل کرنے لگے۔

اب ہماری کشتی جنوب کی طرف جدھر سے دریائے نیل بہہ کر آ رہا تھا اُدھر جا رہی تھی۔ جب الاقصر قصبے کی سرحد ختم ہوئی تو کشتی ایک طرف جا کر رک گئی۔

ہم کشتی سے اُترے تھوڑی چڑھائی چڑھ کر اوپر گئے تو ایک باغ کے داخلی دروازے پر ایک مصری بوڑھا بیٹھا ہوا تھا۔ جس نے ہم سے دس دس مصری پونڈ باغ میں داخل ہونے کا کرایہ لیا اور ساتھ خوشخبری دی کہ اسی داخلہ فیس میں جی بھر کر فروٹ کھا سکتے ہیں۔ باغ میں داخل ہونے سے قبل ہم نے قریبی گاؤں کی تصویریں اُتاریں۔ کھیتوں میں کام کرتے کسان دیکھے جن کی مدد کیلئے اُن کے بیوی بچے بھی کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ ایک عورت ہریالی کاٹ کر کھوتی پر لاد رہی تھی۔ بچے گھاس کاٹ رہے تھے۔ گندم کے کھیت کٹائی کیلئے تیار تھے۔ شٹالا کے ہرے بھرے کھیت نظر آ رہے تھے جو مال مویشی کے کھانے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک طرف ہرے بھرے میدان میں بھینسیں چر رہیں تھیں۔ یہ گاؤں دیکھا تو مجھے وطن عزیز یاد آیا۔ میں سوچنے لگا گاؤں کی زندگی چاہے وہ برصغیر کی ہو یا افریقہ کی یا پھر یورپ کی اُن میں بہت سی چیزیں مشترک ہوتی ہیں۔

ہم کافی عرصہ مصری تہذیب وتمدن کو قریب، سے دیکھتے رہے۔ ممکن ہے بہت سے مصریوں کو یہ علم ہی نہ ہو کہ دنیا بھر سے سیاح اس شہر میں کیوں آتے ہیں۔ انہیں تو صرف اپنا پیٹ پالنے سے غرض ہے۔

دیہہ زندگی کے نظارے لینے کے بعد ہم باغ میں داخل ہوئے تو جی خوش ہوگیا۔ تھوڑا آگے بڑھے تو سات آٹھ سال کی ایک بچی نے غالباً مالٹے کے درخت کے پتے توڑ کر ہمیں پیش کیے۔ جس کے جواب میں ہمارے شیخ صاحب یعنی یعقوب آزاد نے دل کھول کر بخشیش دی۔ یوں سیر کرتے ہوئے ہم باغ کے مرکزی حصے میں پہنچے جہاں ایک کمرے پر مشتمل ایک کچی کوٹھری تھی۔ ساتھ ایک دکان اور پھر مسجد۔ کھلی جگہ چند بنچ اور کرسیاں رکھی ہوئیں تھیں۔ جوں ہی ہم وہاں گئے تو ایک صاحب نے کیلے کی ٹرے بھر کر ہمارے سامنے رکھ دی۔ یہ کیلے انتہائی لذیز تھے۔ ہم نے خوب پیٹ بھر کر کھائے۔ بکاری نے تو اپنے لئے دوبارہ منگوائے۔ فروٹ کھانے کے بعد پیاس نے ستایا تو دکان سے ڈرنگ لیکر پینے شروع کیے۔ لیکن جب پیسے

دینے لگے تو اُن صاحب نے ہمارے ساتھ وہی حشر کیا جو مصر میں اکثر سیاحوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔یعنی کئی گنا زیادہ پیسے وصول کیے۔

باغ کی سیاحت کے بعد ہم اُسی کشتی پر دوبارہ بیٹھے اور دریائے نیل کے ذریعے واپس جہاں سے چلے تھے وہاں آن پہنچے۔کشتی سے اُتر کر ہم ایک تانگہ میں بیٹھ کر شہر کی سیر کو نکلے لیکن کیا دیکھتے تانگہ ایک دو گلیوں میں گھومنے کے بعد واپس آ گیا۔چونکہ یہ شہر ہی چھوٹا سا ہے۔ ایک گلی میں ایک ریڑھی بان کوئلے پر کباب تیار کر رہا تھا۔ہم اُسی کے پاس بیٹھ گئے۔اور کوئی دو کلو کباب بکاری کیلئے اور ایک کلو ہم تینوں نے بانٹ کر کھائے۔کھانے کے بعد ہم نے کوکا کولا پیا جبکہ بکاری نے وہاں قریب ہی بلدیہ کے لگائے ہوئے نلکے کے ساتھ منہ لگا کر غٹا غٹ کوئی گیلن بھر پانی پی لیا۔ جب بکاری پانی پی رہا تھا تب منیر حسین نے مجھے کہا: بادشاہو! بکاری کل بیمار ہو جائے گا۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے۔ابھی تھوڑا عرصہ پہلے جب ہم دریائے نیل میں سیر کر رہے تھے اس نے دو گیلن پانی دریا ئے نیل کا پیا اور اب دوبارہ وہی پانی پی رہا ہے۔ بکاری کے خیال میں یہ دنیا میں سب سے شفاف پانی ہے۔ جب کہ صورت حال اس کے مختلف ہے۔اس پانی کو صاف کر کے ہی پیا جا سکتا ہے۔ منیر حسین کی پیش گوئی اُس وقت غلط ثابت ہوئی جب دوسرے دن بکاری ہم سے زیادہ تر و تازہ تھا۔

دن بھر الاقصر میں گھومنے پھرنے کے بعد شام سات بجے ہم قاہرہ جانے والی گاڑی میں سوار ہوئے۔ مصر کی تمام آبادی دریائے نیل کے ارد گرد ہے۔اگر دریا کی حدود سے چند میل دور چلے جائیں تو آپ صحرا میں پہنچ جاتے ہیں۔الاقصر سے قاہرہ تک کا تمام سفر دریائے نیل کے ساتھ ساتھ طے ہوتا ہے۔راستے میں کئی سٹیشنوں پر گاڑی رکتی ہے لیکن چند لمحوں کیلئے۔ مسافر اُتارے بٹھائے جاتے ہیں۔اور گاڑی پھر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔

ہم بھی مختلف سٹیشنوں پر رکتے باہر دیکھتے صبح کے چار بجے قاہرہ پہنچے۔ جہاں سے ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنی قیام گاہ کا رخ کیا۔ ٹیکسی ڈرائیور ایک بوڑھا مصری تھا لیکن اُس کی گاڑی اُس سے بھی بوڑھی تھی۔بالکل اہرام مصر کی طرح عمر رسیدہ تھی بیچاری۔ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بغیر سائلنسر کے چل رہی ہے۔گاڑی اسقدر شور مچا رہی تھی کہ اندر بیٹھنا مشکل تھا۔ کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔گاڑی سے خارج ہونے والا کالا سیاہ دھواں سیدھا پھیپھڑوں میں اُتر

رہا تھا۔ ہم بکاری کو کوس رہے تھے۔ جس نے اس ٹیکسی والے سے بات طے کی تھی۔ ڈرائیور کی پوری کوشش کے باوجود بھی حد رفتار تیس میل فی گھنٹہ سے زیادہ نہ بڑھ سکی۔ اس گاڑی نے ہمیں پطرس بخاری کے ایک مضمون ''مرزا کی بائیسکل'' کی یادیں تازہ کروائیں۔ بیس میل کا سفر جب ایک گھنٹہ میں طے ہوا تو خدا کا شکرادا کیا۔ یعقوب آزاد نے کرایہ کے ساتھ ساتھ بابا کو اچھا بھلا ٹپ بھی دیا۔ یہ ٹپ دونوں (بابا اور گاڑی) کی ضعیف عمری پر ترس کھا کر دیا گیا تھا۔

گھر پہنچے تو لمبی تان کر سو گئے۔ جب آنکھ کھلی تو دن کے گیارہ بج چکے تھے۔



قلوپطرہ کا شہر

حجر رشید

سکندریہ کی سیر

ہمارے گلوکار

قلوپطرہ کا شہر

حسینہ عالم قلوپطرہ کا آبائی شہر اسکندریہ تھا۔ یہ شہر سکندر اعظم نے آباد کیا تھا۔ سکندر اقوام عالم کو فتح کرتا ہوا جب 331 ق م میں مصر پہنچا تو بحرہ روم کے کنارے ایک نیا شہر بسایا۔ جو سکندر کے نام کی مناسبت سے سکندریہ کہلانے لگا۔ سکندر اعظم کی فتوحات اور قلوپطرہ کے حسن نے مل کر اس شہر کو جو شہرت دی اُس کے باعث دنیا کے سیاح اس شہر کی طرف کھنچے آتے ہیں۔ حسن پرست لوگ اُس دیس کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے تڑپتے رہتے ہیں جہاں حسینہ عالم قلوپطرہ نے زندگی کے حسین لمحات گزارے تھے۔

قلوپطرہ کے آباؤ اجداد سکندر کے ساتھ مصر آئے تھے۔ اِن کا آبائی وطن میسوڈونیا Macedonian تھا۔ سکندر نے مصر فتح کر کے حکومت اپنے ایک جرنیل (پٹولمی Ptolemy) بطلیموس کے سپرد کی اور خود برصغیر کی طرف چلا گیا۔ قلوپطرہ اسی بطلیموس کے خاندان کی ایک ایسی انمول کلی تھی جس کے حسن کی مہک دنیا میں کچھ اس طرح پھیلی کہ یہ حسینہ عالم دنیا کے لاکھوں حسن پرست کے سپنوں کی ملکہ بنی۔ اور بحرہ روم کا انمول موتی کا خطاب پایا۔ بطلیموس خاندان نے مصر پر 323 ق م سے 31 ق م تک حکومت کی۔

51 ق م میں قلوپطرہ کا باپ فوت ہوا تو حکومت قلوپطرہ اور اس کے بھائی کے حصے آئی۔ حکومت کے ساتھ ساتھ قلوپطرہ کے حسن کی شمع روشن ہوتے ہی اردگرد پروانے جمع ہونے

لگے۔ جو حسن اور عشق کی گرمی میں جلتے اور مرتے رہے۔ قلوپطرہ کا لازوال حسن محدود رہنے کے حق میں نہیں تھا۔ اُس کی بے چین روح اُسے شاہی محل میں سکون اور خوشیاں نہ دے سکی۔ اقتدار میں شریک بھائی اس کا خاوند بھی تھا۔ جس نے فراعنہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی بہن قلوپطرہ سے شادی کی تھی۔ یہ بات قلوپطرہ کو پسند نہیں تھی۔ جس کی بناء پر ان میں کھینچاؤ رہتا تھا۔ قلوپطرہ کو خوف تھا کہ اس ناچاقی کی وجہ سے اُس کا بھائی اُسے قتل نہ کردے۔ قتل کے خوف سے قلوپطرہ شاہی محل سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اس دوران رومن حکمرانوں نے جیولس سیزز کی زیر قیادت میں مصر پر حملہ کر دیا۔ (جیولس سیزر دنیا کا پہلا بچہ تھا جسے ڈاکٹروں نے آپریشن کے ذریعے ماں کے پیٹ سے نکالا تھا۔ آپریشن کیلئے ڈاکٹرز نے قینچی یعنی Scissors سیزر کا استعمال کیا تھا جو بعد میں اس کے نام کا حصہ بن گیا۔) جنگ میں قلوپطرہ کا بھائی قتل ہوا۔ تو جیولین سیزز نے 47 ق م میں قلوپطرہ کو تخت پر بیٹھایا۔ اور اس کے حسن سے خود مستفید ہونے لگا۔ اس کھیل میں قلوپطرہ کو سیزز کے ایک بیٹے کی ماں بننا پڑا۔ اپنے دور حکومت میں سیزر ایک بار قلوپطرہ کو روم بھی لے گیا تھا تا کہ اس کے حسن کی جھلک اہل روم کو بھی دکھا سکے۔

41 ق م میں ایک اور رومن جنرل انتھونی نے مصر پر حملہ کر کے سیزر کو قتل کر دیا۔ انتھونی بھی قلوپطرہ کے حسن کے تیر کا شکار ہوا۔ اور اسے مصر کی ملکہ تسلیم کر لیا۔ دونوں نے شادی کر لی تھی۔ انتھونی کی پہلی بیوی روم کے حکمران اکٹاویان Octavian کی بہن تھی۔ جسے انتھونی نے طلاق دے دی تھی۔ یوں شاہ روم نے بہن کا انتقام لینے کیلئے 31 ق م میں مصر پر حملہ کیا۔ اس جنگ میں انتھونی قتل ہو گیا۔ انتھونی کے قتل ہونے پر قلوپطرہ نے بھی اپنے آپ کو سانپ سے ڈسوا کر جان دے دی۔ اس پس منظر میں انگریزی کے شہرہ آفاق لکھاڑی شکسپیئر نے انتھونی اور قلوپطرہ نامی ڈرامہ لکھ کر ان دونوں کے پیار کو لازوال کر دیا۔

یوں پیار و محبت کی اس دیوی کے پیار کی ایک لازوال داستان نے جنم لیا۔ جب ہم مصر گئے تو ہمارے بھی ننھے منے دل نے مجبور کیا کہ اگرچہ ہم قلوپطرہ کا دیدار تو نہ کر سکے لیکن کیا یہ کم ہے کہ ہم اُس شہر اُن مقامات اور بحرہ روم کے نیلے سمندر کو دیکھ لیں جسے قلوپطرہ ہر روز دیکھتی تھی۔ کچھ اس قسم کی باتیں سوچتے ہوئے ہم یکم مارچ بروز بدھ صبح آٹھ بجے قاہرہ سے اسکندریہ روانہ ہوئے۔ گاڑی ھمام چلا رہا تھا۔ جس نے شہر کی رنگ روڈ پر گاڑی چلاتے ہوئے آخر ایک

چھوٹی سڑک سے اس طرف موڑ لی جدھر گیزہ کے اہرام ہیں۔ اہرام کے پاس سے گزر کر ہم نے اسکندریہ جانے والی شاہرہ کا رخ کیا۔ جوں ہی قاہرہ کی حدود سے باہر نکلے تو لق دق صحرا نے ہمارا استقبال کیا۔ صحرا میں سفر کرنے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ حد نظر تک ریت اور صحرا نظروں کو دھوکا دے رہا تھا۔ جب ہم موٹروے پر پہنچے تو سفر کرنے کے دو مصری پونڈ ادا کیے۔

موٹروئے پر حد رفتار ایک سو کلو میٹر فی گھنٹہ تھی۔ قاہرہ شہر موٹروے کی جانب تیزی سے پھیل رہا ہے۔ ایک فوجی چھاونی بھی اس علاقہ میں زیر تعمیر ہے۔ راستے میں ایک خوبصورت زیر تعمیر شہر دیکھا جو ''سادات سٹی'' کہلاتا ہے۔ سفر کے دوران وقفہ وقفہ پر نخلستان بھی نظر آتے رہے۔ جہاں چند گھروں کے علاوہ ریت پر مٹی ڈال کر زمین تیار کی گئی تھی۔ جس پر کھیتی باڑی کے ساتھ ساتھ باغات بھی دیکھے۔ کبھی کبھار کوئی مکان بھی نظر آ جاتا تو اس بات کا احساس ہوتا کہ یہاں آبادی بھی ہے۔ گھروں کے اوپر ہم نے گول سفید رنگ کے بڑے بڑے مینارے دیکھے۔ ھمام نے بتایا کہ یہ کبوتروں اور دوسرے پرندوں کے رہنے کیلئے بنائے جاتے ہیں۔ پرندے صحرا میں دن بھر دانہ دنکا چکنے کے بعد رات ان گھروں میں بسر کرتے ہیں۔

ہمارا پانچ رکنی قافلہ صحرا کے بیچوں بیچ ایک خوبصورت موٹروے پر سفر کرتے ہوئے سکندریہ کی طرف رواں تھا۔ موٹروئے انتہائی خوبصورت تھا۔ جس کے دونوں طرف روشنی کیلئے لائٹس تھیں۔ جس میں کسی نہ کسی کمپنی کا اشتہار نظر آتا تھا۔ یہ بات مجھے پسند آئی۔ اس طرح ایک تیر سے دو شکار۔ روشنی کی روشنی اور مشہوری کی مشہوری۔ میں نے کسی اور ملک میں ایسا نہیں دیکھا۔

سفر کے دوران موٹروے کی ایک سروس سٹیشن پر اُترے تو دیکھا اس کا انتظام بہت اچھا تھا۔ جوان لڑکے اور لڑکیاں بیٹھے گپ شپ لگا رہے تھے۔ سب خوش باش نظر آئے۔ ایک طرف شیشہ یعنی حقہ پینے والے جمع تھے۔ دوسری طرف ایک بڑے ٹیلی ویژن پر لوگ فٹ بال ورلڈ کپ کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ جب اُن کی پسندیدہ ٹیم کوئی گول کرتی تو لوگ تالیاں بجاتے اور نعرے لگانے شروع کر دیتے۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ فٹ بال کو پسند کرتے ہیں۔

جوں جوں ہم اسکندریہ کے قریب پہنچتے گئے صحرا کا غلبہ کم ہوتا گیا اور سرسبز کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہمارے دائیں طرف مصر کا سب سے زرخیز خطہ ڈیلٹا تھا اور بائیں طرف

مغربی صحرا جو لیبیا تک پھیلا ہوا ہے۔ کھیت میں مکئی کی فصل کے ساتھ ساتھ بعض جگہ شٹالا نما ہریالی دیکھی جو غالباً مال مویشی کیلئے بوئی جاتی ہوگئی۔

دریائے نیل جب ڈیلٹا کے علاقہ میں پہنچتا ہے تو مختلف شاخوں میں تقسیم ہوکر بحرہ روم میں جاملتا ہے۔ اس علاقہ میں نیل کی شاخیں اور پھر اُن سے نکالی ہوئی نہروں کے پانی سے کاشت کار اپنی زمینوں کو سیراب کرتے ہیں۔ علاقہ میں اتنا غلہ پیدا ہوتا ہے جو پورے مصر کی غذائی ضروریات پوری کرتا ہے۔

ہم دوپہر کے وقت اسکندریہ پہنچے۔ مصر کا یہ ساحلی شہر قاہرہ سے 220 کلومیٹر دور ہے۔ قاہرہ کے بعد یہ مصر کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ شہر کی آبادی تقریباً 3,000,000 افراد پر مشتمل ہے۔ جس میں تقریباً ساٹھ ہزار یونانی آباد ہیں۔ شہر کاٹن اور مچھلی کی صنعت کی وجہ سے مشہور ہے۔ شہر کے جانب مغرب میریت Maryut نامی جھیل ہے۔ یوں یہ شہر جنوب کی بجائے شمال کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ قاہرہ کی جانب سے شہر میں داخل ہوتے وقت دور سے شہر تو نظر آجاتا ہے۔ لیکن جھیل میریت اور آبپاشی کیلئے کھودی گئی نہروں کی وجہ سے آپ شہر میں سیدھا داخل ہونے کی بجائے تھوڑا سفر جھیل کے ساتھ ساتھ طے کرتے ہوئے جب جھیل کے مشرقی کنارے پہنچتے ہیں تو وہاں سے بائیں مڑ کر شہر میں داخل ہوتے ہیں۔

سکندریہ کی سیاحت ایک دن میں کی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر کوئی رات بھر رہنا چاہے تو پھر سونے پہ سہاگا۔ ساحل سمندر کے شیدائی سیاح کافی تعداد میں یہاں آتے ہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ پہلے گاڑی میں ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرکے شہر کا ایک طاہرانہ جائزہ لیا جائے پھر گاڑی روک کر پیدل چل کر شہر کو دیکھیں گئے۔ ہمام نے سمندر کے ایک کنارے سے گاڑی چلانی شروع کی تو وہ تیس کلومیٹر تک چلتا رہا۔ شہر تیس میل تک ساحل سمندر کے کنارے آباد ہے۔ ساحل سمندر انتہائی صاف ستھرا تھا۔ ٹریفک کا نظام بھی بہت اچھا معلوم ہوا۔ ساحل کے کنارے دوطرفہ ٹریفک کیلئے خوبصورت سڑک ہے۔ ہر طرف کی سڑک تین لین پر مشتمل ہے۔ سڑک کے ایک طرف سمندر اور دوسری طرف شاپنگ کیلئے مختلف دکانیں ہیں۔ سیاح دکانوں کے سامنے چلتے اندر جھانک کر چیزیں دیکھتے اور جب جی بھر جاتا تو دوسری طرف سمندر کا نظارہ

کر لیتے ہیں۔

حجر رشید

ہم اسکندریہ کے ساحل سمندر کے کنارے کنارے سفر کرتے ہوئے رشید نامی ایک چھوٹے سے ساحلی قصبہ تک جا پہنچے۔ اس قصبہ میں اتفاقیہ پہنچے۔ بالکل اُسی طرح کا اتفاق ہوا جس طرح 1799ء میں ہوا تھا۔ فرانسیسی فوج یہاں قلعہ کی مرمت کر رہی تھی۔ دوران مرمت لیفٹیننٹ پیری بوچرڈ کو قلعہ کے باتھ ہاؤس کے ملبے سے ایک پتھر ملا۔ بوچرڈ نے پہلی نظر میں ہی بھانپ لیا ہے کہ یہ عام پتھر نہیں۔ اُس کا یہ قیاس اُس وقت حقیقت میں بدلا جب ماہرین نے اُس پتھر کو فراعنہ کی تحریروں کو پڑھنے کی کنجی قرار دیا۔ یہ ایک حادثاتی دریافت تھی۔ حجر رشید کی نقول تیار کر کے دنیا کے ماہرین لسانیات کو بھیجی گئیں۔ اس پتھرن کے ذریعے اہل علم نے فراعنہ کے مقبروں اور اہرام کے اندر کی کہانیوں کو آشکارا کیا۔ فراعنہ کے مقبروں، مندروں اور اہرام کے اندر نقش ونگاری میں جو پھول بوٹے، پرند چرند، کسان، مال مویشی نظر آ رہے تھے۔ اُس پتھر کی بدولت اُن تصویروں میں جان پڑ گئی۔ پھول مہکنے لگے، پرندے اڑ کر اپنی کہانیاں سنانے لگے۔ کسان پانچ ہزار سال پہلے کی باتیں دلنشین انداز میں پیش کرنے لگے۔ یوں فراعنہ کے دور میں ایک نئی ہل چل پیدا ہوئی۔ یہ سب اس پتھر کا کمال تھا۔ وہ اس طرح کہ اُس ایک پتھر پر تین زبانوں میں تحریریں لکھی ہوئی ہیں۔ سب سے پہلے فراعنہ کے زمانے کی تحریریں جو ہیروغلافی Hieroglyphics کہلاتی ہیں۔ دوسری قدیم مصری زبان قبطی اور تیسری یونانی زبان میں تھی۔ یونانی زبان پڑھنا آسان تھا۔ چنانچہ ماہرین نے جب اسے پڑھا تو آخری سطر نے تمام راز افشاں کر دیئے۔ کہ یہ ایک ہی پیغام تین مختلف زبانوں میں لکھا گیا ہے۔ یونانی علماء نے پتھر پر لکھی ہوئی تحریر پڑھی تو معلوم ہوا کہ یہ تحریر ایک اعلان تھا۔ جو مصر کے یونانی بادشاہ پٹولمی (بطلیموس) پنجم کی تاج پوشی کے موقع پر دارالخلافہ ممفیس میں ایک یادگار کے طور پر جاری ہوا تھا۔ یوں علماء نے تینوں زبانوں کا تقابلی مطالعہ شروع کر دیا۔

کئی سالوں کے مطالعہ کے بعد 1819ء میں ایک برطانوی ماہر لسانیات تھامس ینگ نے ایک بڑا راز افشاں کیا کہ مصری قبطی تحریریں فراعنہ کی قدیمی تحریریں ہیروگرافی کی ہی ایک

شکل ہیں۔

اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کو کسی خاص مقصد کیلئے پیدا کرتے ہیں۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے ایک فرانسیسی جین جرانسکو شمپولین کو اسی مقصد کیلئے دنیا میں بھیجا کہ وہ پرانے زمانے کی تحریریں پڑھ کر گذشتہ زمانے کے راز لوگوں پر کھولے۔ شمپولین بچپن سے ہی قدیم مصری تحریریں پڑھنے کی کوشش میں رہتا تھا۔ حجر رشید ملا تو اُس کی ایک نقل اسے بھی بھیجی گئی جو بہت عرصہ اس کے زیر مطالعہ رہی۔ آخر میں وہ یہ جان پائے کہ یہ پھول بوٹے نہیں بلکہ حروف ہیں۔ یوں اس نے فراعنہ کی تحریروں کے خفیہ کوڈ افشاں کیے۔ 1822ء میں اس نے اپنا نظریہ ایک خط کے ذریعہ فرانس کی تعلیمی اکیڈیمی کو بھیجا۔ جین نے اس بات کو تسلیم کیا کہ ہیروغلافی دو کام انجام دیتی ہے۔ ایک آواز کی پہچان اور دوسرا اُس کا مطلب۔ شمپولین یونانی Coptic زبان کے ماہر تھے۔ اُس نے جب کوڈ افشاں کیے تو معلوم ہوا گیزہ کے اہرام بنوانے والے فرعون کا نام خوفو khufu تھا جبکہ یونانی میں اُسے Kheops کا اوپس کہتے ہیں۔ فراعنہ کی زبان کے کوڈ عوام کے ہاتھ آتے ہی انکے مقبروں میں لکھی جانے والی تمام کہانیاں سامنے آ گئیں۔ اور وہ تحریریں بھی معلوم ہوئیں جو مقبروں میں اس مقصد کیلئے لکھی جاتی تھیں تاکہ بادشاہ سلامت آخرت کے سفر میں جادو ٹونے کے علم سے دوسری آفات سے محفوظ رہیں۔ اب تو یہ عالم ہے کہ آپ کی خواہش پر قاہرہ اور الاقصر کے صراف آپ کا نام فراعنہ کے ہیروگرافی میں لکھ کر سونے کا تعویز آپ کے حوالے کر دیتے ہیں۔

حجر رشید کی اہمیت کا اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ جب برطانوی فوج کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے ایک خونریز لڑائی کے بعد فرانسیسی فوج سے وہ پتھر چھین لیا۔ یہ پتھر آج کل برٹش میوزیم لندن میں ہے۔

حجر رشید کے علاوہ اس قصبے کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ دریا نیل کا ایک حصہ ہزاروں میل کا سفر طے کرتا ہوا اس مقام پر آ کر بحرہِ روم میں گرتا ہے۔

سکندریہ کی سیر

ہم نے رشید نامی قصبہ دیکھا۔ واپسی پر سکندریہ شہر کے شروع میں میمورا اور ابوبکر

نامی سکندریہ کے مشہور ساحل سمندر دیکھے۔ یہاں سے تھوڑے فاصلہ پر مصر کے سابق بادشاہ فاروق کا محل ہے۔ ہم محل دیکھنے گئے تو ھمام نے گاڑی مونٹازہ Montazah نامی اس محل کے پہلو میں پارک کردی۔ محل کا جائزہ لیا تو یہ مجھے ایک بڑی کوٹھی نما عمارت نظر آئی۔ جو ایک چھوٹی سی پہاڑی کے اوپر ہے۔ جس کا صحن بحرہ روم کو چھوتا ہے۔ شاہ فاروق کی معزولی کے بعد اس محل میں اب ہوٹل ہے۔ ہم ہوٹل کے اندر جانے لگے تو منیر حسین نے اندر جانے سے انکار کردیا۔ یعقوب آزاد مہنگے ہوٹلوں میں جانا پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ میں اور یعقوب آزاد ہوٹل کے اندر گئے اور دیکھا یہ ہوٹل کی بجائے ایک محل تھا۔ جس کی درودیوار پر ابھی تک شاہ فاروق اور اُس کی ملکہ کی شاہی تقریبات کے فوٹو آویزاں ہیں۔ تصویروں میں ملکہ انتہائی حسین اور باوقار عورت نظر آرہی تھی۔ تصویر دیکھ کر میں سوچنے لگا کہ اتنی حسین بیوی کو چھوڑ کر پتہ نہیں شاہ فاروق دوسرے گندے برتنوں میں کیوں منہ مارنے کا عادی تھا۔

شاہ فاروق کے محل میں قائم ہوٹل اور کیسینو (جواخانہ) میں رات بسر کرنے کے دوسو ڈالر ادا کرنے پڑتے ہیں یعنی کوئی پندرہ ہزار روپے۔ اس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ اب اس ہوٹل میں وہ عیاشیاں برپا نہ ہوتی ہونگی جو شاہ فاروق کیا کرتے تھے۔ کنگ فاروق خواتین کا بڑا رسیا تھا۔ درمیانہ گٹھیلا قد لیکن انتہائی شہوت پرست تھا۔ اس کی راتیں بڑی رنگین ہوتی تھیں۔ ساحل سمندر پر واقع یہ محل ایک رومانی منظر پیش کرتا ہے۔ یہ ماحول یقیناً بادشاہ سلامت کی جنسی پیاس میں جلتی پر تیل کا کام کرتا تھا۔

ہمارے ساتھی منیر حسین زندگی میں ربط رکھنے کے بڑے قائل ہیں۔ ہر کام عین وقت پر پروگرام کے مطابق۔ اٹھنے، بیٹھنے اور کھانے پینے میں رواداری۔ گفتگو میں نرمی اور دھیمے پن کو ترجیح دیتے ہیں۔ مونٹازہ ہوٹل کے اندر جانا ہمارے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ یوں منیر حسین ہمارے ساتھ ہوٹل کے اندر نہیں گئے۔ اور اُن کے خیال میں ممکن ہے ہوٹل سٹاف پوچھ بیٹھے کہ صاحبان آپ منہ اٹھائے یوں ہوٹل میں کیوں گھسے آرہے ہیں۔ اور پھر مصری اونچی آواز میں گفتگو کرنے کے عادی ہیں۔ جن کے ساتھ بعض اوقات بکاری اور آزاد صاحب بھی شامل ہو جاتے تو منیر حسین تاؤ کھاتے۔ میں بھی منیر حسین کا طرفدار ہوں لیکن میں اس بات کا بھی قائل ہوں کہ سیر وسیاحت کے دوران اپنے اوپر کچھ پابندیاں نہ لگانے میں ہی بہتری ہوتی ہے۔

علامہ اقبال بھی اس بات کے قائل تھے کہ:

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

ہمارے ساتھی یعقوب آزاد کشتی رانی کے بڑے شوقین ہیں۔ ہم محل کے صحن اور باغیچوں میں سے گزر کر بحرہ روم کے کنارے پہنچے۔تو ہمارے سامنے اور دائیں طرف جو سمندر تھا اسی میں برطانوی امیر بحر نیلسن اور فرانس کے نپولین کے درمیان 1798ء میں جنگ ہوئی جو نیلسن نے جیتی تھی۔ اس پر برطانوی باشندے آج بھی فخر کرتے ہیں۔اُس جنگ کے اب کوئی نشان تو موجود نہیں لیکن سمندر میں ایک چھوٹے سے جزیرے کو نیلسن کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔

سمندر دیکھ کر یعقوب آزاد کی تیراکی اور کشتی رانی کی خواہشات نے شدت اختیار کر لی۔ چنانچہ انہوں نے ایک کشتی بان سے ایک سو دس مصری پونڈ پر سودا کیا۔جس نے ہمیں ایک گھنٹہ بحرہ روم کی سیر کروانے کی حامی بھری۔ جتنا آزاد صاحب سمندر سے پیار کرتے ہیں اتنا میں اور منیر حسین ڈرتے ہیں۔ لیکن اب یعقوب آزاد نے ''پنگا'' لے لیا تو ہمیں اُن کا ساتھ دینا ہی تھا۔ مجھے یاد تھا کہ جب میں نے اہرام کے اندر جانے کا ''پنگا'' لیا تھا۔ تب میرا ساتھ تو یعقوب آزاد نے دیا تھا۔ہم کشتی میں بیٹھ کر سمندر میں اُترے تو میں گھبرایا۔سمندر میں اُترنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔سمندر کا اپنا ایک رعب اور وقار ہوتا ہے۔ جب سمندر کی دہشت اور خوف ناک مناظر دیکھے تو موت کے منظر نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔ایسے میں کلیہ طیبہ اور آیت الکرسی پڑھنی شروع کر دی۔

جب میں خوف سے کانپ رہا تھا تب یعقوب آزاد چہک رہے تھے۔میری پریشانی کو دیکھتے ہوئے بولے:''شروع شروع میں میرا بھی یہی حال ہوتا تھا۔لیکن ایک بار مجھے ایک بارات کے ساتھ سفر کرنا پڑا۔ باراتی ایک لانچ میں سفر کر رہے تھے کہ اچانک طوفان نے آن گھیرا۔ باراتی گھبرائے۔موت کو آنکھوں کے سامنے گھومتے دیکھ کر سب کو پسینے آنے لگے۔ بارات میں شامل ایک سیانے نے دولہا میاں کو مشورہ دیا کہ:''حضرت خضر علیہ السلام کے نام کی نیاز کیلئے پانی میں پیسے پھینکو۔'' جان کی خاطر دولہا میاں نے جھٹ جیب سے تمام پیسے نکال کر

منگلا جھیل میں پھینک دیئے۔ پتہ نہیں یہ دولہا میاں کی جیب خالی کرنے کی کرامت تھی یا ہواؤں نے اپنا رخ بدل لیا کہ جلد طوفان تھم گیا۔ یوں بارات بخیریت اپنی منزل پر پہنچی۔''

بدقسمتی سے آج ہمارے ساتھ کوئی سیانا بزرگ نہیں تھا۔ لیکن یعقوب آزاد نے اپنے سابق تجربے کی روشنی میں مشورہ دیا کہ:''نظامی صاحب اگر جیب میں پیسے نہیں تو سمندر میں کریڈٹ کارڈ ہی پھینک دو۔ ممکن ہے دور جدید کے تقاضے پورے کرتے ہوئے حضرت خضر علیہ السلام بھی نیاز کے پیسے کریڈٹ کارڈ کے ذریعے وصول کر لیتے ہوں۔'' اس مشورے پر ایک قہقہ بلند ہوا۔ اور ہمارا خوف جاتا رہا۔ اب ہم بھی سمندر میں کشتی کی سیاحت سے لطف اندوز ہور ہے تھے۔ بحرہ روم کا پانی انتہائی شفاف اور گہرا تھا۔ اس کا رنگ حقیقی معنی میں نیلگوں تھا۔ جب خوف اُترا تو منیر حسین نے کیمرہ نکال کر سمندر کے فوٹو اُتارنے لگے۔ ہم بھی ہنس ہنس کر پوز دینے لگے۔ بکاری اور حمام بھی چہک رہے تھے۔

سمندری سیر کے بعد ہم شاہ فاروق کے محل کے قریب ہی ہلٹن ہوٹل کے اندر چائے پینے کیلئے گئے۔ تب نماز ظہر کا وقت تھا۔ ہم نے دیکھا کہ ہوٹل کا تمام سٹاف منیجر سے ویٹر تک نماز کے لئے ایک ہی صف میں کھڑے تھے۔ ایک سوٹڈ بوٹڈ مصری نوجوان نے امامت کے فرائض ادا کیے۔ نماز کے بعد یعقوب آزاد کہنے لگے:''یہ خوشی کی بات ہے کہ ہمارے نوجوان اور اپنے آپ کو آفیسر کہلوانے والے لوگ بھی نمازیں ادا کر رہے ہیں۔''

نماز ظہر کے بعد ہم کار میں بیٹھ کر اسکندریہ کے اُس مقام پر پہنچے جہاں کسی زمانے میں مشہور عالم بندرگاہ تھی۔ گذشتہ صدی میں ہمارے ایشیائی جہازوں پر کام کیا کرتے تھے۔ جن کے جہاز یہاں رکتے تھے۔ ہمارے لوگ ان پڑھ تھے۔ جو اسکندریہ کو''علی جندرہ'' کے نام سے پکارتے تھے۔ میں اُن گلیوں میں گھومتا رہا جہاں ہمارے بزرگ گھوم پھر کر وقت گزارتے تھے۔ ممکن ہے اُن میں سے کوئی نہ کوئی اس سرزمین پر ایسا اُترا ہوگا۔ جو پھر یہاں کا ہو کر رہ گیا ہو۔ اور آج اُن کی نسلیں مصری بن کر یہاں ہی گھوم پھر رہی ہوں۔

دنیا کے پرانے بازاروں کی طرح اسکندریہ کے پرانے شہر کی گلیاں تنگ و تاریک، عمارتیں بوسیدہ، صفائی کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ گلیوں میں گاڑیوں کے ساتھ ساتھ ریڑھے اور گدھے گاڑیاں بھی بوجھ سے لدی شور مچاتی گزر رہی تھیں۔ قصابوں کی دکانوں کے باہر کتے

بھی دم دبائے بیٹھے قصاب کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ جوان نسل ماڈرن جب کے عمر رسیدہ خاتون باپردہ تھیں۔ بازار میں دکانیں اور اوپر رہائش کا بندوبست تھا۔ بالکل اپنے پاکستان کے پرانے بازاروں کی طرح بالکونیوں میں عورتوں نے کپڑے دھو کر خشک کرنے کیلئے ڈالے ہوئے تھے۔ بعض گھروں سے دھواں بھی نکل رہا تھا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ خاتون خانہ اب باورچی خانہ میں مصروف ہے۔ بچے گلیوں میں کھیل رہے تھے۔ جب گاڑی آتی تو کنارے کھڑے ہو جاتے۔ جب گاڑی گزر جاتی تو پھر کھیلنا شروع کر دیتے۔

مکانوں کی طرز تعمیر سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ کسی زمانے میں مچھیروں کا محلّہ تھا۔ ممکن ہے آج بھی ہو۔ چونکہ اسکندریہ تو مچھلی کی بہت بڑی منڈی ہے۔ یہ لوگ صبح سویرے ہی اپنی کشتیوں کو لیکر سمندر میں اُتر جاتے ہیں جہاں دن بھر بلکہ بعض اوقات رات بھر سمندر سے مچھلیاں پکڑتے رہتے ہیں۔ جو صبح مارکیٹ میں فروخت کر کے اپنا اور بچوں کا پیٹ پالتے ہیں۔

قدیمی شہر کی گلیوں میں گھومتے پھرتے ہم اسکندریہ کے مشہور مچھلی ہوٹل ''ابو اشرف انٹرنیشنل فش'' گئے۔ جہاں ایک تازہ مچھلی کا انتخاب کیا جو انہوں نے مصری طریقے کے مطابق پکا کر دی۔ ہوٹل میں ایک چھوٹا سا تالاب تھا۔ جس میں ہر طرح کی زندہ مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ گاہکوں کی فرمائش پر ہوٹل کے ملازم زندہ مچھلی پکڑ کر فوراً اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے مرچ مصالے لگا کر تیار کر کے کھانے کو پیش کرتے ہیں۔ ہم نے مچھلی کھائی اور کھانے کے ایک سوستر مصری پونڈ ادا کیے۔ لیکن اس ہوٹل کی جتنی مشہوری سنی تھی کھانا اُس کے برعکس نکلا۔ ہمارے لئے یہ کھانا پھیکا پھیکا سا تھا۔

اصل میں میرا دل تو پہلے ہی اُس وقت خراب ہو گیا تھا جب مصری لوگوں کو اس ہوٹل میں بیٹھے مختلف قسم کی مچھلیاں کھاتے دیکھا۔ جن میں ''سکراڑ Crab''، یعنی کیکڑا بھی شامل تھا۔ بچپن میں ہم ''سکراڑ'' اپنے گاؤں کی ندی میں دیکھ کر ڈر جاتے تھے۔ بچپن کا وہ خوف اب بھی موجود تھا۔ میں نے بکاری سے پوچھا کہ یہ لوگ سکراڑ کیوں کھاتے ہیں۔ تو بکاری نے سینہ تان کر بتایا کہ: ''اس سے جسم مضبوط اور بازو کے پٹھے مضبوط ہوتے ہیں۔''

یہاں قریب ہی نبی دانیال کی مسجد اور روضہ تھا۔ حضرت دانیال اللہ کے بڑے محبوب نبی تھے۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہیں کہ واقعی حضرت دانیال یہاں آئے اور اسی مقام پر فوت ہوئے

تھے۔ بلکہ ایک صاحب نے تو مجھے یہ بھی بتایا کہ حکیم لقمان بھی اسی مسجد میں دفن ہیں۔ لیکن ان باتوں کا کوئی ثبوت نہیں۔

بازار کی سیر کے بعد ہم دوبارہ ساحل سمندر کی طرف گئے جہاں سلطان اشرف قطبی کا قلعہ ہے۔ سلطان نے یہ قلعہ پندرویں صدی میں تعمیر کروایا تھا۔ یہ قلعہ اُس مقام پر ہے جہاں اسکندریہ کا مشہور زمانہ لائٹ ہاؤس تھا۔ جس کا شمار دنیا کے سات عجائبات میں ہوتا تھا۔ 492 فٹ بلند یہ لائٹ ہاؤس 279 ق م میں پٹولمی دوئم Ptolemy 2 نے تعمیر کروایا تھا۔ لائٹ ہاؤس کے میناروں میں ہر وقت آگ جلتی رہتی تھی۔ آگ کے ساتھ ایک بہت بڑا آئینہ نصب تھا جس میں آگ کی روشنی منعکس ہو کر دور دور تک نظر آتی تھی۔ یوں سمندر میں بھولے بھٹکے جہاز اپنا راستہ تعین کرتے تھے۔ ایک اندازہ کے مطابق سمندر میں 35 میل دور سے یہ روشنی نظر آ جاتی تھی۔ لائٹ ہاؤس کے اوپر پٹولمی کا بہت بڑا مجسمہ تھا۔ 1307ء میں ایک زبردست زلزلہ کی وجہ سے یہ لائٹ ہاؤس ہمیشہ کیلئے زمین بوس ہو گیا۔ بعد میں اُسی جگہ یہ قلعہ تعمیر کیا گیا۔

قلعہ سکندریہ ساحل سمندر کے ایک نکر پر ہے۔ جس کا ایک حصہ خشکی کے ساتھ اور باقی تینوں حصے سمندر کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ شام کے وقت یہاں بڑی رونق ہوتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے شہر کا شہر اس مقام پر جمع ہو کر سورج کو ڈوبتے دیکھنے آ گیا ہو۔ منیر حسین غروب آفتاب کے مناظر کو کیمرے کی آنکھ میں بند کرتے کرتے نظروں سے کہیں اوجھل ہو گئے۔ یعقوب آزاد اور بکاری نماز ادا کرنے چلے گئے۔ میں ساحل سمندر کے کنارے ایک بینچ پر بیٹھ کر سمندر کے دلفریب مناظر سے لطف اٹھانے لگا۔ میں نے دیکھا مصری بچے، جوان لڑکے اور لڑکیاں یورپی سیاحوں کے ساتھ باتیں کر کے خوش ہوتے ہیں۔ مجھے اکیلے بیٹھے دیکھ کر کچھ بچوں اور نوجوانوں نے گھیر لیا۔ اور باتیں کرنے لگے۔ باتوں باتوں میں میں نے پوچھ لیا کہ آپ خاص کر یورپی سیاحوں کے ساتھ ہی باتیں کیوں کرتے ہیں؟۔ جس پر لڑکوں نے بتایا کہ:

''ہم آپ لوگوں کے ساتھ انگریزی میں بات چیت کر کے اپنی انگریزی بول چال بہتر کر رہے ہیں۔ اسی مقصد کیلئے ہم سر شام یہاں آ کر مختلف سیاحوں سے ملکر اپنی انگریزی کے علم میں اضافہ کرتے ہیں۔''

اسکندریہ کے ساحل سمندر پر میری ملاقات ایک مصری خاتون سے ہوئی۔ جس کا نام

فاطمہ تھا اور وہ اسکندریہ یونیورسٹی میں تاریخ پڑھاتی تھی۔ فاطمہ سے میری ملاقات بڑی سودمند ثابت ہوئی جس نے اسکندریہ کے حوالے سے بڑی معلوماتی گفتگو کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ:

''ہم جس قلعہ کے صحن میں کھڑے ہیں اس کے قریب راس التین کے مقام پر جو عمارت نظر آ رہی ہے اسی میں مصر کے بادشاہ فاروق نے اپنی بادشاہیت سے دستبرداری کی ایک دستاویز پر دستخط کیے تھے۔ جس کے بعد مصر کے نئے حکمران ناصر صدر منتخب ہوئے تھے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ ناصر نے شاہ فاروق کو وہاں قریب ہی ساحل سمندر پر کھڑی ایک یارٹ Yacht پر بٹھا کر اٹلی بھیج دیا تھا۔ جہاں شاہ فاروق نے معزولی کی زندگی گزاری تھی۔''

پروفیسر فاطمہ کے خیال میں قلعہ کی دیوار جس سے سمندر کا پانی ٹکراتا ہے۔ اُسی پانی میں کوئی بیس فٹ کی گہرائی پر ملکہ حسن قلوپطرہ اور انتھونی دفن ہیں۔ اُس زمانے میں وہ جگہ خشک تھی لیکن بعد میں سمندر نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ قلعہ سے لیکر راس التین کے شاہی محل تک یہ جگہ جزیرہ فراعنہ کہلاتی ہے۔ یہ ملکہ حسن قلوپطرہ کی پسندیدہ جگہ تھی۔ وہ یہاں ہی بیٹھ کر بحرہ روم کے نظارے کیا کرتی تھی۔ اُس زمانے میں اس جگہ کو سکندریہ کی مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اور کسی نہ کسی صورت میں آج بھی حاصل ہے۔

اسکندریہ سے جانب مغرب ہی وہ صحرا ہے جس کی سرحدیں لیبیا سے ملتی ہیں۔ 1942ء میں جرمنی نے جنرل رومل کی قیادت میں اسکندریہ پر حملہ اسی طرف سے کیا لیکن برطانوی کمانڈر فیلڈ مارشل منٹگمری نے جرمنی کو شکست فاش دی تھی۔ جس میں نوے ہزار فوجی ہلاک ہوئے تھے۔''

فاطمہ ایک مدبر اور شائستہ خاتون تھی۔ جس نے اسکندریہ اور اُس کے اردگرد کی تاریخ اور ادب پر دلچسپ باتیں کرنے کے علاوہ مغرب کی اسلام دشمنی کے حوالے سے بڑی مدلل گفتگو کی۔ بقول فاطمہ پٹولمی Ptolemy نے اسکندریہ میں دنیا کی عظیم الشان لائبریری قائم کی تھی۔ جسے دوسری صدی میں عیسائیوں نے تباہ و برباد کیا۔ بہت سی کتابوں کو جلا دیا تھا۔ جب 646ء میں مسلمانوں نے مصر پر قبضہ کیا تو اسلام دشمنی میں مغرب نے دنیا میں یہ مشہور کر دیا کہ اسکندریہ کی لائبریری کو مسلمانوں نے تباہ کیا تھا۔ جب کہ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے چار سو سال پہلے ہی عیسائیوں نے اپنے پرانے عقائد کو منظر عام سے ہٹانے کی خاطر لائبریری کو آگ لگا کر ہزاروں

کتابوں کو جلا کر خاک کر دیا تھا۔

مغرب اور اسلام دشمن قوتیں مسلمانوں کو صفِ ہستی سے مٹانے میں مصروف ہیں۔ یہ کام روز اول سے ہو رہا ہے۔ لیکن دشمن کو ہمیشہ منہ کی کھانی پڑی۔ اسی تناظر میں فاطمہ نے ''فرعونِ وقت'' کا ذکر چھیڑتے ہوئے جب مسلمانانِ عالم کی موجودہ حالت زار، بے بسی، بے کسی پر بات کرتے ہوئے بتایا کہ آج کے مسلمان کے قوت ایمان کا یہ حال ہے کہ مسلمان مسلمان کا دشمن ہے۔ جو اپنے بھائیوں کو پکڑ پکڑ کر امریکہ کو فروخت کر رہا ہے۔ فاطمہ نے جب دنیا کا مستقبل کا نقشہ میرے سامنے پیش کیا تو میرے رونگٹھے کھڑے ہو گئے۔ میں سکتے کے عالم میں بس اُس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

شیشہ ہاؤس

شام ساڑھے چھ بجے ہم اسکندریہ سے قاہرہ کیلئے روانہ ہوئے۔ ابھی شہر کی حدود میں ہی تھے کہ گرین پلازہ کے ایریا میں ہلٹن ہوٹل کے قریب ایک کیفے ہاؤس میں چائے پینے کے لئے رکے۔ اندر گئے تو دیکھا یہ کیفے ہاؤس بڑا کشادہ اور مصری لوگوں سے کچھا کچھ بھرا ہوا تھا۔ مردوں کے ساتھ عورتیں بھی تھیں جو بڑی اداؤں سے شیشہ (حقہ) پی رہی تھیں۔ یورپ میں عورتوں کو سگریٹ اور شراب پیتے تو میں دیکھ چکا تھا۔ لیکن کسی عورت کو حقہ پیتے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ عورتیں بھی بڑے نشیلے انداز میں شیشے کی نلی کو منہ کے ساتھ لگا کر پوری طاقت کے ساتھ اُس کا دھواں کھینچ کر اپنے پھیپھڑوں کو بھرنے میں مصروف تھیں۔

مصریوں کو چائے کے ساتھ ساتھ شیشے سے بھی شغل کرتے دیکھا تو یعقوب آزاد نے بھی بیرے کو دو شیشے لانے کا حکم دیا۔ میں نے تو زندگی میں کبھی سگریٹ بھی نہیں پی۔ ڈرتے ڈرتے حقے کو ہاتھ لگایا تو ساتھیوں نے شیشے پینے کے کچھ طریقے سمجھائے لیکن وہ طریقے میرے سر کے اوپر سے گزر گئے۔ یہ منظر ایک مصری حسینہ دیکھ رہی تھی۔ جو شکل و صورت میں مثل قلوپطرہ تھی۔ قلوپطرہ ثانی اپنی کرسی سے اٹھ کر ہمارے پاس آئی اور بڑے پیار اور محبوبانہ انداز سے مجھے بتانے لگی کہ صاحب شیشے کی نلی کو اس طرح منہ میں ڈال کر ''چسکی'' لگاؤ تو مزہ آ جائے گا۔ مصری حسینہ کے سکھائے ہوئے طریقے کے مطابق میں نے ایک دو کش لگائے تو سرور آ گیا۔

یہ منظر دیکھ کر ہمام بولا: ''مجھے تو یہ عورت ملکہ نفراتیتی کی پڑپوتی نظر آتی ہے۔ ورنہ ''چسکی'' لگانے کی اتنی مہارت تو عام مصری عورتوں میں ہرگز نہیں''۔

جب مصری حسینہ میرے پاس بیٹھ کر مجھے شیشہ پینے کے گُر سیکھا رہی تھی تب یعقوب آزاد اور منیر حسین کے چہروں پر قدرے اُداسی تھی اور وہ ٹھنڈی آہیں بھر کر کہہ رہے تھے کاش ہم بھی اناڑی بن کر حضرت یعقوب نظامی کی طرح ایک ٹکٹ میں دو مزے لیتے۔ میں نے انہیں یاد دلایا کہ ابھی جب آپ ویٹرس سے چسکا لگا کر میرا دل جلانے کی کوشش کر رہے تھے اُس وقت آپ یہ بھول گئے تھے کہ اس گلشن میں علاج تنگئے داماں بھی ہے۔

ہمارے گلوکار

اب اندھیر چھا رہا تھا۔ اور ہمیں تقریباً ڈھائی سو کلومیٹر سفر طے کرتے ہوئے قاہرہ پہنچنا تھا۔ سفر پر روانہ ہوئے تو اِن لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے ہمارے ساتھیوں نے نغمے چھیڑے۔ منیر حسین اچھے فوٹو گرافر ہیں۔ لیکن اللہ میاں نے انہیں آواز بھی بڑی سریلی دے رکھی ہے۔ سب ساتھیوں کی فرمائش پر انہوں نے یہ غزل گا کر طلعت محمود مرحوم کی یادوں کو تازہ کیا۔

یہ ہوا یہ رات یہ چاندنی
تیری اک ادا پہ نثار ہے
مجھے کیوں نہ ہو تیری آرزو
تیری جستجو میں بہار ہے
تجھے کیا خبر اے او بے خبر
تیری اک نظر میں ہے کیا اثر
جو غضب میں آئے تو قہر ہے
جو مہربان ہو تو قرار ہے
تیری بات بات ہے دل نشیں
کوئی تجھ سے بڑھ کے نہیں حسین
ہے کلی کلی کی جواں مستیاں

تیری آنکھ کا یہ خمار ہے
یہ ہوا یہ رات یہ چاندنی
تیری اک ادا پہ نثار ہے

منیر حسین پتہ نہیں کس حسینہ کی اداؤں کو یاد کر کے بڑے سرور میں گا رہے تھے۔ انہیں گاتے دیکھ کر محمد بکاری بھی ترنگ میں آ کر پہلے دھیمے دھیمے اور پھر اونچی آواز میں گانے لگا۔ بکاری کی آواز میں رسیلے پن کی بجائے چبھن سی تھی۔ جو دل کو چھونے کی بجائے الٹا اثر دکھا رہی تھی۔ بکاری کے گانے کی آواز سن کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی غمگین ''کٹا'' (بھینس کا بچہ) رینگ رہا ہو۔ ایسے میں مجھے اپنا مرحوم ''کٹا'' بڑی شدت سے یاد آیا۔ جو کسی بیماری کی وجہ سے رات بھر اسی طرح رینگتا رہا تھا۔ صبح والد صاحب نے ڈنگروں کے ایک دیسی حکیم سے مشورہ کیا۔ جس نے کہا اسے مٹی کا تیل پلاؤ تو ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ مشورہ والد صاحب کے دل کو بھایا۔ مجھے پیسے دیکر دکان پر بھیجا۔ میں دوڑ کر مٹی کے تیل کی ایک بڑی بوتل بھروا کر لے آیا۔ والد صاحب نے مٹی کا تیل ''کٹے'' کو پلایا تو ہمارے دیکھتے ہی کٹا زمین پر گرا اور مر گیا۔

اس سے پہلے کہ میں بکاری کو مٹی کا تیل پلاتا۔ یعقوب آزاد نے حسب روایات بڑی ادا سے کوکا کولا کا ٹین کھولا اور بکاری جیسے بیبے بندے کو پلا کر دلی تسکین حاصل کی۔ ویسے میرا مقصد مٹی کا تیل پلا کر بکاری سے نجات حاصل کرنا نہیں بلکہ اس کی آہ و زاری سے نجات حاصل کرنا تھا۔ تا کہ دن بھر کی سیاحت سے جو لطف اٹھایا تھا اُس کا مزہ کرکرا نہ ہونے پائے۔

بڑی مشکل سے بکاری کو اس آہ و زاری سے روکا۔ تو اس کا دل رکھنے کی خاطر میں نے پوچھا بکاری صاحب آپ نے جو نغمہ ابھی چھیڑا تھا یہ تو صومالی زبان میں تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اس کا ترجمہ ہمیں بتا دیں تا کہ ہم اس کا مطلب سمجھ سکیں کہ صومالی نغمے کس موضوع پر لکھے جاتے ہیں۔ بکاری نے بتایا کہ یہ دوگانا تھا۔ یعنی ایک لڑکا لڑکی سے پوچھ رہا ہے کہ:

تم کنوئیں پر پانی لینے آئی ہو

اور خاموش کھڑی ہو
تمہارے گھر والے پیاسے ہیں
وہ پانی کا انتظار کر رہے ہیں
جلدی پانی بھر کر گھر جاؤ

لڑکی جواب دیتی ہے

پانی بھر کر گھر جانا
میرے لئے مشکل نہیں
میرے لئے مشکل یہ ہے کہ
مجھے کسی سے پیار ہو گیا

لڑکا کہتا ہے

کیا تمہیں پتہ ہے کہ
میری زبان خاموش ہونے سے منع ہو گئی ہے
میں صرف قرآن کی آیات پڑھتا ہوں
یا پھر تیرے حسن کی تعریف کرتا ہوں
چونکہ مجھے تجھ سے پیار ہو گیا
لیکن اس کے باوجود
میں اللہ تعالیٰ کو نہیں بھول سکا

بکاری نے جب گانے کا مفہوم سمجھایا تب ہم پر آشکارا ہوا کہ بکاری ہمارا خیال کیے بغیر سر نیچے کیے کیوں کافی عرصہ یہ نغمہ گاتا اور سر ہلاتا رہا۔ اس کے بعد ھمام کی باری تھی۔ ھمام نے چالاکی کرتے ہوئے۔ ان دنوں عرب دنیا کی مشہور مغنیہ نانسی عجرم کی کیسٹ لگائی تو نانسی کا ایک بھنگڑا نما عربی نغمہ بجنے لگا۔ اگرچہ عربی ہمیں سمجھ نہیں آتی تھی لیکن اُس کے باوجود ہم نغمہ سے لطف اٹھا رہے تھے۔ ممکن یہ موسیقی کا کمال تھا۔ عربی نغمہ کے بول تھے۔

انا يللى بحبك
انا يللى بحبك وحدى نا
انا يللى بريدك لى انا
انا يللى بعمرى ببقى انا
على وعدى يا وعدى لوحدى انا

الهوى يا حبيبى الهوى اسرار
حيرى وغيرى و شوق و نار
بتسال ليف بغار عليك
وقلبك علم قلبى يغار

الدنى بتحلا و انا وياك
غير عمرى بلحظة هواك
ماكان قلبى بيعرف حب
ولا عندو غالى لولاك

(ترجمہ)

میری جان میں صرف تم سے محبت کرتی ہوں
میں صرف تم سے محبت کرتی ہوں
میں صرف تمہیں چاہتی ہوں
میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ
پوری زندگی تم سے محبت کروں گی
حسد کی آگ اور ٹھنڈک سہتی رہوں گی

مجھ سے مت پوچھنا کہ
میں حسد کیوں کرتی ہوں؟
تم مجھے سیکھاؤ کہ کس طرح میں
تمہاری زندگی میں خوشیاں بھر سکتی ہوں
تمہاری باہوں میں رہ کر مجھے کوئی خوف نہیں
تمہارے ساتھ رہ کر مجھے کوئی غم نہیں



شمالی مصر کی سیر

نہر سویز
اسماعیلیہ
حضرت یوسف کا دیس
پورٹ سعید
حضرت موسیٰ اور فرعون کی کشمکش
قارون کے خزانے

شمالی مصر کی سیر

آج ہمیں مصر کے اُس علاقہ کی سیر کرنی تھی جہاں حضرت یوسف علیہ السلام کا پائے تخت تھا اور جہاں آپ نے اپنا خاندان اور بنی اسرائیل کو آباد کیا تھا۔ نو ہزار چھ سو پچاس مربع میل کا یہ علاقہ انتہائی سر سبز اور شاداب ہے۔ جو ڈیلٹا کے نام سے مشہور ہے۔ ہم نے بحرہ احمر سے بحرہ روم تک نہر سویز کے ساتھ ساتھ سفر کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور جب اپنی رہائش گاہ سے چلے تو صحرا کے بیچوں بیچ سفر کرتے ہوئے ایک گھنٹہ میں سویز شہر پہنچ گئے۔

نہر سویز

سویز ایک شہر ہے۔ جو بحرہ احمر کے کنارے آباد ہے۔ شہر کے قریب بحرہ احمر کا اختتام اور نہر سویز کا آغاز ہوتا ہے۔ توفیق نامی بندرگاہ بھی یہاں ہے۔ جب ہم بحرہ احمر اور نہر سویز کے سنگھم پر پہنچے تو اُس وقت جہاز سمندر سے نکل کر نہر سویز میں داخل ہو رہے تھے۔ یہ ایک تفریحی مقام ہے۔ جہاں مصری لوگ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھے گپ شپ لگانے کے ساتھ ساتھ گھر سے لایا ہوا کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ جوان لڑکے اور لڑکیاں چہل قدمی کر رہیں تھیں۔ ہم کافی عرصہ یہاں بیٹھے بحرہ احمر، نہر سویز اور مصری لوگوں کو دیکھ کر دل بہلاتے رہے۔

نہر سویز کا آغاز دیکھنے کے بعد ہم نے نہر کے ساتھ ساتھ سفر شروع کیا۔ جس سڑک پر ہم جا رہے تھے اُس کے دائیں طرف نہر تھی۔ نہر کے اُس پار براعظم ایشیا اور صحرائے سینا کا

علاقہ تھا۔ سڑک پختہ تھی۔ ہمارے بائیں طرف مصر کا سرسبز وشاداب ڈیلٹا کا علاقہ تھا۔ لہلاتے کھیتوں میں مصری لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

ڈیلٹا میں جو نہری نظام کا جال بچھا ہوا ہے۔ جو بہت پرانا ہے۔ آج سے چار ہزار سال پہلے 2100 ق م میں یہاں پہلی نہر کھودی گئی تھی۔ اُس وقت مصر میں فراعنہ کا دور تھا اور بحرہ احمر کھاری جھیل Bitter Lakes تک پھیلا ہوا تھا۔ جہاں سے بحرہ روم تک کاشت کاری کی غرض سے نہر کھودی گئی تھی۔ جس کے نشانات آج بھی موجود ہیں۔ اور نہر فراعنہ کے نام سے جانی جاتی ہے۔ یہ نہر تقریباً ایک ہزار سال تک زیر استعمال رہی۔ چھٹی صدی قبل مسیحی میں اس نہر کو دوبارہ کھودا گیا۔ جسے بطلیموس دوم نے بحرہ روم تک بڑھایا تھا۔

موجودہ نہر فرانسیسی انجینئر نگ کا کمال ہے۔ جو کاشت کاری کی بجائے جہاز رانی کیلئے کھودی گئی اور غالباً دنیا کی پہلی نہر ہے جس میں جہاز گزرتے ہیں۔ اس پروجیکٹ کے نگران اعلیٰ ایک فرانسیسی آرکیٹیک فریڈان اینڈ ڈی لیسیپ Fredinand de Lesseps تھے۔ یہ صاحب مصر میں فرانس کے قونصلر تھے۔ جنہوں نے مصری حکمرانوں کو قائل کیا کہ دونوں سمندروں کو ملانے سے دنیا میں مصر کی اہمیت اور افادیت بڑھنے کے ساتھ ساتھ معاشی فائدے بھی ہونگے۔ مصری حکمرانوں کے قائل ہوتے ہی منصوبہ بندی کرتے ہوئے 22 اپریل 1859ء کو ایک روشن صبح نہر سویز کی کھدائی کا آغاز ہوا۔ پچیس ہزار مزدوروں نے مسلسل دس سال تک کام کر کے فرانسیسی انجینئر وں کی نگرانی میں 171 کلومیٹر نہر کھود ڈالی جو بحرہ احمر کو بحرہ روم سے ملاتی ہے۔ کھدائی کے دوران سینکڑوں مزدور لقمہ اجل بنے۔ 17 نومبر 1869 کو اس نہر کا افتتاح ہوا اور سب سے پہلے ایک برطانوی جہاز وہاں سے گزرا۔ اتفاق کچھ ایسے ہوا کہ اس جہاز میں سرسید احمد خان بھی سفر کر رہے تھے۔ جو اپنے بیٹے محمود کو ولایت میں اعلیٰ تعلیم کی خاطر ساتھ لے جا رہے تھے۔

نہر سویز کی کھدائی کا آغاز فرانس، آسٹریا اور روس کے تعاون سے ہوا۔ جب یہ منصوبہ کامیاب ہوتا نظر آیا تو چھ سال بعد برطانیہ بھی اس میں شامل ہوگیا۔ نہر سویز کی تعمیر سے ایشیاء اور یورپ کے درمیان جہازوں کو سفر کرنے میں بہت آسانی ہوئی۔ اس سے قبل جہاز یورپ سے آتے ہوئے جب جبل طارق پہنچتے تو وہاں سے براعظم افریقہ کا چکر لگانے کے بعد

عدن سے ہوتے ہوئے برصغیر جاتے تھے۔ اب نہر سویز کی وجہ سے یورپی جہاز جبل طارق سے بائیں مڑ کر لیبیا کے ساحل کے ساتھ ساتھ مصر کی بندرگاہ سکندریہ اور پھر پورٹ سعید سے نہر سویز کے ذریعے بحرہ احمر میں پہنچتے ہیں۔ یہ نہر پورٹ سعید سے اسماعیلیہ پہنچتی ہے۔ جہاں قریب جھیل تمسہ اور پھر کھاری جھیل ہے۔ ان جھیلوں کے بعد نہر کا دوبارہ آغاز ہوتا ہے۔ جو سویز کے مقام پر بحرہ احمر میں مل جاتی ہے۔ نہر سویز ایک ہزار گز چوڑی ہے۔ اس کی گہرائی کا یہ عالم ہے کہ اس میں سے گزرتے وقت جہاز چالیس فٹ گہرے پانی میں ڈوبا ہوتا ہے۔ یقیناً نہر کی گہرائی اس سے کافی زیادہ ہوگئی۔

ہمارے ساتھی یعقوب آزاد جو پیشہ کے لحاظ سے انجینئر ہیں نے ہمیں بتایا کہ:

''بحری جہاز جب نہر سویز کے قریب پہنچتے ہیں تو اُن کا کنٹرول مصری کپتان سنبھال لیتے ہیں جو بڑے ماہرانہ طریقے سے جہاز کو بحرہ احمر سے بحرہ روم کے کھلے پانی میں پہنچا دیتے ہیں۔ کپتان کی رہنمائی کیلئے نہر پر گیارہ ریڈار سسٹم نصب ہیں جو کپتان کو صحیح سمت کی نشاندہی کرتے رہتے ہیں۔ ایک سال میں تقریباً بیس ہزار سے زیادہ جہاز نہر سویز سے گزرتے ہیں۔ یہ نہر مصری حکومت کیلئے سونے کی کان ہے۔ سیاحت کے بعد آمدنی کا یہ سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق مصر کو اس سے سالانہ دو بلین امریکی ڈالر آمدنی ہوتی ہے۔ 1956ء میں مصر نے جب اسوان ڈیم بنانے کا منصوبہ بنایا تو دنیا کے امیر ملکوں سے مالی تعاون مانگا۔ جنہوں نے پیسے دینے سے انکار کر دیا۔ ردعمل میں صدر جمال ناصر نے نہر سویز کو قومی ملکیت میں لیا تھا۔ ناصر نے جوں ہی اسے قومی ملکیت میں لیا تو برطانیہ، فرانس اور اسرائیل نے نہر سویز پر زبردست بمباری کی۔ جس سے نہر بری طرح تباہ ہوگئی۔ پھر 1967ء میں عرب اسرائیل جنگ کے نتیجہ میں یہ نہر بند کر دی گئی۔ جسے 1975ء میں دوبارہ کھولا گیا تھا۔''

سویز شہر سے اسماعیلیہ تک ہمارا سفر بڑا خوبصورت تھا۔ دائیں طرف نہر اور بائیں طرف سرسبز کھیت اسی ماحول میں سفر کرتے ہوئے ہم چار بجے کے قریب اسماعیلیہ پہنچے۔

اسماعیلیہ

سویز اور پورٹ سعید کے درمیان کسی زمانے میں التمسہ نامی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ گاؤں کا نام قریب کی جھیل تمسہ کی وجہ سے پڑا تھا۔ اس جھیل کو لوگ ''جھیل مگر مچھ'' بھی کہتے ہیں۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ کسی زمانے میں یہاں مگرمچھ ہوتے تھے۔ جن کی اُس زمانے میں پوجا کی جاتی تھی۔ جب زمانہ بدلا تو لوگوں کے خیالات بھی بدلے۔ اب یہ جھیل ''آبی مگرمچھوں'' سے پاک ہے۔ لیکن ''خشکی والے مگرمچھوں' کی ایک انوکھی نسل امریکہ اور یورپ سے آ کر اس نہر پر قبضہ کرنے کی کئی بار ناکام جسارت کر چکی ہے۔ تاکہ نہر مصر کی سرزمین پر بہنے اور اس کے ثمرات امریکہ اور اس کے حواریوں کو ملیں۔

نہر سویز کھودنے والی کمپنی نے اس گاؤں کو اپنا مرکز بنایا تھا۔ بعد میں یہ گاؤں بڑھتے بڑھتے ایک شہر کی شکل اختیار کر گیا۔ مصری حکمران اسماعیل پاشا کی مناسبت سے شہر کا نام اسماعیلیہ رکھا گیا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام سے اس گاؤں سے کوئی تعلق نہیں۔

اسماعیلیہ قاہرہ سے 75 کلومیٹر دور ہے۔ جس کی آبادی دو لاکھ کے قریب ہوگی۔ شہر ماڈرن ہے۔ مصر کے امیر لوگوں نے تفریح کیلئے یہاں نہر کے کنارے مکان بنائے ہوئے ہیں۔ نہر سویز کا نگران اعلیٰ فرڈان اینڈ ڈی لیسیپ جس مکان میں مقیم رہا۔ وہاں آج کل میوزیم ہے۔ نہر سے متعلقہ دستاویزات، نقشے، پلان اور تصویریں اس میوزیم میں رکھی ہوئی ہیں۔ اسماعیلیہ سے صحرائے سینا جانے کیلئے نہر سویز کو عبور کرنا پڑتا ہے۔ اس نہر پر جہازوں کی آمد ورفت میں رکاوٹ پڑنے کی وجہ سے پل تعمیر کرنا مشکل تھا۔ لیکن اب اسماعیلیہ اور پورٹ سعید کے درمیان قنطیر کے مقام پر ایک انتہائی اونچا پل تعمیر کیا گیا ہے۔ جس کے اوپر سے ٹریفک اور نیچے سے جہاز گزرتے ہیں۔

اسماعیلیہ باغات کا شہر کہلاتا ہے۔ شہر کے گردونواح میں خوبصورت باغات اور پہلو میں نہر سویز بہتی ہے۔ سویز کینال یونیورسٹی کا مین کیمپس یہاں ہے۔ جس میں زراعت، آب

رسائی، نہری نظام، سائنس اور میڈیکل کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ مصر کی نامور یونیورسٹی ہے۔ جس کے پورٹ سعید اور سویز میں بھی کیمپس ہیں۔ سویز کیمپس میں پٹرولیم کے شعبے بھی ہیں۔ یونیورسٹی میں مقامی طلباء کے علاوہ صحرائے سینا کے طلباء بھی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ طلبہ کے ساتھ ساتھ طالبات بھی بڑھ چڑھ کر تعلیم میں حصہ لے رہی ہیں۔

اسماعیلیہ میں نہر سویز کے علاوہ مقامی عجائب گھر، ڈی لیسپ کا عجائب گھر، نہر سویز ریسرچ سنٹر اور گردونواح کے تاریخی مقامات بڑے دلچسپ اور سیاحوں کے دل مو لیتے ہیں۔

اسماعیلیہ سے نہر سویز کو سٹیمر کے ذریعے عبور کیا جاتا ہے۔ ہم بھی اپنی گاڑی کے ساتھ قطار میں کھڑے ہو گئے۔ جب سٹیمر کنارے پر رکا تو ہم اپنی گاڑی چلاتے ہوئے اس میں جا پہنچے۔ اس سروس کے کوئی پیسے نہیں لیے جاتے۔ گاڑی کو پارک کر کے ہم اوپر جا کر نہر سویز اور اُس میں سے گزرنے والے جہازوں کے نظارے کرنے لگے۔ سٹیمر نے ہمیں نہر کی دوسری طرف صحرائے سینا کی طرف جا اُتارا۔ ہم دو منٹ کے اندر اندر براعظم افریقہ سے ایشیاء میں پہنچ چکے تھے۔ دوسری طرف ایک پختہ سڑک الارش نامی شہر کو جاتی تھی۔ الارش بحرہ روم کے کنارے مصر کا آخری شہر ہے۔ جس کے بعد فلسطین کا علاقہ خان یونس شروع ہو جاتا ہے۔

اسماعیلیہ سے فلسطین جانے والی سڑک اُسی راستے پر تعمیر کی گئی ہے جسے زمانہ قدیم میں آمد و رفت کیلئے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہی سڑک فلسطین میں حبرون سے ہوتی ہوئی بیت المقدس اور کنعان تک جاتی ہے۔ قیاس ہے کہ اسی راستے پر حضرت یوسف علیہ السلام کو غلام کی حیثیت سے ایک تجارتی قافلے کے ساتھ مصر لایا گیا تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی بھی اسی راستے سے غلہ خریدنے مصر آتے رہے اور پھر وہ وقت بھی آیا جب حضرت یعقوب علیہ السلام بھی حضرت یوسف علیہ السلام سے ملنے اسی راستے سے مصر آئے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام حبرون یعنی الخلیل سے بیر شبع کے مقام سے گزر کر صحرا میں سے گزرتے ہوئے وادی الحمام سے ہوتے ہوئے مصر پہنچے تھے۔

قاہرہ کے بعد دریا نیل آہستہ آہستہ مختلف حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ پانی کی فراوانی کی بدولت قاہرہ سے بحرہ روم تک کا تمام علاقہ سرسبز، زرخیز اور شاداب ہے۔ حضرت یوسف کے زمانے میں اس علاقہ کا نام جشن تھا۔ جہاں حضرت یوسف نے بنی اسرائیل کو آباد کیا

تھا۔

قیاس ہے کہ جب حضرت ابراہیم مصر تشریف لائے تو وہ بھی اسی راستے سے آئے تھے۔ جن کا قیام ڈیلٹا کے علاقہ میں رہا۔ اور حضرت ہاجرہ سے شادی کر کے واپس حبرون چلے گئے تھے۔ حضرت موسیٰ کے ہاتھوں جب ایک آدمی قتل ہو گیا تھا تو وہ بھی اسی راستے سے ہوتے ہوئے مدین کی طرف گئے تھے۔

ہم اسماعیلیہ سے سٹیمر پر بیٹھ کر صحرائے سینا میں پہنچے تو وہاں نہر کے کنارے ایک کیفے ہاؤس سے مشروب پینے کے علاوہ نہر کے کنارے گھومتے اور بحری جہازوں کو گزرتے دیکھتے رہے۔ اس دوران منیر حسین خوبصورت مناظر کو کیمرے کی آنکھ میں بند کرتے رہے۔ ہم دوبارہ سٹیمر میں بیٹھے اور واپس دوسرے کنارے اُتر کر دوبارہ نہر سویز کے ساتھ ساتھ پورٹ سعید کی طرف سفر شروع کر دیا۔ یہ بڑا پر لطف سفر تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ جہاز کافی تعداد میں مناسب رفتار سے سفر کر رہے تھے۔ ہم جہازوں کے ساتھ ساتھ سڑک کے ذریعے سرسبز کھیتوں اور دیہاتوں کے قریب سے گزرتے ہوئے پورٹ سعید پہنچے۔

پورٹ سعید

پورٹ سعید ایک جزیرہ نما بندرگاہ ہے۔ جس کے تینوں طرف سمندر اور ایک طرف خشکی ہے۔ جو اسے ملک کے دوسرے حصوں سے ملاتی ہے۔ یہ دنیا کی چوڑی ترین بندرگاہوں میں سے ایک ہے۔ اس کی بنیاد انیسویں صدی کے وسط میں پڑی۔ یہ ڈیوٹی فری ایریا ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسے پاکستان میں باڑہ مارکیٹ اور لنڈی کوتل ہیں۔ پورٹ سعید میں دنیا بھر کے مشہور برانڈ کی اشیاء نہایت ارزاں دستیاب ہیں۔ جس طرح ہمارے دیس میں پٹھان صندوق میں چیزیں ڈالے گلی گلی فروخت کرتے ہیں اس طرح یہاں بھی گلیوں میں دوسرے ممالک کا مال ارزاں مل جاتا ہے۔ شہر کی سب سے خوبصورت عمارت پورٹ سعید اتھارٹی کی عمارت ہے۔ اس مقام پر نہر سویز بحرہ روم میں ملتی ہے۔

ہم بازار میں گھومتے پھرتے ایک کیفے ہاؤس گئے جہاں چائے پی۔ کیفے کا معیار غریب نواز قسم کے کیفے ہاؤس جیسا تھا۔ بندرگاہوں کے قریب اکثر ایسے ہی کیفے ہوتے ہیں۔

چائے پی کر ہم بندرگاہ پر لنگر انداز جہازوں کو دیکھتے رہے۔ پورٹ سعید بڑا شہر نہیں۔ شہر سے ایک ہی سڑک باہر نکلتی ہے۔ جس کے آغاز میں کسٹم احکام کے پوسٹ ہیں جو ہر گاڑی کی تلاشی لیتے ہیں کہ کسی نے یہاں کی ڈیوٹی فری مارکیٹ سے کوئی ناجائز فائدہ تو نہیں اٹھایا۔ ہماری گاڑی کو بھی چیک کیا گیا۔ ہم پورٹ سعید سے نکلے تو نئے تعمیر ہونے والے موٹروے پر سفر کرنے لگے۔ واپسی پر ہمیں اسماعیلیہ کی بجائے ڈیلٹا کے درمیان میں سے گزرنا تھا تاکہ ہم اُس علاقہ کو دیکھ سکیں جہاں کسی زمانے میں بنی اسرائیل آباد تھے۔ پورٹ سعید کے برابر بحرہ روم کے کنارے دمیاط کے مقام پر دریا نیل کا ایک بڑا حصہ سمندر میں گرتا ہے۔

پورٹ سعید سے قاہرہ تک انتہائی خوبصورت موٹروے ہے۔ میں یورپ سمیت دنیا کے بیشتر ممالک کا سفر کر چکا ہوں لیکن اس سے خوبصورت اور بالکل سیدھا موٹروئے میں نے کسی اور ملک میں نہیں دیکھا۔ یہاں گاڑی چلاتے اور گاڑی میں سواری کرتے ہوئے بڑا مزہ آ رہا تھا۔ ہمارے ساتھی یعقوب آزاد ڈرائیونگ کرنے کے رسیا ہیں۔ جو بار بار ڈرائیونگ سیٹ کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ لیکن ظالم ڈرائیور نے ان کی دلی مراد پوری نہ ہونے دی۔

حضرت ہاجرہ کا گاؤں

پورٹ سعید سے نہر سویز کے اُس پار فلسطین کی طرف ''تل الفرما'' نامی ایک گاؤں ہے جسے پلوزئیم بھی کہا جاتا ہے۔ یہ گاؤں ساحل سمندر سے تقریباً دو میل کے فاصلہ پر ہوگا۔ جو اب پورٹ سعید کی حدود میں شامل ہو چکا ہے۔ یہ قدیمی بندرگاہ ہے۔ فراعنہ کی یہاں فوجی چھاؤنی تھی۔ روایت ہے کہ حضرت ہاجرہ اسی گاؤں میں پیدا ہوئیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شادی کے بعد یہاں سے حبرون چلی گئیں تھیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پیدائش کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مکہ میں جا بسایا۔ اُس وقت مکہ ایک ویران ریگستان تھا۔ حضرت ہاجرہ نے صفا و مروہ نامی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے دامن میں اپنا خیمہ لگایا اور خود پانی کی تلاش میں قریبی پہاڑیوں پر چلی گئیں۔ خیمہ کے قریب ہی حضرت اسماعیل علیہ السلام زمین پر لیٹے پیاس سے تڑپ رہے تھے۔ یہ منظر ماں کیلئے ناقابل

برداشت تھا۔ چنانچہ عالم اضطرابی میں حضرت ہاجرہ نے دونوں پہاڑیوں پر سات چکر لگائے لیکن پانی نہیں ملا۔ مایوس ہوکر جب بچے کو دیکھا تو حضرت اسماعیل علیہ السلام پیاس سے تڑپ تڑپ کر جہاں ایڑیاں رگڑ رہے تھے وہاں سے پانی کا ایک فوارہ پھوٹ پڑا۔ پانی اس جوش سے زمین سے نکل رہا تھا کہ اگر حضرت ہاجرہ اردگرد حصار نہ بناتیں اور پانی سے ٹھہراؤ کی درخواست نہ فرماتیں تو پانی سیلاب کی شکل اختیار کرسکتا تھا۔ حضرت ہاجرہ کی درخواست پر پانی میں ٹھہراؤ پیدا ہوا۔ حضرت ہاجرہ نے پہلے حضرت اسماعیل کو اور پھر خود پانی پیا۔ وہ دن اور آج کا دن دنیا بھر کے لاکھوں مسلمان آب زم زم کا یہ پانی پیتے اور اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔

مصر کے مقامی لوگ ''تل الفرما'' نامی گاؤں کو حضرت ہاجرہ کی مناسبت سے ''ام العرب'' کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔

بنی اسرائیل کا علاقہ

پورٹ سعید سے قاہرہ واپسی پر ہم بالائی مصر کے اُس علاقہ سے گزرے جہاں کسی زمانے میں حضرت یوسف علیہ السلام کی حکومت تھی۔ تب یہ علاقہ جشن کہلاتا تھا۔ مصر کا یہ علاقہ انتہائی سرسبز اور زرخیر ہے۔ جو قاہرہ، اسماعیلیہ، پورٹ سعید اور سکندریہ کے درمیان پھیلا ہوا ہے۔ دریانیل قاہرہ کے بعد جب اس علاقہ میں داخل ہوتا ہے تو مختلف شاخوں میں تقسیم ہوکر اس پورے علاقے کو سیراب کرتا ہے۔ فراعنہ کے دور میں اس کی سات بڑی شاخیں تھیں۔ اب بھی اس کی دو بڑی شاخیں ہیں۔ جن سے متعدد نہریں نکال کر پورے علاقہ میں پھیلا دی گئی ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ علاقہ سیراب ہوسکے۔ چاول، گندم، مکئی، گنا اور کپاس یہاں کثرت سے پیدا ہوتی ہے۔ فصلوں کے ساتھ ساتھ کینو، مالٹے، خوبانی، ناشپاتی، زیتون، انجیر، سیب، کیلا، آم اور انار سمیت مختلف اقسام کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ فراعنہ کے زمانے سے آج تک یہی علاقہ پورے مصر بلکہ اردگرد کے علاقے کی غذائی ضروریات پوری کرتا آرہا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اسی علاقہ میں بنی اسرائیل کو آباد کیا تھا۔ اس کا آغاز کچھ اس طرح ہوا کہ مصر کی سرحدوں کے قریب سامی نسل کے قبائل جو فلسطین، شام، کوہ سینا اور مغربی ریگستان میں گلہ بانی کرتے تھے نے مصر پر حملہ کرکے فراعنہ کو اس علاقہ سے مار بھگایا۔ مصر

کے علاقہ ڈیلٹا پر قبضہ کر کے ان گڈریئے حکمرانوں نے اپنا دارالحکومت ایورس Avaris کے مقام پر قائم کیا تھا۔ جواب Tell-el-Daba تل الدابہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ جگہ اسماعیلیہ سے کوئی تیس کلومیٹر ڈیلٹا کی طرف واقع ہے۔ اس وقت تل الدابا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ حال ہی میں فرانسیسی ماہرین آثار قدیمہ نے یہاں کھدائی کی تو تقریباً دو کلومیٹر میں پھیلے ہوئے کھنڈرات ڈھونڈ نکالے۔ کھنڈرات ایک اعلیٰ شان دارالحکومت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ کھدائی کا کام جاری ہے۔

جب چرواہے حکمران مصر پر قابض ہوئے تب فراعنہ کا دارالحکومت ممفیس میں تھا۔ جب تک نیا دارالحکومت تعمیر نہیں ہو جاتا تب تک چرواہے ممفیس میں رہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام ممفیس کے بازار میں فروخت ہوئے اور وہاں ہی عزیز مصر کے گھر میں پرورش پاتے رہے۔

چرواہے بادشاہوں کا ممفیس سے ایورس دارالحکومت منتقل کرنے کی وجہ غالباً یہی تھی کہ یہ علاقہ زرخیز اور سرسبز تھا۔ یہاں سے اُن کا اپنا وطن بھی قریب تھا۔ اُس زمانے میں کاشت کاری سب سے بڑا ذریعہ آمدن تھی۔ چرواہے مصری دیوتاؤں کی پوجا بھی نہیں کرتے تھے۔ جب کہ ممفیس میں جتنے مندر اور عبادت گاہیں تھیں وہاں فراعنہ کے اپنے دیوتے تھے۔ جب نیا دارالحکومت تعمیر ہوا تو چرواہے حکمرانوں نے اپنے ساتھ لائے ہوئے دیوتاؤں کی عبادت گاہیں تعمیر کر کے اُن کی عبادت شروع کر دی تھی۔

اللہ تبارک تعالیٰ ہر پیغمبر کو ایک خاص علم دیکر دنیا میں بھیجتے ہیں۔ ایسا علم جس کی اُس زمانے میں زیادہ چرچے ہوں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو خواب کی تعبیر اور اُس کی تہہ تک پہنچنے کا علم عطا کیا گیا تھا۔ عوام میں یہ بات اُس وقت ظاہر ہوئی جب حضرت یوسف علیہ السلام قید میں تھے۔ اُس دوران اپنے ساتھ قید کاٹنے والے دو قیدیوں کو اُن کی خواب کی تعبیر بتائی تھی۔ جو بعد میں سچ ثابت ہوئی۔ اُن قیدیوں میں سے ایک بادشاہ وقت کی خدمت پر مامور ہوا تھا۔ اور دوسرے کو قتل کر دیا گیا تھا۔ جو قیدی بادشاہ کی خدمت پر مامور ہوا تھا وہ ایک دن دربار میں موجود تھا جب بادشاہ نے ایک خواب کا ذکر کیا جو اُس نے دیکھا تھا۔ اس واقعہ کا ذکر قرآن پاک کی سورہ یوسف میں یوں آیا ہے:

ایک روز بادشاہ نے کہا'' میں نے خواب دیکھا ہے کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دُبلی گائیں کھا رہی ہیں اور اناج کی سات بالیں ہری ہیں اور دوسری سات سُوکھی۔ اے اہل دربار مجھے اس خواب کی تعبیر بتاؤ اگر تم خوابوں کا مطلب سمجھے ہو''۔

بادشاہ نے درباریوں سے خواب کی تعبیر پوچھی تو قید سے رہائی پانے والے خدمتگار کو حضرت یوسف علیہ السلام یاد آئے۔ چنانچہ بادشاہ سے اجازت لیکر وہ جیل میں گیا اور حضرت یوسف علیہ السلام سے بادشاہ کے خواب کا مطلب پوچھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب کی جو تعبیر بتائی اُس کا ذکر قرآن پاک کی سورہ یوسف میں یوں آیا ہے:

یوسف نے کہا'' سات برس تک لگاتار تم لوگ کھیتی باڑی کرتے رہو گے۔ اس دوران میں جو فصلیں تم کاٹو اُن میں سے بس تھوڑا سا حصہ جو تمہاری خوراک کے کام آئے نکالو اور باقی کو اس کی بالوں ہی میں رہنے دو۔ پھر سات برس بہت سخت آئیں گے۔ اُس زمانے میں وہ غلہ کھا لیا جائے گا جو تم اُس وقت کے لیے جمع کرو گے۔ اگر کچھ بچے گا تو بس وہی جو تم نے محفوظ کر رکھا ہو۔ اس کے بعد پھر ایک سال ایسا آئے گا جس میں باران رحمت سے لوگوں کی فریاد رسی کی جائے گی اور وہ رس نچوڑیں گے۔''

خواب کی تعبیر سن کر بادشاہ حضرت یوسف علیہ السلام کی دانائی کا قائل ہوا اور انہیں قید سے رہائی کا حکم دیا۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نے رہائی پانے سے قبل بادشاہ سلامت سے پوچھا: اُن عورتوں کا کیا معاملہ ہے۔ جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ اس پر بادشاہ نے اُن عورتوں کو طلب کر کے پوچھا تو سب نے یک زبان ہو کر کہا'' حاشا للہ، ہم نے تو اُس میں بدی کا شائبہ تک نہ پایا۔'' حضرت یوسف علیہ السلام کا عورتوں سے صفائی لینے کا یہ مقصد تھا۔ کہ عزیز مصر یہ نہ سمجھتے رہیں کہ یوسف نے میری عدم موجودگی میں خیانت کی ہے۔

جب بادشاہ کی موجودگی میں حضرت یوسف پر لگائے گئے الزامات دور ہوئے۔ تو پھر

بادشاہ نے حکم دیا ''اُنہیں میرے پاس لاؤ تاکہ میں ان کو اپنے لیے مخصوص کرلوں''۔ حضرت یوسف جب عزیز مصر کے دربار میں حاضر ہوئے تو اپنی دیانت اور شرافت کی بدولت حکومتی اقتدار مانگا۔ جسے عزیز مصر نے ان کے حوالے کردیا۔ اس واقعہ کا قرآن پاک کی سورہ یوسف میں یوں ذکر آیا ہے:

''یوسف نے کہا، ملک کے خزانے میرے سپرد کیجئے میں حفاظت کرنے والا ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں۔ اس طرح ہم نے اُس سرزمین میں یوسف کے لئے اقتدار کی راہ ہموار کی۔ وہ مختار تھا کہ اس میں جہاں چاہے اپنی جگہ بنائے۔ ہم اپنی رحمت سے جن کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں۔ نیک لوگوں کا اجر ہمارے ہاں ضائع نہیں جاتا۔''

میرے خیال میں حضرت یوسف کی حیثیت موجودہ زمانے کے وزیر اعظم کی تھی۔ چونکہ ملک کا آئینی حکمران ابوفیس Apophis بادشاہ تھا۔ جس کا قانون مصر میں رائج تھا۔ میری اس بات کی تائید قرآن پاک سورہ یوسف میں بیان کیے گئے اُس واقعہ سے بھی ہوتی ہے جس میں حضرت یوسف نے جب اپنے بھائی بنیامین کے سامان میں شاہی پیمانہ رکھوادیا تھا۔ پھر جب وہ جانے لگے تو شاہی ملازمین نے اُنہیں پکارا کہ ہمارا شاہی پیمانہ غائب ہوگیا ہے۔ جواب میں حضرت یوسف کے سوتیلے بھائیوں نے کہا کہ ہم اس ملک میں فساد کرنے نہیں آئے اور ہم چوریاں کرنے والے لوگ نہیں۔ پھر حضرت یوسف کے سوتیلے بھائیوں نے خود ہی سزا تجویز کردی کہ جس کے سامان سے چیز نکلے وہ آپ ہی اپنی سزا میں رکھ لیا جائے، ہمارے ہاں تو ایسے ظالموں کو سزا دینے کا یہی طریقہ ہے۔ اس کے بعد قرآن پاک سورہ یوسف میں ارشاد خداوندی ہے کہ:

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ مَا كَانَ لِيَاخُذَ اَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ اِلَّا اَنْ يَشَاءَ اللّٰهُ

اس طرح ہم نے یوسف کی تائید اپنی تدبیر سے کی۔ اُس کا یہ کام نہ تھا کہ بادشاہ کے دین (یعنی مصر کے شاہی قانون) میں اپنے بھائی

کو پکڑتا اِلا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت یوسف تھے تو ملک مصر میں با اختیار لیکن وہاں حکم مصر کے بادشاہ کا چلتا تھا۔ جس سے میری اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ حضرت یوسف وزیر اعظم یا وزیر خزانہ کی حیثیت سے مصری حکومت میں شامل تھے۔ اگر ان کی حیثیت مختار کل کی ہوتی تو حضرت یوسف جو اللہ کے پیغمبر بھی تھے ملک میں قانون الٰہی کا نفاذ کرتے۔

حضرت یوسف جب اقتدار میں شریک ہوئے تو شاہ مصر کی خواب کی تعبیر کے ردعمل میں سخت محنت اور جانفشانی سے مصری عوام کو قحط سے بچایا تھا۔ اس قحط کی شدت کا یہ حال تھا کہ مصر کے قریب فلسطین سمیت دوسرے تمام علاقے اُس کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ جس کی بناء پر حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی مصر میں غلہ لینے کیلئے تشریف لائے۔ جنہیں حضرت یوسف علیہ السلام نے پہچان لیا تھا۔ لیکن بھائی حضرت یوسف کو نہ پہچان سکے۔ چونکہ بھائیوں نے تو انہیں ایک کنواں میں پھینک دیا تھا۔ جس کنواں سے انہیں ایک تجارتی قافلہ نکال کر مصر لے آیا تھا۔ بھائیوں کو یقین تھا کہ یوسف کسی کی غلامی میں زندگی بسر کر رہا ہوگا۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انسان بڑی چالیں چلتا ہے اور میں ایک ہی چال چل کر اس کی تمام چالوں کو ختم کر دیتا ہوں۔ اس طرح بھائیوں کی چالوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے مطابق ختم کر کے انہیں اقتدار سونپا۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کی تمام زیاتیوں کو بھلا کر اُن سے حسن سلوک کرتے ہوئے غلہ دیا اور اُنہوں نے جو پیسے ادا کیے تھے وہ بھی اُن کے سامان میں رکھوا دیئے۔ تاکہ وہ دوبارہ واپس آئیں۔ جاتے وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کو کہا کہ اگر دوبارہ غلہ کی ضرورت ہوئی تو اپنے بھائی بنیامین کو بھی لیتے آنا۔ ورنہ غلہ نہیں ملے گا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی غلہ لیکر خوشی خوشی واپس گئے اور اپنے باپ حضرت یعقوب علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر بتایا کہ آئندہ ہمیں غلہ دینے سے انکار کر دیا گیا ہے۔ لیکن اگر بنیامین کو آپ ساتھ بھیجیں تو پھر غلہ مل سکتا ہے۔ اس کے بعد جب غلہ کے اسباب کھولے گئے تو اُن میں جو پیسے انہوں نے غلہ کی قیمت کے ادا کیے تھے وہ بھی موجود تھے۔ پیسے دیکھ کر سب خوش ہوئے اور عزیز مصر کی تعریفیں کرنے لگے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام اس سے

پہلے حضرت یوسف علیہ السلام کو بھائیوں کے ساتھ بھیج چکے تھے۔ اب دوبارہ ان کے ساتھ دوسرا بیٹا بنیامین بھیجنے کیلئے تیار نہیں تھے۔ آخر اللہ کے سہارے حضرت یعقوب علیہ السلام نے بنیامین کو بھائیوں کے ساتھ بھیج دیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی بنیامین کو لیکر جب مصر آئے۔ تو موقع پا کر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے حقیقی بھائی بنیامین کو بتا دیا کہ میں تمہارا وہی بھائی ہوں جو بچپن میں بچھڑ گیا تھا۔ پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک حکمت کے تحت غلہ ماپنے والا شاہی پیمانہ بنیامین کے سامان میں چھپا دیا تاکہ اس بہانے یہ رک جائے۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی سامان لیکر چلے تو شاہی ملازمین نے پکارا کہ شاہ مصر کا پیمائش کا پیالہ گم ہو گیا ہے۔ چنانچہ اُن کے سامان کی تلاشی لی تو پیالہ بنیامین کے سامان سے برآمد ہوا۔ تب یوسف کے سوتیلے بھائی بول اٹھے یہی چور ہے۔ اس سے پہلے اس کا بھائی بھی ایسے کام کر چکا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ بات بری محسوس ہوئی کہ وہ انہیں اُس کے منہ پر الزام لگا رہے ہیں لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نے غصہ پی لیا۔ اور مناسب موقع پر اصل حقیقت افشاں کرنے کا انتظار کرنے لگے۔

اُدھر حضرت یوسف علیہ السلام کی جدائی میں حضرت یعقوب علیہ السلام عالم پریشانی میں اس قدر روئے کہ آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔

یہ حقیقت ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کسی بھی صورت یوسف کو نہیں بھولے۔ آخر جب ملاقات کا وقت آیا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے قاصد کو اپنی قمیض کے ساتھ بھیجا۔ جس کا ذکر سورہ یوسف آیات 93 میں یوں آتا ہے:

> جب یہ قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا تو ان کے باپ نے (کنعان میں) کہا ''میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں، تم لوگ کہیں یہ نہ کہنے لگو کہ میں بڑھاپے میں سٹھیا گیا ہوں۔'' گھر کے لوگ بولے'' خدا کی قسم آپ ابھی تک اپنے اسی پرانے خبط میں پڑے ہوئے ہیں۔''
>
> پھر جب خوشخبری لانے والا آیا تو اس نے یوسف کا قمیض یعقوب

کے منہ پر ڈال دیا اور یکا یک اس کی بینائی عود کر آئی۔تب اس نے کہا ''میں تم سے کہتا نہ تھا؟ میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے''

حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے اہل و عیال کے ساتھ مصر تشریف لائے۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام سے جس طرح ملاقات ہوئی اُس کا ذکر بھی قرآن پاک سورہ یوسف کی آیات 98 میں ہوا بیان ہوا ہے:

پھر جب یہ لوگ یوسف کے پاس پہنچے تو اُس نے اپنے والدین کو اپنے ساتھ بٹھالیا اور (اپنے سب کنبے والوں سے) کہا ''چلو اب شہر میں چلو، اللہ نے چاہا تو امن چین سے رہو گے''

(شہر میں داخل ہونے کے بعد) اس نے اپنے والدین کو اٹھا کر اپنے پاس تخت پر بٹھایا اور سب اس کے آگے بے اختیار سجدے میں جھک گئے۔یوسف نے کہا ''ابا جان، یہ تعبیر ہے میرے اُس خواب کی جو میں نے پہلے دیکھا تھا، میرے رب نے اسے حقیقت بنا دیا۔اس کا احسان ہے کہ اُس نے مجھے قید خانے سے نکالا اور آپ لوگوں کو صحرا سے لا کر مجھ سے ملایا۔

حضرت یوسف نے بچپن میں جو خواب دیکھا تھا اُس کا ذکر بھی سورہ یوسف آیات 3 میں آتا ہے:

یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا ''ابا جان میں نے خواب دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے ہیں اور سورج اور چاند ہیں اور وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں'' جواب میں اس کے باپ نے کہا: ''بیٹا، اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں کو نہ سنانا ورنہ وہ تیرے درپے آزار ہو جائیں گے، حقیقت یہ ہے کہ شیطان آدمی کا کھلا دشمن ہے۔ اور ایسا ہی ہوگا (جیسا تو نے خواب میں دیکھا ہے کہ) تیرا رب (اپنے کام کے لیے) منتخب کرے گا اور تجھے باتوں کی تہ تک پہنچنا سکھائے

گا اور تیرے اوپر اور آل یعقوب پر اپنی نعمت اسی طرح پوری کرے گا جس طرح اس سے پہلے وہ تیرے بزرگوں ابراہیم اور اسحاق پر کر چکا ہے۔ یقیناً تیرا رب علیم اور حکیم ہے''۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو مصر کے زرخیز خطہ میں آباد کیا۔ اِن کا حقیقی بھائی بنیامین تھا۔ باقی دس ان کی سوتیلی ماؤں کی اولاد تھی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے چار شادیاں کیں۔ جن سے کل بارہ بیٹے پیدا ہوئے تھے۔ جن کی اولاد بنی اسرائیل کہلاتی ہے۔ اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا بھی نام تھا۔ ان کی شاخ میں سے بعد میں حضرت موسیٰ پیدا ہوئے تھے۔ یہ لوگ محنتی تھے۔ جس کی بدولت یہ جلد ہی آسودہ حال ہوئے۔ جب کہ مصر کے اصل باشندے غربت میں تھے۔ جس کی بناء پر مقامی لوگوں کے اندر ہی اندر بنی اسرائیل کے خلاف نفرت پیدا ہوئی اور یہ لاوہ پکتے پکتے آخر مصری اور غیر مصریوں کی صورت میں سامنے آیا۔ جو کسی نہ کسی شکل میں آج بھی موجود ہے۔ بلکہ عرب اسرائیل جنگ کے دوران مصر کے حکمران صدر جمال ناصر نے جب اپنے ایک بیان میں اسرائیل کو خبردار کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''تمہیں علم ہونا چاہئے ہم فراعنہ کی اولاد ہیں''

جس کے جواب میں اسرائیل کے وزیر اعظم نے کہا تھا کہ:

''اگر تم فراعنہ کی اولاد ہو تو ہم بھی حضرت موسیٰ کی اولاد ہیں''۔

ان بیانات پر غور کرنے پر محسوس ہوتا ہے کہ یہ بیان صرف ڈرانے دھمکانے کیلئے نہیں تھے بلکہ ان کی کڑیاں بہت پیچھے کہیں اور جگہ جا ملتی تھیں۔ آج بھی کچھ روشن خیال مصری اپنے حسب نسب پر فخر کرتے ہیں۔

مصر میں قوم پرستی کی تحریک اٹھتے ہی فراعنہ نے بھی آنکھیں کھولیں۔ جو نئے جذبہ اور تیاری کے ساتھ اٹھے اور چرواہے حکمرانوں کو شکست دیکر مصر سے مار بھگایا۔ اور بنی اسرائیل کو قید کر کے غلام بنا لیا۔ پھر ایک نئے دور کا آغاز ہوا جس میں ظلم و ستم اس قدر برپا ہوا کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اُس کا بار بار ذکر کیا ہے۔ فراعنہ نے بنی اسرائیل کو غلام بنا کر ان سے بیگار لینی شروع کر دی۔ جب رعمیس ثانی برسراقتدار آیا تو ڈیلٹا کے علاقہ کی فوجی اہمیت اور زرخیزی کے باعث اُس نے اپنے شاہی محل چرواہے حکمرانوں کے دارالخلافہ سے تھوڑا دور

قنطیر Qantir کے مقام پر تعمیر کروایا تھا۔ جس کا موجودہ نام تینس Tanis ہے۔ رعمیس کا محل اور عبادت گاہیں یہاں تعمیر کی گئیں تھیں۔ محققین کا دعویٰ ہے کہ یہ تمام کام بنی اسرائیل سے بیگار میں لیا گیا۔ اب کھدائی کے بعد فراعنہ کے دیوتا امن کے مندر کے کھنڈرات ملے ہیں۔ یہ مندر الاقصر کے کارنک مندر کے ہم پلہ تھا۔ اس علاقہ میں دو شاہی قبرستان بھی دریافت ہوئے ہیں۔

موجودہ تحقیق نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ بنی اسرائیل اسی علاقہ میں آباد تھے۔ اور پھر فرعون رعمیس کے شاہی محلات بھی اسی علاقے میں تھے۔ جس میں پانی دریائے نیل کی ایک شاخ فراہم کرتی تھی۔ ایسے میں میرا قیاس ہے کہ حضرت موسیٰ بھی اسی علاقہ میں پیدا ہوئے۔ چونکہ ان کا تعلق بنی اسرائیل سے تھا۔ بنی اسرائیل کا الاقصر یا مصر کے کسی دوسرے علاقہ میں آبادکاری کے کوئی ثبوت نہیں۔ رعمیس ثانی کے ان محلات کے قریب ہی بنی اسرائیل کے لوگوں کی بستی تھی۔ جہاں ایک غریب گھرانے میں حضرت موسیٰ نے آنکھ کھولی تھی۔

قصہ خضر و موسیٰ

قیام مصر کے دوران حضرت موسیٰ نے دین کی تبلیغ کا کام جاری رکھا۔ وہ اپنے مشن کیلئے مصر کے ہر علاقہ میں گئے۔ اس دوران اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ کی تربیت بھی کرتے رہے۔ حضرت خضر کے ساتھ حضرت موسیٰ کا تربیتی سفر اس عرصہ میں ہوا۔ قرآن پاک میں اس واقعہ کا ذکر یوں آتا ہے:

> (ذرا ان کو وہ قصہ سناؤ جو موسیٰ کو پیش آیا تھا) جبکہ موسیٰ نے اپنے خادم سے کہا تھا کہ ”میں اپنا سفر ختم نہ کروں گا جب تک کہ دونوں دریاؤں کے سنگم پر نہ پہنچ جاؤں ورنہ میں ایک زمانہ دراز تک چلتا ہی رہوں گا۔“ بس جب وہ ان کے سنگم پر پہنچے تو اپنی مچھلی سے غافل ہو گئے اور وہ نکل کر اس طرح دریا میں چلی گئی جیسے کہ کوئی سرنگ لگی ہو۔ آگے جا کر موسیٰ نے اپنے خادم سے کہا: ”لاؤ ہمارا ناشتہ، آج کے سفر میں تو ہم بری طرح تھک گئے ہیں۔“ خادم نے کہا ”آپ نے دیکھا نہیں! یہ کیا ہوا؟ جب ہم چٹان کے پاس ٹھیرے ہوئے

تھے اس وقت مچھلی کا خیال نہ رہا اور شیطان نے مجھ کو ایسا غافل کر دیا کہ میں اس کا ذکر (آپ سے کرنا) بھول گیا۔ مچھلی تو عجیب طریقے سے نکل کر دریا میں چلی گئی۔'' موسیٰ نے کہا: ''اسی کی تو ہمیں تلاش تھی'' چنانچہ وہ دونوں اپنے نقش قدم پر پھر واپس ہوئے اور وہاں انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جسے ہم نے اپنی رحمت سے نوازا تھا اور اپنی طرف سے ایک خاص علم عطا کیا تھا

(سورہ الکھف رکوع 60-65)

مفسرین کا خیال ہے کہ یہ واقعہ سوڈان کے شہر خرطوم کے قریب جہاں دریائے نیل کی دو بڑی شاخیں البحرالابیض اور البحرالازرق میں آ کر ملتی ہیں، وہاں پیش آیا تھا۔

اس سفر میں حضرت موسیٰ نے حضرت خضر سے جو کچھ سیکھا اور سفر میں پیش آنے والے جو تین واقعات پیش آئے انہیں علامہ اقبال نے کوزے میں بند کیا:

''کشتی مسکین'' و'' جان پاک'' و'' دیوار یتیم''
علمِ موسیٰ بھی تیرے سامنے حیرت فروش

فرعون اور کلیم اللہ کی کشمکش

جب سے فراعنہ نے چرواہے حکمرانوں کو مصر سے مار بھگایا تب سے یہ بنی اسرائیل کے بارے میں فکر مند تھے کہ جس چنگاری کو ہم طاقت سے دبا رہے ہیں کہیں شعلہ بن کر ہمیں اپنی لپیٹ میں نہ لے لے۔ اس فکر میں فراعنہ نے بنی اسرائیل پر ہر طرح کے ظلم ڈھائے تاکہ وہ لوگ سر اٹھانے کے قابل نہ رہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ فرعون بنی اسرائیل کی بڑھتی ہوئی آبادی سے خائف تھے۔ اور پھر شاہی جوتشیوں نے فرعون کو بتا دیا تھا کہ بنی اسرائیل کا ایک لڑکا تمہاری سلطنت کو تباہ و برباد کر دے گا۔ اس پر فرعون نے حکم جاری کر دیا کہ بنی اسرائیل کے ہاں اگر کوئی بچہ جنم دے تو اُسے پیدا ہوتے ہی موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے۔ حکم پر عمل درآمد کیلئے ملک بھر کی دائیوں کو خصوصی حکم دیئے گئے تھے۔

لیکن جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں تو پھر اُس فیصلہ کو کوئی بھی ٹال نہیں سکتا۔ اپنے فیصلہ کو عملی جامع پہنانے کیلئے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو منتخب کیا۔ حضرت موسیٰ حضرت یعقوب کے بارھویں بیٹے لاوی کی اولاد میں سے تھے۔ جب حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کے ایک غریب گھرانہ میں پیدا ہوئے تب اللہ تعالیٰ نے انہیں بچانے کا کچھ اس طرح بندوبست کیا کہ وہ زندہ بھی رہے اور مصر کے شاہی محل میں پرورش پا کر فراعنہ کی تمام زیادتیوں کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا۔ حضرت موسیٰ کی پیدائش اور فرعون کے محل تک پہنچنے کے بارے میں قرآن پاک سورہ القصص آیات 7 میں ارشاد خداوندی ہے۔

ہم نے موسیٰ کی ماں کو اشارہ کیا کہ ''اس کو دودھ پلا، پھر جب تجھے اُس کی جان کا خطرہ ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور کچھ غم نہ کر، ہم اسے تیرے ہی پاس واپس لے آئیں گے اور اس کو پیغمبروں میں شامل کریں گے''۔ آخر فرعون کے گھر والوں نے اسے (دریا سے) نکال لیا تا کہ وہ ان کا دشمن اور ان کے لیے سبب رنج بنے، واقعی فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر (اپنی تدبیر میں) بڑے غلط کار تھے۔ فرعون کی بیوی نے (اس سے) کہا ''یہ میرے اور تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ اسے قتل نہ کرو، کیا عجب کہ یہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو، یا ہم اسے بیٹا ہی بنا لیں۔'' اور وہ (انجام سے) بے خبر تھے۔

اُدھر موسیٰ کی ماں کا دل اُڑا جا رہا تھا۔ وہ اس کا راز فاش کر بیٹھتی اگر ہم اس کی ڈھارس نہ بندھا دیتے تا کہ وہ (ہمارے وعدے پر) ایمان لانے والوں میں سے ہو۔ اُس نے بچے کی بہن سے کہا اس کے پیچھے پیچھے جا۔ چنانچہ وہ الگ سے اس کو اس طرح دیکھتی رہ کہ (دشمنوں کو) اس کا پتہ نہ چلا۔ اور ہم نے بچے پر پہلے دودھ پلانے والیوں کی چھاتیاں حرام کر رکھی تھیں۔ (یہ حالت دیکھ کر) اُس لڑکی نے اُن سے کہا ''میں تمہیں ایسے گھر کا پتہ بتاؤں جس کے لوگ اس

کی پرورش کا ذمہ لیں اور خیر خواہی کے ساتھ اسے رکھیں؟ اس طرح ہم موسیٰ کو اس کی ماں کے پاس پلٹا لائے تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمگین نہ ہو اور جان لے اللہ کا وعدہ سچا تھا۔ مگر اکثر لوگ اس بات کو نہیں مانتے۔

حضرت موسیٰ کی پرورش فراعنہ کے شاہی محل کی زیر نگرانی میں انکی ماں کے پاس ہوتی رہی۔ اب اللہ تعالیٰ نے اِن سے وہ کام لینا تھا۔ جس کے لئے انہیں بچپن سے منتخب کیا گیا تھا۔ اس عظیم کام کیلئے حضرت موسیٰ کی تربیت ایک اور ماحول میں کرنے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ محل سے انہیں نکالنے کا سبب یہ پیدا ہوا کہ ان کے ہاتھوں ایک آدمی قتل ہوگیا۔ جس کے خوف سے وہ محل سے بھاگے اور صحرا سینا کی طرف چلے گئے۔ وہاں سے ہوتے ہوئے یہ چھپتے چھپاتے مدین کے علاقہ میں پہنچے۔ صحرا میں ایک کنواں پر پانی پینے رکے تو دیکھا دو جوان لڑکیاں پانی لینے کے انتظار میں بیٹھی ہوئی ہیں اور دوسرے لوگ انہیں باری نہیں دیتے۔ حضرت موسیٰ نے وہاں اپنے قوت بازو کا استعمال کیا اور لڑکیوں کو پانی بھر کر دیا۔ یہ لڑکیاں حضرت شعیب کی بیٹیاں تھی۔ حضرت شعیب اللہ کے محبوب نبی تھے۔ اس واقعہ کا ذکر بھی قرآن پاک سورہ القصص آیات 22-28 میں یوں آتا ہے:

(مصر سے نکل کر) جب موسیٰ نے مدین کا رخ کیا تو اُس نے کہا ''امید ہے کہ میرا رب مجھے ٹھیک راستے پر ڈال دے گا۔ اور جب وہ مدین کے کنوئیں پر پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ بہت سے لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں اور ان سے الگ ایک طرف دو عورتیں اپنے جانوروں کو روک رہی ہیں۔ موسیٰ نے ان عورتوں سے پوچھا ''تمہیں کیا پریشانی ہے''؟ انہوں نے کہا ''ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلاسکتیں جب تک یہ چرواہے اپنے جانور نہ نکال لے جائیں، اور ہمارے والد ایک بہت بوڑھے آدمی ہیں''۔ یہ سن کر موسیٰ نے ان کے جانوروں کو پانی پلا دیا۔ پھر ایک سائے کی جگہ جا بیٹھا اور بولا ''پروردگار، جو بھی خیر تو مجھ پر نازل کردے میں اس کا محتاج ہوں'' (کچھ دیر نہ گزری تھی کہ) ان

دونوں عورتوں میں سے ایک شرم وحیا کے ساتھ چلتی ہوئی اس کے پاس آئی اور کہنے لگی ''میرے والد آپ کو بلا رہے ہیں۔ تاکہ آپ نے ہمارے لیے جانوروں کو پانی جو پلایا اس کا اجر آپ کو دیں'' موسیٰ جب اس کے پاس پہنچا اور اپنا سارا قصہ اسے سنایا تو اس نے کہا ''کچھ خوف نہ کرو اب تم ظالم لوگوں سے بچ نکلے ہو''

ان دونوں عورتوں میں سے ایک نے اپنے باپ سے کہا ''ابا جان اس شخص کو نوکر رکھ لیجئے، بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہوسکتا ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو'' اس کے باپ نے (موسیٰ سے) کہا ''میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تمہارے ساتھ کردوں بشرطیکہ تم آٹھ سال تک میرے ہاں ملازمت کرو، اور اگر دس سال پورے کردو تو یہ تمہاری مرضی ہے۔ میں تم پر سختی نہیں کرنا چاہتا۔ تم ان شاءاللہ مجھے نیک آدمی پاؤ گے۔'' موسیٰ نے جواب دیا ''یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے ہوگئی۔ ان دونوں مدتوں میں سے جو بھی پوری کردوں اُس کے بعد پھر کوئی زیادتی مجھ پر نہ ہو، اور جو کوئی قول قرار ہم کر رہے ہیں اللہ اس پر نگہبان ہے۔''

مدین میں حضرت شعیب کے ساتھ دس سال رہنے سے ان کی روحانی تربیت جب مکمل ہوئی تو بیوی بچوں کو لیکر واپس مصر آرہے تھے کہ راستہ میں کوہ طور کے پہلو میں اللہ تعالیٰ سے انہیں ہم کلامی کا موقع ملا۔ بقول علامہ اقبال:

اگر کوئی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو اپنی چند نشانوں کے ساتھ فرعون کے پاس بھیجا کہ جاؤ اور فرعون کو دین اسلام کی دعوت کے ساتھ ساتھ اپنی قوم کو آزاد کروایا۔ حضرت موسیٰ کوہ طور سے مصر آئے اور ڈیلٹا کے اسی محل میں فرعون کو اللہ کا پیغام پہنچایا۔ جس کے جواب میں فرعون

نے حضرت موسیٰ کو ایک جادوگر قرار دیا۔

اللہ تعالیٰ نے ہر پیغمبر کو وہ صلاحیتیں دیکر دنیا میں بھیجا جن کی اُس دور میں ضرورت ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ کے دور میں جادوگری اپنے عروج پر تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ صلاحیت دی جس سے جادو کا اثر ختم ہو جائے۔ جب فرعون نے جادوگروں کو جمع کیا تو اُس منظر کو قرآن سورہ الاعراف آیات 104 میں یوں بیان کیا گیا:

موسیٰ نے کہا "اے فرعون، میں کائنات کے مالک کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں، میرا منصب یہی ہے کہ اللہ کا نام لے کر کوئی بات حق کے سوا نہ کہوں، میں تم لوگوں کے پاس تمہارے رب کی طرف سے صریح دلیل ماموریت لے کر آیا ہوں، لہذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے۔

فرعون نے کہا "اگر تو کوئی نشانی لایا ہے اور اپنے دعوے میں سچا ہے تو اسے پیش کر۔"

موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا اور یکا یک وہ ایک جیتا جاگتا اژدہا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے ہاتھ نکالا اور سب دیکھنے والوں کے سامنے وہ چمک رہا تھا۔ اس پر فرعون کی قوم کے سرداروں نے آپس میں کہا کہ "یقیناً یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے، تمہیں تمہاری زمین سے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔ اب کہو کیا کہتے ہو"؟ پھر اُن سب نے فرعون کو مشورہ دیا کہ اسے اور اس کے بھائی کو انتظار میں رکھیے اور تمام شہروں میں ہرکارے بھیج دیجیے کہ ہر ماہر فن جادوگر کو آپ کے پاس لے آئیں۔ چنانچہ جادوگر فرعون کے پاس آ گئے۔ اُنہوں نے کہا "اگر ہم غالب رہے تو ہمیں اس کا صلہ تو ضرور ملے گا"؟

فرعون نے جواب دیا "ہاں، اور تم مقرب بارگاہ ہو گے۔"

پھر انہوں نے موسیٰ سے کہا "تم پھینکتے ہو یا ہم پھینکیں"؟

موسیٰ نے جواب دیا "تم ہی پھینکو"۔

انہوں نے جو اپنے آنچھڑ پھینکے تو نگاہوں کو مسحور اور دلوں کو خوف زدہ کر دیا اور بڑا ہی زبردست جادو بنا لائے۔

ہم نے موسیٰ کو اشارہ کیا کہ پھینک اپنا عصا۔ اس کا پھنکنا تھا کہ آن کی آن میں وہ ان کے اس جھوٹے طلسم کو نگلتا چلا گیا۔'' اس طرح جو حق تھا وہ حق ثابت ہوا اور جو کچھ انہوں نے بنا رکھا تھا وہ باطل ہو کر رہ گیا۔

ایک اور نکتہ سمجھنے کے قابل ہے کہ جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون نے فرعون اور اُس کے درباریوں کو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی دعوت دی تو فرعون نے جواب دیا:

فَقَالُوٓا اَنُؤمِنُ لِبَشَرَیۡنِ مِثۡلِنَا وَ قَوۡمُھُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ ○

(سورہ المومنون آیات 47)

کہنے لگے کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں؟ اور آدمی بھی وہ جن کی قوم ہماری بندی ہے۔

اس آیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کو صرف اپنی قوم کی آزادی کیلئے نہیں بلکہ فرعون اور انکے درباریوں اور قوم کو بھی اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دی تھی۔ لیکن فرعون کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لانے سے جس چیز نے روکا وہ اُس کا تکبر اور غرور تھا۔ فرعون کے خیال میں اللہ کا پیغمبر اعلیٰ نسل کا نہیں بلکہ غلام قوم کا بندہ ہے۔ فراعنہ سے ملتے جلتے خیالات کفار مکہ کے سرداروں کے بھی تھے:

وَقَالُو الَولاَ نُزِلَ ھٰذَا الۡقُرۡاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِنَ الۡقَرۡتَیۡنِ عَظِیۡمٍ

کہتے ہیں، یہ قرآن دونوں شہروں کے بڑے لوگوں میں سے کسی پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟

(سورہ الزخرف 31)

ایسا ہی تکبر ابلیس نے بھی کیا تھا اور انسان کو اپنے سے کمتر سمجھے ہوئے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بلکہ آج بھی ایسے لاکھوں لوگ موجود ہیں جو دوسرے کو اپنے سے کمتر سمجھتے ہوئے فرعون کے قوانین پر عمل کرتے نظر آتے ہیں۔

اہل مصر کی آزمائش

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کئی سال مصر میں رہے اور تبلیغ اسلام کرتے رہے۔ اس دوران فرعون اور آل فرعون کو اللہ کے عذاب سے ڈراتے رہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ ورنہ تمہیں اور تمہاری قوم کو فلاں مصیبت میں مبتلا کیا جائے گا۔ اور اگر ایسا نہیں تو پھر بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مطالبہ کے باوجود فرعون نے جب بنی اسرائیل کو آزادی نہیں دی تو پھر اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اُس کی قوم کو آزمائش میں ڈال دیا۔ ممکن ہے کہ اس طرح فرعون راہ راست پر آ جائے۔ اس بارے میں قرآن پاک سورہ الاعراف آیات 132 میں ارشاد خداوندی ہے کہ:

> ہم نے فرعون کے لوگوں کو کئی سال تک قحط اور پیداوار کی کمی میں مبتلا رکھا کہ شاید ان کو ہوش آئے مگر اُن کا حال یہ تھا جب اچھا زمانہ آتا تو کہتے کہ ہم اسی کے مستحق ہیں اور جب برا زمانہ آتا تو موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کو اپنے لیے فال بدٹھراتے، حالانکہ درحقیقت ان کی فال بد تو اللہ کے پاس تھی مگر ان میں سے اکثر بے علم تھے۔ انہوں نے موسیٰ سے کہا کہ ”تو ہمیں مسحور کرنے کے لیے خواہ کوئی نشانی لے آئے ہم تو تیری بات ماننے والے نہیں ہیں۔ آخر ہم نے ان پر طوفان بھیجا، ٹڈی دل چھوڑے، سُرسُریاں پھیلائیں، مینڈک نکالے اور خون برسایا یہ سب نشانیاں الگ الگ کر کے دکھائیں مگر وہ سرکشی کیے چلے گئے اور وہ بڑے ہی مجرم لوگ تھے۔

اس واقعہ کو یہودیوں نے بھی اپنی کتابوں میں لکھا ہے جو دس آفات کے نام سے مشہور ہیں کہ جب فرعون نے یہودیوں کو غلامی سے نجات نہیں دی تو پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں ان دس آفات میں مبتلا کیا تھا۔

☆ دریائے نیل کا پانی خون بن کر بہنے لگا تھا۔

☆ مصر میں مینڈکوں کی بہتات ہو گئی تھی۔
☆ مصر میں مچھروں کی بہتات ہو گئی تھی۔
☆ مصر میں مکھیوں کی بہتات ہو گئی تھی۔
☆ مصر کے تمام مال مویشی اور بھیڑ بکریاں بیماری کی وجہ سے مر گئیں تھیں۔
☆ تمام مصری پیچش کی بیماری میں مبتلا ہو گئے تھے۔
☆ مصر میں سخت ترین ژالہ باری ہوئی تھی۔
☆ مصر میں ٹڈی دل کی بہتات ہوئی جس نے تمام فصلیں اور درختوں کے پتے کھا ڈالے تھے۔
☆ تین دن تک مصر اندھیرے میں ڈوبا رہا
☆ اللہ تعالیٰ نے مصر کے تمام نومولود انسانوں اور حیوانوں کے بچوں کو موت دے دی تھی۔

قارون کے خزانے

فرعون کا وزیر خاص قارون بھی ڈیلٹا کے اسی علاقہ میں مقیم تھا۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ قارون حضرت موسیٰ کا کزن تھا۔ جو امیر ترین اور انتہائی کنجوس آدمی تھا۔ اپنی قوم بنی اسرائیل پر ظلم کرنے میں فراعنہ کی مدد کرتا تھا۔ دولت کے نشے میں انتہائی مغرور تھا۔ اکڑ اکڑ کر چلتا اور اپنی کروفر کی خاطر غلاموں اور نوکروں کی ایک بھاری جمعیت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اُسے دیکھ کر بنی اسرائیل کا غریب طبقہ رشک کھاتا اور دل ہی دل میں سوچتا تھا کہ کاش اتنی دولت کے ہم بھی مالک ہوتے۔ اس کا انجام بڑا عبرت ناک ہوا۔ آج بھی لوگ اگر انتہائی کنجوس آدمی کی مثال دینا چاہیں تو وہ اسے ''قارون'' کہتے ہیں۔ یعنی قارون کی کنجوسی رہتی دنیا کیلئے ایک ضرب المثل بن گئی۔ اسی قارون کے بارے میں قرآن پاک سورہ القصص آیات 75 میں ارشاد خداوندی ہے کہ:

یہ ایک واقعہ ہے کہ قارون موسیٰ کی قوم کا ایک شخص تھا، پھر وہ اپنی قوم

کے خلاف سرکش ہو گیا۔ اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دے رکھے تھے کہ ان کی کنجیاں طاقتور آدمیوں کی ایک جماعت مشکل سے اُٹھا سکتی تھی۔ ایک دفعہ جب اس کی قوم کے لوگوں نے اس سے کہا'' پھول نہ جا، اللہ پھولنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔ احسان کر جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کر، اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا''

تو اُس نے کہا: ''یہ سب کچھ تو مجھے اُس علم کی بنا پر دیا گیا ہے جو مجھ کو حاصل ہے'' کیا اس کو یہ علم تھا کہ اللہ اس سے پہلے بہت سے ایسے لوگوں کو ہلاک کر چکا ہے جو اس سے زیادہ قوت اور جمعیت رکھتے تھے؟ مجرموں سے تو ان کے گناہ نہیں پوچھے جاتے۔''

ایک روز وہ اپنی قوم کے سامنے اپنے پورے ٹھاٹھ میں نکلا۔ جو لوگ حیات دنیا کے طالب تھے وہ اسے دیکھ کر کہنے لگے'' کاش ہمیں بھی وہی کچھ ملتا جو قارون کو دیا گیا ہے۔ یہ تو بڑا نصیبے والا ہے'' مگر جو لوگ علم رکھنے والے تھے وہ کہنے لگے''افسوس تمہارے حال پر، اللہ کا ثواب بہتر ہے اُس شخص کے لیے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے ،اور یہ دولت نہیں ملتی مگر صبر کرنے والوں کو۔''

آخر کار ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔ پھر کوئی اس کے حامیوں کا گروہ نہ تھا جو اللہ کے مقابلہ میں اس کی مدد کو آتا اور نہ وہ خود اپنی مدد آپ کر سکا۔ اب وہی لوگ جو کل اس کی منزلت کی تمنا کر رہے تھے کہنے لگے''افسوس، ہم بھول گئے تھے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس کا رزق چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور جسے چاہتا

ہے نپا تُلا دیتا ہے۔ اگر اللہ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہمیں بھی زمین میں دھنسا دیتا۔ افسوس ہم کو یاد نہ رہا کہ کافر فلاح نہیں پایا کرتے''

مصر سے بنی اسرائیل کی ہجرت

مصر میں بنی اسرائیل کے لوگ حضرت یوسف علیہ السلام کے دور سے آباد تھے۔ حضرت یوسف کی تبلیغ کے نتیجہ میں اِن لوگوں کی اکثریت مسلمان ہوگئی تھی۔ جب کہ فراعنہ نے اپنے کئی خدا بنائے ہوئے تھے۔ فراعنہ کے کئی خداؤں کو نہ ماننے کی وجہ سے بنی اسرائیل پر فرعون مسلسل ظلم وستم ڈھاتے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ اُن کی نسل ختم کرنے کی خاطر اُن کے بچے قتل کرنے لگے تھے تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ جب ہر طرح سے مایوسی ہوئی تو بنی اسرائیل کو غلام بنالیا۔ غلاموں پر ظلم کرنا اُس زمانے میں ایک عام سی بات تھی۔ بالکل ایسے ہی جیسے اسلام کے ابتدائی دور میں مکہ کے کئی غلام ایمان لے آئے تھے جن میں حضرت بلالؓ بھی شامل تھے۔ جنہیں اُن کے آقا آگ کے تپتے انگاروں پر لیٹا کر گلیوں میں گھسیٹتے رہتے تھے۔

جب حضرت موسیٰ بالکل مایوس ہوگئے تو پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں ہجرت کا حکم دیا۔ بالکل اُسی طرح جیسے کفار مکہ کے ہاتھوں جب حضورؐ بہت ہی زیادہ تنگ ہوئے تو انہیں ہجرت کا حکم ملا۔ اور یوں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کے اندھیرے میں مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی تھی۔ حضرت موسیٰ کو بھی رات کے وقت ہجرت کا حکم ملا۔ قرآن پاک کی سورہ طٰہٰ آیت 76 میں ارشاد خداوندی ہے کہ:

وَلَقَد اَوْ حَینَا اِلیٰ مُوسیٰ اَن اَسرِ بِعبادِیُ فَا ضرِبُ

ہم نے موسیٰ پر وحی کی کہ اب راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چل پڑ۔

جب حضرت موسیٰ اور فرعون کی کشمکش شروع ہوئی تو فرعون نے اپنے تمام ہتھکنڈے استعمال کیے لیکن وہ حضرت موسیٰ کو پسپا نہ کر سکے۔ آخر ہجرت کیلئے اللہ کا حکم آ گیا۔ تو حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کو کہا کہ وہ ایک جگہ جمع ہو جائیں تاکہ ہم مصر سے ہجرت کریں۔ حضرت موسیٰ کی قوم موجودہ اسماعیلیہ کے قریب جمع ہوئی۔ رات کا وقت تھا۔ اندھیرا ہجرت کرنے

والوں کیلئے ہمیشہ موافق رہا۔ حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر فلسطین لے جانا چاہتے تھے۔ فلسطین اور مصر کی سرحدیں اسماعیلیہ سے پورٹ سعید کے درمیان تھیں۔ جہاں سے لوگ آتے جاتے تھے۔

لیکن جب سے چرواہے حکمرانوں نے اس راستے سے مصر پر حملہ کیا اُس کے بعد سے فراعنہ نے اپنی فوجی چھاونیاں اس علاقہ میں قائم کر دیں تھیں تا کہ آئندہ کوئی بیرونی حملہ آور مصر پر قابض نہ ہو سکے۔ ان حالات میں اگر حضرت موسیٰ اپنی قوم کو اس راستے مصر لے جاتے تو فرعون کے فوجی انہیں گرفتار کر لیتے۔ ان حالات میں فیصلہ ہوا کہ اسماعیلیہ سے تھوڑا نیچے جا کر صحرائے سینا کی طرف نکل جانا چاہیے تا کہ مصری فوجیں ہمیں فلسطین کی طرف ڈھونڈتی رہیں اور ہم انہیں جل دیکر مختلف سمت نکل جائیں۔

فرعون کی سمندر میں غرقابی

جب حضرت موسیٰ اپنی قوم کو لیکر مصر سے نکلے تو اِس کی خبر فرعون کو ہو گئی جو فوجیں لیکر ان کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا۔ جب بنی اسرائیل نے فراعنہ کی فوجوں کو دیکھا تو وہ مزید نیچے کی طرف بھاگے۔ حتی کہ وہ بحرہ احمر کے کنارے پہنچ گئے۔ اب ان کے ایک طرف فرعون اور اس کی فوجیں اور دوسری طرف سمندر تھا۔ ایسے میں بنی اسرائیل گھبرا گئے۔ تب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو حکم دیا:

اضرِب بِعَصَاكَ البَحرَ

''اپنا عصا سمندر پر مار''

حضرت موسیٰ نے حکم کی تعمیل کی تو بحرہ احمر دو حصوں میں پھٹ گیا۔ قرآن پاک میں آتا ہے کہ:

فَانفَلَقَ فَكَانَ كُلُ فِرقٍ كَالطَودِ العَظِيمِ

''فوراً سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر ٹکڑا ایک بڑے ٹیلے کی طرح کھڑا ہو گیا۔''

(سورہ شعراء)

اللہ تعالیٰ نے سمندر کو دو حصوں میں کچھ اس طرح تقسیم کیا کہ بیچ میں سے گزرنے کیلئے راستہ بن گیا۔ یہ راستہ اتنا پختہ تھا کہ چلنے سے دھول اڑتی تھی۔ بنی اسرائیل اس راستہ سے

اپنا مال و اسباب لیکر جب مصر سے گزر کر دوسرے کنارے پہنچے تو ان کے تعاقب میں فرعون اور اس کی فوج بھی اسی راستے آنے لگی۔ جب فرعون اور اس کی فوج عین درمیان میں پہنچیں تو اللہ تعالیٰ نے سمندر کو حکم دیکر اُسے اپنی اصل حالت میں لے آئے۔ یوں فرعون اور اُس کی فوجیں سمندر میں ڈوب مریں۔ قرآن پاک سورہ یونس آیت 89 میں ارشاد خداوندی ہے کہ:

جب فرعون ڈوبنے لگا تو بول اٹھا ''میں نے مان لیا کہ خداوند حقیقی اُس کے سوا کوئی نہیں ہے جس پر بنیاسرائیل ایمان لائے اور میں بھی سر اطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں''

اللہ نے جواب دیا:

فَالیومَ نُنَجیکَ بِدنِکَ لِتکوُنَ لمَن خَلفکَ اَیتً

اب تو ہم صرف تیری لاش ہی کو بچائیں گے تاکہ تو بعد کی نسلوں کے لیے نشان عبرت بنے۔

فرعون کی یہ میت اس وقت قاہرہ کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔ یہ لاش بہت عرصہ الاقصر کے قریب فراعنہ کے شاہی قبرستان کی ایک خفیہ غار نما مقبرے میں رہی۔ جب یہ ملی تو 1907ء میں سر گرافٹن الیسٹ سمتھ نے حنوط شدہ لاش سے پٹیاں کھولیں تھیں۔ عجائب گھر میں ہزاروں لوگ ہر روز فرعون کی میت دیکھ کر عبرت حاصل کرتے ہیں۔

کچھ مفکرین جب اس واقعہ کو عقل کے ترازو پر تولتے ہیں تو اس بات سے انکاری ہیں کہ بھلا سمندر کیسے خشک ہو کر پھر اچانک ہی اپنی اصل حالت میں واپس آ گیا۔ یہ سب کہاوتیں ہیں عملی لحاظ سے ایسا ہونا ممکن نہیں؟۔ میں ایسے دانشوروں کو ایک بات یاد دلاتا چلوں کہ 26 دسمبر 2005ء کو جب سونامی آیا تو لمحوں میں سمندر اپنی اصل جگہ سے میلوں پیچھے ہٹ گیا تھا۔ زمین خشک دیکھ کر بچے اور بڑے سمندر کی قیمتی چیزیں اٹھانے کیلئے بھاگے تو لمحوں کے اندر وہ سمندر جس تیزی کے ساتھ پیچھے ہٹا تھا اُسی تیزی کے ساتھ واپس آیا۔ جس سے ہزاروں لوگ ڈوب گئے۔ اگر اللہ تعالیٰ موجودہ دور میں ایسا کر سکتے ہیں تو دنیا کے ظالم ترین انسان فرعون کی عبرت کیلئے تو ایسا کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ جس راستے بنی اسرائیل صحرائے میں سفر کرتے رہے اُن مقامات کی سیاحت بھی کرنی چاہئے۔ اِدھر مصر کی طرف سے تو ہم نے فراعنہ اور بنی اسرائیل جہاں

رہتے تھے اور جہاں سے ہجرت کر کے انہوں نے بحرہ احمر کو عبور کیا تھا۔ اُن تمام مقامات کی سیاحت کر لی تھی۔ اب ہمیں حضرت موسیٰ کے نقش قدم پر چل کر وادی سینا جانا تھا۔ ہم رات کو قاہرہ واپس آ کر سو گئے۔ تا کہ صبح سویرے وادی سینا کے سفر پر روانہ ہو سکیں۔



حضرت موسیٰ کے نقش قدم پر

صحرائے سینا
شرم الشیخ
کوہ طور
مزار حضرت صالح
مزار حضرت ہارون
سامری کا بچھڑا
وادی فاران

حضرت موسیٰ کے نقش قدم پر

آج ہمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وادی سینا جانا تھا۔ تا کہ اُن مقامات کی زیارت کر سکیں جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر لے گئے تھے۔ سینا کے سفر کا آغاز ہم نے صبح سویرے کیا۔ حسب پروگرام ھمام گاڑی لیکر ہماری قیام گاہ پر آ گیا۔ ہم بھی سینا جانے کی خوشی میں سویرے ہی اٹھ کر تیار ہو گئے۔ ناشتہ کے بعد صحرائے سینا کے سفر کا آغاز کیا۔ قاہرہ سے سینا جانے کیلئے سویز کے راستے جانا پڑتا ہے۔ چنانچہ گاڑی کا رخ سویز کی طرف موڑ دیا گیا۔ جلد ہی ہم آبادی سے نکل کر صحرا میں پہنچ گئے۔ گاڑی صحرا کے بیچوں بیچ ایک ڈیول کیرج سڑک پر سویز کی طرف رواں تھی۔ راستے میں ایک جگہ سڑک کے کنارے رنگ برنگے جھنڈے دیکھے تو سوچا ممکن ہے یہاں کسی گمنام سائیں بابا کا مزار ہو۔ جہاں عقیدت مند ڈرائیوروں نے جھنڈے لگا دیئے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے وہاں کسی غریب مجاور نے بھی گدی سنبھال لی ہو۔ یہ سوچتے ہوئے جب ہم قریب گئے تو وہاں نہ تو کوئی مزار تھا اور نہ کوئی مجاور۔ ہاں ایک بہت بڑا سنگ مرمر کا یادگاری پتھر نصب تھا جس پر لکھا تھا کہ 1967ء کی اسرائیل اور مصر کی جنگ کی یادگار کے طور پر یہ پتھر نصب کیا گیا ہے۔ پتھر دیکھ کر مجھے قدرے دکھ ہوا کہ اس جنگ میں اسرائیلی فوجیں تو قاہرہ کے قریب پہنچ گئی تھیں۔ یہاں سے قاہرہ ساٹھ میل دور تھا۔ جنگ کے دوران اسرائیلی فوجوں نے سینا کے علاقہ کو فتح کیا اور نہر سویز

کوعبور کرتے ہوئے مصر کے اس علاقہ پر قبضہ کرلیا تھا۔ یہ دیکھ کر ہم کافی پریشان ہوئے اور کافی عرصہ مسلمان حکومتوں کی کمزوریوں اور اسرائیل، امریکہ اور یورپی ملکوں کی بدمعاشیوں پر بات چیت کرتے رہے۔

باتیں کرتے ہوئے ہم سویز سٹی کے قریب پہنچے تو ھمام نے گاڑی شہر کی بجائے اُس سرنگ کی طرف موڑ دی جو نہر سویز کے نیچے سے گزر کر صحرائے سینا پہنچتی ہے۔ ڈھائی میل لمبی احمد حامدی نامی سرنگ میں سے گزر کر ہم صحرائے سینا پہنچے۔ یہ سرنگ سویز سٹی سے سات میل جانب شمال اسماعیلیہ کی طرف ہے۔ سارے ساتھی بہت خوش تھے اور سب کی آنکھیں اِدھر اُدھر صحرا میں اُن جگہوں اور مقامات کو تلاش کر رہیں تھیں جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر لائے تھے۔ سرائے سینا میں پہنچتے ہی ڈرائیور نے گاڑی دائیں ہاتھ موڑ دی۔ اب ہم بحرہ احمر کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف سفر کرنے لگے۔ بحرہ احمر ہمارے دائیں ہاتھ بالکل ہمارے پہلو میں اور بائیں طرف صحرا تھا۔ صحرا میں ایک خوبصورت اور پختہ سڑک پر ہم سفر کر رہے تھے۔ ہماری باتوں کا موضوع حضرت موسیٰ علیہ السلام، بنی اسرائیل اور یہ صحرا تھا۔ جب میں نے ذکر کیا کہ اسی علاقہ میں حضرت موسیٰ کے حوالے سے وہ چشمے ہیں جو انہوں نے اپنی قوم بنی اسرائیل کے مطالبہ پر ایک پتھر پر اپنا عصا مارا تو جاری ہوئے تھے۔ اور غالباً آج کل عین موسیٰ کے نام سے مشہور ہیں۔ تو سب ساتھیوں نے ایک ساتھ مطالبہ کیا کہ پھر عین موسیٰ ضرور جائیں گئے۔

یعقوب آزاد صاحب نے بتایا کہ: ''برطانیہ سے آتے وقت میں نے اپنی والدہ کو پاکستان فون کیا اور مصر جانے کی اجازت مانگتے ہوئے کہا کہ میرا نام آپ نے یعقوب رکھا ہے۔ یعقوب نام کے ایک بڑے برگزیدہ پیغمبر گزرے ہیں۔ مجھے ان کی آل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دیس کی سیر کرنی ہے۔ پیغمبروں کا نام سنتے ہی والدہ نے سفر پر جانے کی اجازت دے دی۔'' اب اگر حضرت موسیٰ کے چشمے والی جگہ موجود ہے تو ہمیں وہاں ضرور رکنا پڑے گا۔ منیر حسین اور میری بھی یہی دلی مراد تھی۔ ہم باتیں کرتے جا رہے تھے کہ سڑک کے کنارے ایک ہوٹل دیکھا جہاں چائے پینے کیلئے رکے۔ ہوٹل کے باہر ٹرک ڈرائیور چارپائیوں پر بیٹھے حقے پیتے گپیں لگا رہے تھے۔ بالکل پاکستان کا منظر یاد آنے لگا۔ ایسے ہوٹل کسی زمانے میں گوجرخان

کے قریب باؤلی ہوٹل کے نام سے ڈرائیوروں میں مشہور تھے۔ جہاں دال اور پراٹھے کا ناشتہ بڑا مشہور تھا۔ ہوٹل کے ملازم نے کمال مہربانی سے ایک جگہ ہمیں کرسیاں اور میز لگا کر دیا۔ جس پر مکھیاں یوں بیٹھیں ہوئیں تھیں جسے کسی ملک کی فوج دشمن کی گھات میں ہوتی ہے۔ بہرے نے ایک میلے کپڑے سے میز صاف کر کے مکھیوں کو اڑایا جو فضا میں چکر لگا کر دوبارہ میز پر آن بیٹھیں۔

یہاں ہمیں باؤلی ہوٹل جیسا ناشتہ ملا۔ جس میں پراٹھے تو نہیں تھے بہر حال اُن کی جگہ خبص (روٹی) اور ساتھ دال تھی۔ دال روٹی کھانے کے بعد ہم جانے لگے تو ایک ٹرک ڈرائیور سے عین موسیٰ کے بارے میں پوچھا۔ جس نے کہا کہ ہم آ گئے چلے جائیں۔ کچھ فاصلہ کے بعد بائیں مڑیں تو آپ حضرت موسیٰ کے چشموں پر پہنچ جائیں گے۔ ہم گاڑی میں بیٹھ کر ٹرک ڈرائیور کی ہدایت پر جب کوئی تین میل کا سفر طے کر چکے تو عین موسیٰ کو خدا حافظ کا بورڈ دیکھ کر ایک پولیس آفیسر سے پوچھا جس نے بتایا کہ وہ جگہ تو تین میل پیچھے تھی۔ ہم واپس آئے اور اُسی ہوٹل جہاں چائے پی تھی آ کر ہوٹل والے سے پوچھا جس نے بتایا کہ وہ جگہ تو یہی ہے۔ آپ یہاں سے بحرہ احمر سمندر کی طرف جائیں تو آپ کو حضرت موسیٰ کے وہ چشمے نظر آئیں گے۔ جو اس وقت عین موسیٰ کے نام سے مشہور ہیں۔

عین موسیٰ

ہم گاڑی میں بیٹھے اور سڑک سے دائیں مڑ کر ابھی چند گز ہی گئے تھے کہ چشموں کے آثار نظر آنے لگے۔ گاڑی کھڑی کی تو ایک بدو لڑکی صحرا کے روایتی لباس میں نقاب پہنے ہمارے پاس آئی اور انگریزی میں باتیں کرتے ہوئے ہمیں بتانے لگی کہ میرا نام جیہان ہے۔ میرا یہاں سٹال ہے جہاں سے سیاح تحفے خرید کر اپنے ملک لے جاتے ہیں۔ اگر آپ میرے سٹال سے خریداری کریں تو میں حضرت موسیٰ کے چشموں کی سیر بلا معاوضہ کرا دوں گی۔ ہم نے فوراً حامی بھر لی۔ میرے خیال میں اگر ہماری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو اُسے بھی انکار کرنے کی جرات نہ ہوتی۔ جیہان جوان، خوبصورت، خوش لباس اور خوش گفتار ہونے کے ساتھ ساتھ غزالی آنکھوں کی مالکہ ایسی لڑکی تھی جو ہر اُس انسان کو مسخر کر دینے کی صلاحیت رکھتی تھی

جس کے جسم میں دل ہے۔ اسے دیکھ کر میں سوچنے لگا کہ یہ کوئی جادوگرنی تو نہیں جس نے ہم پر اپنا کلام پڑھا اور اپنے دام میں گرفتار کر لیا۔ میں نے منیر حسین سے پوچھا تو اُن کی رائے بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی بلکہ اُن کے دل میں جو شعلے جل رہے تھے اُس کی تپش مجھے بالکل محسوس ہو رہی تھی۔

ہماری طرف سے اثبات میں سر ہلتے ہی جیہان نے ہماری رہنمائی شروع کر دی۔ اور ہمیں کنویں دکھانے لگی۔ اُس نے بتایا کہ: ''یہاں حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کے بارہ قبائل کے لئے بارہ کنویں کھدوائے تھے جن میں سے پانچ ریت اور مٹی سے بھر گئے ہیں مگر سات اب تک موجود ہیں۔'' ہم نے یہ سات کنویں دیکھے۔ جن میں پانی بھی نظر آ رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ کنویں باقاعدہ کھدائی کر کے تیار کیے گئے ہیں۔ جب میں کنویں دیکھ رہا تھا تو مجھے اس جگہ اور ان چشموں پر شک ہوا۔ چونکہ ان چشموں کے بارے میں قرآن پاک سورہ الاعراف آیات 159 میں ارشاد خداوندی کے مطابق ایک چٹان سے بارہ چشمے نکلے تھے۔ کنویں نہیں کھودے گئے تھے۔

> اور ہم نے اس قوم کو بارہ گھرانوں میں تقسیم کر کے انہیں مستقل گروہوں کی شکل دے دی تھی۔ اور جب موسیٰ سے اس کی قوم نے پانی مانگا تو ہم نے اس کو اشارہ کیا کہ فلاں چٹان پر اپنی لاٹھی مارو۔ چنانچہ اس چٹان سے یکا یک بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر گروہ نے اپنے پانی لینے کی جگہ متعین کر لی۔ ہم نے اُن پر بادل کا سایہ کیا اور اُن پر من وسلویٰ اُتارا۔

قرآن پاک کی ان آیات میں چٹان سے بارہ چشمے نکلنے کی بات ہے جبکہ عین موسیٰ تو صحرا ہے جس میں ہر طرف ریت ہی ریت نظر آ رہی تھی۔ اور یہ کنویں کسی نے خود کھودے تھے۔ یہاں تلاش کے باوجود مجھے کوئی چٹان نظر نہ آئی۔ البتہ جب ہم کوہ طور سے واپس آئے رہے تھے تب رفیدیم کے قریب ''حورب'' کی وہ مشہور چٹان دیکھی جس کے بارے میں مقامی لوگوں میں مشہور ہے کہ حضرت موسیٰ نے اسی چٹان پر عصا مارا اور بارہ چشمے پھوٹ نکلے تھے۔ میں نے جیہان سے بات کی تو وہ اپنی بات پر اڑی رہی کہ وہ چشمے رفیدیم کی بجائے یہاں ہی ہیں۔

چونکہ اس دلیل میں اُس کی روزی کا مسئلہ بھی تھا۔ باتوں کے ساتھ ساتھ جب ہم نے جیھان کے سٹال سے خریداری کی تو اُس نے اپنا حسن کیمرے کی آنکھ میں بند کرنے کی اجازت دے دی۔ منیر حسین نے بھی جیھان کے ساتھ فوٹو بنوا کر ایک تاریخ رقم کی۔ چونکہ یہ صاحب دوشیزاؤں کے ساتھ فوٹو بنوانے جیسے مشغلے سے ہمیشہ دامن بچاتے رہتے ہیں۔ لیکن اللہ جانے آج کیوں انہوں نے فوٹو بنوانے کے ساتھ ساتھ جیھان کے ساتھ ہنستے مسکراتے ڈھیر ساری باتیں کرتے ہوئے اُسے مخاطب کرتے ہوئے احمد ندیم قاسمی کا یہ شعر گنگنانے لگے۔

صرف اس شوق سے پوچھی ہیں ہزاروں باتیں
میں تیرا حسن ، تیرے حسن بیاں تک دیکھوں

میرے خیال میں انہیں یہ شعر پڑھنے کی بجائے ''بےخودی میں صنم اٹھ گئے جو قدم'' والا نغمہ الاپنا چاہئے تھا۔ بہر حال عین موسیٰ پر یعقوب آزاد نے صبر ایوب کا مظاہرہ کرتے ہوئے جیھان سے اپنا دامن بچائے رکھا۔ میں نے ایک دو بار انہیں غور سے دیکھا تو وہ زیر لب کچھ پڑھ رہے تھے ممکن ہے قل شریف پڑھتے رہے ہوں چونکہ جب جادو دل پر اثر کرنے لگے تو ایسے مواقعوں پر قل شریف ہی پڑھنے کا حکم ہے۔

نہ چاہتے ہوئے بھی جیھان نامی سحر انگیز خاتون کے اثر سے نکلے تو میں سوچنے لگا کیا حسین اتفاق ہے۔ جب میں فلسطین گیا تھا تو بحرہ مردار کے کنارے حضرت موسیٰ کے مزار پر حاضری دیتے وقت ایک حسینہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ اور آج عین موسیٰ کے مقام پر ایک اور حسینہ سے ملاقات ہو گئی۔ معلوم نہیں حسیناؤں نے حضرت موسیٰ کے مقامات پر ہی ڈھیرے کیوں ڈالے ہوئے ہیں۔

حمام فرعون

عین موسیٰ میں آدھا گھنٹہ گزارنے کے بعد ہم دوبارہ گاڑی میں بیٹھے اور اپنا سفر بحرہ احمر کے کنارے کنارے دوبارہ شروع کیا۔ جلد ہی ہم حمام فرعون پہنچ گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا ساحلی قصبہ ہے۔ جہاں تیزی کے ساتھ سیاحوں کی دلچسپی کیلئے ہوٹل اور دوسری عمارتیں تعمیر ہو رہی تھیں۔ مقامی باشندوں کے مطابق سمندر میں ڈوبنے کے بعد فرعون کی لاش اسی مقام سے

ملی تھی۔ جس کی بدولت یہ جگہ آج تک حمام فرعون کے نام سے جانی جاتی ہے۔

حمام فرعون کے مقام پر دور فراعنہ میں گندھک اور فاسفورس کی کانیں تھیں۔ گندھک کی وجہ سے یہاں بحرہ احمر کے کنارے گرم پانی کا چشمہ بھی ہے۔ اس چشمہ کی نوعیت آزاد کشمیر میں کوٹلی کے علاقہ تتہ پانی والے چشمہ جیسی ہے۔ مقامی لوگوں نے مجھے بتایا کہ اگر اس پانی میں انڈا رکھا جائے تو تھوڑی مدت میں پک جاتا ہے۔ حمام فرعون سے تھوڑا آگے سمندر سے تقریباً بیس پچیس میل کے فاصلہ پر وادی مغارہ ہے۔ یہاں تانبے اور دوسری معدنیات کی کانیں دور فراعنہ سے موجود ہیں۔ فراعنہ جب میت کو حنوط کرتے تھے تو اس عمل کے لئے جو کیمیائی مرکبات استعمال کرتے تھے۔ اُس میں فاسفوری نمک بھی استعمال ہوتا تھا۔ جو اس مقام سے نکال کر مصر لے جاتے تھے۔

حمام فرعون کے بعد ہم نے اسی سڑک پر سفر جاری رکھا۔ اب سمندر اتنا قریب تھا کہ ہمیں فکر ہونے لگی کہ کہیں سمندر کی لہریں سڑک پر نہ آجائیں۔ لیکن سمندر کمال صبر سے کام لے رہا تھا۔ جو مسافروں سے چھیڑ چھاڑ تو کرتا لیکن اُن کا راستہ نہیں روکتا تھا۔ ہم اسی سڑک پر سمندر سے آنکھ مچولی کرتے سفر کرتے رہے۔ ہمارے بائیں ہاتھ دور دور تک صحرا تھا جس سے آگے اونچے اونچے ریتلے پہاڑ نظر آرہے تھے۔ ہم سفر کرتے ہوئے ابوزینہ پہنچے۔ ابوزینہ اس علاقہ میں بڑی اہمیت کا ایک قصبہ ہے۔ دور فراعنہ میں اس علاقہ میں تانبے اور گندھک کی کانیں تھیں۔

ابوزینہ سے آگے بلاعیم کے مقام سے گاڑی ساحل سمندر سے دور ہٹنا شروع ہوگئی اور پھر صحرائی پہاڑوں کے درمیان سے ہمارا سفر جاری رہا۔ یہ پہاڑ ریتلے سرخی مائل تھے۔ سبزے کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ پھر بھی بھیڑ بکریوں کو اُس ریگستان میں گھومتے پھرتے دیکھا۔ ہم ان ویران اور سنسان پہاڑوں کے درمیان کوئی تیس میل سفر کرتے ہوئے دوبارہ ساحل سمندر کی طرف آتے آتے سمندر کے قریب آگئے۔ یہاں سے یہ سڑک دو حصوں میں تقسیم ہوجاتی ہے۔ ایک بائیں مڑ کر پہاڑوں کے درمیان سے گزر کر تقریباً ساٹھ میل کا سفر طے کرکے کوہ طور یعنی جبل موسیٰ تک جاتی ہے۔ اور دوسری سیدھی آگے شرم الشیخ چلی جاتی ہے۔ ہمیں تو کوہ طور جانا تھا۔ لیکن ساتھیوں نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ رات شرم الشیخ میں گزاری جائے اور صبح

تازہ دم ہو کر جبل موسیٰ پہنچا جائے تا کہ ہم کوہ طور پہاڑ پر بھی چڑھ سکیں۔ یوں ہم نے کوہ طور جانے کی بجائے اپنا سفر شرم الشیخ کی طرف جاری رکھا۔

شرم الشیخ اور جبل موسیٰ یعنی کوہ طور کی طرف جہاں سے راستے الگ الگ ہوتے ہیں وہاں ایک مسجد کے قریب گاڑی روکی تا کہ نماز ظہر ادا کی جاسکے۔ مسجد کے اندر گئے لیکن وضو کیلئے پانی نہیں تھا۔ بکاری، یعقوب آزاد اور ڈرائیور ھمام نے وہاں قریب کسی کے گھر جا کر وضو کیا۔ علاقہ میں پانی کی قلت تھی۔

من وسلویٰ

پروگرام کے مطابق ہم نے جبل موسیٰ کی بجائے شرم الشیخ کا رخ کیا تو جلد ہی ہم وادی المرخہ پہنچے۔ ہم نے صحرا کے درمیان میں سے گزرتے ہوئے ایک جگہ گاڑی کھڑی کی۔ حد نظر تک صحرا تھا۔ یہی جگہ وادی المرخہ ہے۔ جسے بائبل میں ''بیبان سین'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کولیکر جب اس مقام پر پہنچے تب قوم کو دو بڑے مسائل درپیش تھے۔ ایک انتہائی دھوپ اور دوسرا کھانا۔ یہ دونوں چیزیں صحرا میں ملنی انتہائی مشکل تھیں۔ جب تک آپ خود اس مقام کو دیکھ نہیں لیتے بنی اسرائیل کی مشکلات کو سمجھنا مشکل ہے۔ یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں انتہائی گرمی کے ساتھ ساتھ کھانے پینے کی اشیاء کا ملنا مشکل ہے۔ اور پھر ایک دو نہیں ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع ہو جائیں تو ایسے میں بغیر اللہ تعالیٰ کی ذات کے کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ ایسے حالات میں حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی جسے اللہ میاں نے قبول کیا تھا۔ جس کا ذکر قرآن پاک میں سورہ البقرۃ آیات 55 میں ہے:

> ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا، من وسلویٰ کی غذا تمہارے لیے فراہم کی
> اور تم سے کہا کہ جو پاک چیزیں ہم نے تمہیں بخشی ہیں انہیں کھاؤ مگر
> تمہارے اسلاف نے جو کچھ کیا، وہ انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔

المرخہ کی اسی وادی میں بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ نے ابر کا سایہ کیے رکھا اور اس دوران انہیں کھانے کیلئے من وسلویٰ عطا کیا۔ من وسلویٰ کے بارے میں مفکرین کی رائے ہے کہ من دھنیا کے بیج جیسی کوئی چیز تھی جو اوس کی شکل میں زمین پر گر کر جم جاتی تھی جبکہ سلویٰ بٹیر کی مانند

پرندے تھے۔ ایک صبح بنی اسرائیلی بیدار ہوئے تو اپنے اردگرد من وسلویٰ دیکھ کر بے ساختہ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے ''من''، یعنی یہ کیا ہے؟ بنی اسرائیل عبرانی زبان بولتے تھے اور عبرانی میں من کا مطلب ہے یہ کیا ہے؟ بنی اسرائیل کو من وسلویٰ چالیس سال تک اُس وقت تک ملتا رہا جب تک بنی اسرائیل نے یہ پاک نعمتیں کھانے سے خود انکار نہیں کیا۔ قرآن پاک میں اس انکار کا ذکر سورہ البقرہ میں یوں آتا ہے:

> یاد کرو، جب تم نے کہا تھا کہ ''اے موسیٰ ہم ایک ہی طرح کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔ اپنے رب سے دُعا کرو کہ ہمارے لیے زمین کی پیدوار، ساگ، ترکاری، گہیوں، لہسن، پیاز وغیرہ پیدا کرے۔'' تو موسیٰ نے کہا: ''کیا ایک بہتر چیز کے بجائے تم ادنیٰ درجے کی چیزیں لینا چاہتے ہو؟ اچھا کسی شہری آبادی میں جارہو۔ جو کچھ تم مانگتے ہو وہاں مل جائے گا۔''

جب ہم وادی المرخہ میں سے گزر رہے تھے تب زندگی میں پہلی بار سراب کو عملی شکل میں دیکھا۔ دور دور تک ریت اور پانی نظر آرہا تھا۔ لیکن جب نظریں دھندلاتیں تو یوں محسوس ہونے لگتا کہ آگے سمندر ہے۔ جوں جوں ہم قریب جاتے تو نظر آنے والا پانی بھی ہمیں دھوکا دیکر دور بھاگ جاتا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے اس کا اظہار کیا تو انہوں نے بھی سراب کے یہی نظارے دیکھے تھے۔

جنوبی سینا کے علاقہ راس السدر میں سمندر کے کنارے کنارے سفر کرتے ہوئے ہم نے سمندر کے بیچ تیل کے کنویں دیکھے۔ یہ کنویں وقفے وقفے پر بہت سی جگہوں پر کام کررہے تھے۔ فضاء میں بلند دھواں اور آگ کے بھڑکتے شعلے اس بات کے گواہ تھے کہ سینا کا یہ علاقہ اب تیل کی شکل میں زمین سے سونا اُگل رہا ہے۔ حمام ہمیں بتارہا تھا کہ دن بدن مصر میں تیل کے نئے نئے ذخائر دریافت ہورہے ہیں۔

یوں ہی سفر کرتے ہوئے ہم کوہ طور سٹی پہنچے۔ کوہ طور شہر کا بورڈ دیکھ کر میں تذبذب میں پڑ گیا۔ میرے خیال میں کوہ طور تو صحرائے سینا کے پہاڑوں میں واقع تھا۔ ساحل سمندر پر اس کا نام دیکھ کر میں نے منیر حسین سے بات کی جو نقشہ پڑھنے کے بڑے ماہر ہیں۔ سفر کے

دوران اُن کی دوسری ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری یہ بھی ہوتی ہے کہ نقشہ دیکھ کر ڈرائیور کی رہنمائی کریں۔ منیر حسین نے نقشہ غور سے پڑھا اور کہا بادشاہو معاملہ میں کوئی گڑبڑھ ہے۔ جسے ہم کوہ طور کہتے ہیں اُسے نقشہ میں جبل موسیٰ اور سینٹ کیتھرائین لکھا ہوا ہے۔ جب کہ یہ کوہ طور تو بحرہ احمر کے کنارے ایک شہر کا نام ہے۔ جس کا حضرت موسیٰ سے کوئی تعلق نہیں۔

یعقوب آزاد نے جب منیر حسین کی عالمانہ رائے سنی تو ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہنے لگے: نظامی صاحب اگر منیر حسین ہمارے ساتھ نہ ہوتے تو ہمیں آج یہ بات کون سمجھاتا اور پھر نقشہ پڑھنے کے تو ہم ان کے اُس زمانے کے قائل ہیں جب اٹلی کی سیاحت پر گئے تھے۔ یہ ان کا کمال تھا کہ اٹلی میں انہوں نے مشکل جگہوں کو بھی کچھ اس طرح ڈھونڈا کہ بعض اوقات ہم راستہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے خود ہی گم ہو جاتے تھے۔

کوہ طور سٹی بحرہ احمر کے کنارے آباد ہے۔ یہ کافی بڑا شہر ہے۔ جس میں ترقیاتی کام زور وشور سے جاری تھے۔ اس شہر کو کوہ طور پہاڑ یعنی جبل موسیٰ سے کوئی نسبت نہیں۔

شرم الشیخ

کوہ طور سٹی سے نکل کر ہم نے اپنا سفر شرم الشیخ کی طرف جاری رکھا۔ مسلسل ریگستان اور صحرا میں سے سفر کرتے ہوئے چار بجے شرم الشیخ کی حدود میں پہنچے تو مصری آرمی اور خفیہ اداروں کے آفیسروں نے ہماری کار کو روک کر جامعہ تلاشی لی۔ پاسپورٹ چیک کیے اور جب ہر طرح کی تسلی ہوئی تو ہمیں شرم الشیخ داخل ہونے کی اجازت ملی۔

شرم الشیخ کی حدود میں داخل ہوتے ہی یوں محسوس ہوا جیسے اچانک ہم افریقہ کے صحرا سے گزر کر یورپ کے کسی جدید شہر میں پہنچ گئے ہیں۔ انتہائی صاف ستھرا شہر۔ جو ہر طرح کی ماحولیاتی آلودگی سے پاک تھا۔ سڑکیں کشادہ اور انتہائی خوبصورت۔ بڑی بڑی شاہراہیں دو طرفہ ٹریفک کیلئے استعمال ہوتی تھیں۔ عمارتیں دو منزل سے زیادہ اونچی نہیں۔ سب شہر میں یکسانیت اور انتہائی نفاست۔ سڑکوں کے کنارے خوبصورت درخت دست بدستہ یوں کھڑے تھے جیسے سیاحوں کو خوش آمدید کہنے کیلئے چاک وچوبند جوان کھڑے ہوتے ہیں۔ دو طرفہ استعمال ہونے والی سڑکوں کے درمیان والی جگہ پر رنگ برنگے پھول کھلے سیاحوں کے دل لبھانے کا

سامان فراہم کر رہے تھے۔

شرم الشیخ اگر دنیا کا نہیں تو مصر کا سب سے نیا اور جدید شہر ہے۔ابھی کل کی بات ہے جب صحرائے سینا کے آخری نکر پر واقع اس علاقہ میں مچھیروں کا قبضہ تھا۔ دنیا کے نقشہ پر صحرائے سینا ڈھونڈنے کیلئے آپ بحرہ احمر کے درمیان انگریزی حروف V کی شکل کا ایک خطہ دیکھتے ہیں۔لفظ وی کے نیچے والی نکر پر شرم الشیخ ہے۔جس کے تینوں طرف بحرہ احمر ہے۔شرام الشیخ سے جوں جوں اوپر کی طرف جائیں بلند و بالا پہاڑ اور علاقہ میں وسعت پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ان پہاڑوں کے درمیان وہ پہاڑ بھی ہے جو کوہ طور ، طور سینا یا جبل موسیٰ کے نام سے مشہور ہے۔ پہاڑی سلسلے سے گزرنے کے بعد بحرہ روم کی طرف کا علاقہ میدانی شروع ہو جاتا ہے۔ سینا کی سرحدیں ایک طرف مصر کے شہر اسماعیلیہ، پورٹ سعید اور وہاں سے ہوتی ہوئی دائیں طرف فلسطین سے ملتی ہیں۔اگر آپ شرم الشیخ سے دائیں طرف ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ سفر کرتے جائیں تو بحرہ احمر کی مشہور بندرگاہ عقبہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ عقبہ کی بندرگاہ پر مصر کے علاقہ سینا، سعودی عرب اور اردن کی سرحدیں ملتی ہیں۔ عقبہ سے دائیں سعودی عرب کی طرف بحرہ احمر کے کنارے مدین کا علاقہ ہے۔ جہاں حضرت موسیٰ نے تقریباً دس سال نبی اللہ حضرت شعیب کی بکریاں چرائی تھیں۔

شرم الشیخ میں ہمارا قیام سن سیٹ ہوٹل Sun set Hotel میں تھا۔ یہ فائیو سٹار جدید ترین ہوٹل تھا۔جس کی دو منزلیں تھیں۔جیسے کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ شرم الشیخ دنیا کا واحد شہر ہے جس میں کوئی عمارت دو منزل سے زیادہ اونچی نہیں۔ ہوٹل میں ہمارا کمرہ نمبر 209 تھا ۔ میرے روم میٹ منیر حسین تھے۔ ہوٹل میں سامان رکھا۔غسل کر کے دن بھر صحرا کی ریت کو صاف کیا۔ نئے کپڑے پہن کر شرم الشیخ کی سیر کو نکلنے والا تھا کہ دیکھا منیر حسین غائب ہیں۔ میں نے کمرے میں اِدھر اُدھر ڈھونڈا تو وہ نظر نہیں آئے۔ میں نے پکارا تو کھڑکی کے پردوں کے پیچھے سے آواز آئی کہ بادشاہو اِدھر آؤ اور آنکھیں ٹھنڈی کرو۔ میں نے کھڑکی کا پردہ اٹھایا تو ہمارے سامنے ہوٹل کے پچھواڑے میں سوئمنگ پول میں گورے اور گوریاں خرمستیاں کر رہے تھے۔

گوریوں نے تو افریقہ میں یورپ بنا رکھا تھا یعنی جنگل میں منگل تھا۔ اگر میں

گوریوں کو زندگی میں پہلی باراس حالت میں دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ بیچاریاں اتنی غریب ہیں کہ انہیں پہننے کو کپڑے بھی نہیں۔ بالکل اپنے اُس پاکستانی سیاح کی طرح جو پاکستان کے ایک دیہات سے اپنے رشتہ داروں کو ملنے انگلستان گیا۔ سیاح صاحب پڑھے لکھے تھے نہیں۔ چنانچہ ولایت کی ہر چیز کو تجسس سے دیکھتے۔ ایک دن اُن کے رشتہ دار لڑکے سیاح صاحب کو انگلستان کے ساحل سمندر بلیک پول لے گئے۔ جہاں انہوں نے گوریوں کو تیراکی کے لباس میں دیکھا تو فرط حیرت میں ڈوب کر ٹکٹکی باندھ کر انہیں دیکھنے لگا۔ ایسی حرکت یورپی معاشرے میں پسند نہیں کی جاتی۔ لیکن یہ دیہاتی بھائی مسلسل انہیں دیکھ دیکھ کر جب ہر طرح سے سیر ہوا۔ تو ٹھنڈی سانس لیکر اپنے میزبان لڑکوں سے پوچھا کہ یہ عورتیں ننگی کیوں ساحل سمندر پر گھوم رہی ہیں۔ لڑکے شریر تھے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ غریب گوریاں ہیں۔ جن کے پاس اتنے پیسے نہیں کہ وہ کپڑے خرید سکیں۔

غریب گوریوں کا سن کر ہمارے دیہاتی سیاح کے اندر ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوا اور اپنے میزبان لڑکوں کو کہنے لگا۔ مجھے انگریزی نہیں آتی لیکن میرا ایک پیغام انہیں دیں کہ میں زیادہ تو نہیں تین چار گوریوں کے نان نفقے کی ذمہ داری لے سکتا ہوں۔

میں اور منیر صاحب ہوٹل سے نیچے اُترے تا کہ یعقوب آزاد کو بھی اس مفت کی عیاشی میں شامل کریں تو دیکھا آزاد صاحب ہم سے پہلے ہی ایک مصری سیاح کے ساتھ بیٹھے ٹکٹکی باندھے اس منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

شرم الشیخ ایک ساحلی شہر ہے۔ جس میں مقامی باشندے تو نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اصل میں یہ شہر سیاحوں کے لئے آباد کیا گیا ہے۔ 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ کے دوران سینا کا علاقہ اسرائیل کے قبضہ میں چلا گیا تھا۔ جنہوں نے شرم الشیخ کے مقام پر اپنا فوجی اڈہ اور سیاحوں کیلئے مرکز بنانے کا آغاز کیا۔ اسرائیل کیلئے یہاں بندرگاہ اور فوجی اڈہ بنانے کی بڑی اہمیت تھی جہاں سے وہ باآسانی مصر کے علاقہ کو کسی وقت بھی اپنا ہدف بنا سکتے تھے اور دوسری طرف بحرہ احمر کے اُس پار سعودی عرب بھی انکی زد میں تھا۔ لیکن 1978ء میں کیمپ ڈیوڈ معاہدہ کے مطابق اسرائیل نے مصر کے تمام علاقے واپس کر دیئے تھے۔

شرم الشیخ جہاں کسی زمانے میں مچھیروں نے ڈھیرے ڈالے ہوئے تھے آج وہاں

یورپی اور امریکی سیاحوں نے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ قاہرہ سے شرام الشیخ تک کا سفر پانچ سوکلومیٹر ہے۔ جو ہم نے آٹھ گھنٹوں میں طے کیا تھا۔

سینا کا علاقہ آزاد ہوا تو اسرائیل کے تجارتی ذہین یہودیوں نے شرم الشیخ کے مقام پر جوفوجی اڈے اور سیاحتی مراکز بنائے تھے مصری حکومت نے فوجی اڈہ ختم کر کے پوری توجہ ٹورازم پر لگا دی۔ یوں جس شہر کا آغاز چند عمارتوں سے ہوا تھا آج وہ پھیل کر ایک خوبصورت شہر کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ شہر کے پاؤں میں بحرہ احمر اور پشت پر بھورے بھورے ریتلے پہاڑ ہیں۔ ہم ہوٹل سے نکلے تو ایک بڑی شاہرہ جو دوطرفہ ٹریفک کیلئے استعمال ہوتی تھی سے گزر کر ساحل سمندر کی طرف چلے گئے۔ جہاں ایک جگہ گاڑی کھڑی کر کے ہم نے پیدل چل کر شہر دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ آج مارچ کی سات تاریخ تھی۔ موسم انتہائی خوشگوار تھا۔ میٹھی میٹھی دھوپ میں پیدل چلنا بہت اچھا لگتا تھا۔

شرم الشیخ کے بازار ساحل سمندر کے قریب ہیں۔ ہم اُن بازاروں میں سے گزر کر ساحل سمندر کی طرف چلے گئے۔ جب میں نے سمندر دیکھا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اتنا صاف، ستھرا اور شفاف سمندر میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں کراچی میں کلفٹن، اٹلی، فرانس اور برطانیہ کے ساحل سمندر پر گیا لیکن پانی کی وہ خوبصورتی دیکھنے میں نہیں آئی جو شرم الشیخ میں دیکھی۔ پانی اس قدر شفاف تھا کہ سمندر کی تہہ میں ریت نظر آتی تھی۔ پانی میں تیرتی رنگ برنگی مچھلیاں دل لبھاتی تھیں۔ میں نے اپنے کیمرے سے سمندر میں تیرتی مچھلیوں کے فوٹو اُتارے تو وہ بالکل صحیح فوٹو تیار ہوئے۔ سمندر کی سیر کیلئے اس طرح کی کشتیاں ہیں جن کے نیچے لکڑی کی بجائے شیشہ لگا ہوا ہے تاکہ سیاح سمندر کی سیر کے دوران نیچے دور تک سمندر میں تیرتی مچھلیاں اور دوسری آبی مخلوق کو دیکھ سکیں۔

شرم الشیخ کا ساحل سمندر دنیا کے اُن لوگوں کیلئے بڑی کشش رکھتا ہے جو سمندر میں ڈبکی لگانے کے شوقین ہیں۔ ایسے شوقین خصوصی لباس پہن کر آلات سے لیس سمندر میں اُتر کر تیرتے رہتے ہیں۔ سمندروں میں تیرنے اور ڈبکیاں لگانے کے شائقین کا کہنا ہے کہ اس سمندر کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں۔

سمندر کے کنارے دور دور تک ریت سے بھرے ساحل تھے۔ جہاں یورپی سیاح

فطرتی لباس میں لیٹے دھوپ تاپ رہے تھے۔ کچھ سمندر میں نہانے کے بعد گوریوں کو پہلو میں دبائے دل بہلا رہے تھے۔ شرم الشیخ کی ہر دل عزیزی کا یہ عالم ہے کہ برطانیہ کے وزیر اعظم ٹونی بلیئر ہر سال کرسمس کی تعطیلات شرم الشیخ کے ساحل سمندر پر گزارتے ہیں۔

شرم الشیخ میں سیاحوں کی اکثریت یورپی اور امریکی تھی۔ وہاں گھومتے ہوئے مجھے بالکل احساس نہیں ہوا کہ میں صحرائے سینا کے اُس علاقہ میں ہوں جو مصر میں واقع ہے۔ بالکل یہی سوچتا رہا کہ یہ یورپی ملک ہے۔ سیاحوں کے نہ صرف رنگ سفید تھے بلکہ اُن کی چال چلن، عادات بھی یورپی تھی۔ اور بات چیت بھی انگریزی میں کرتے تھے۔ عربی مصر کی قومی زبان ہے لیکن شرم الشیخ میں اسے شجر ممنوع سمجھا جاتا ہے۔

ہم کافی عرصہ ساحل سمندر پر گھومتے پھرتے لطف اندوز ہوتے رہے۔ جب آنکھیں ہر لحاظ سے ٹھنڈی ہو گئیں تب ہم نے بازار کا رخ کیا۔ اب شام ڈھل چکی تھی۔ اور بازار لگ چکے تھے۔ بازار میں ہر طرح کی ٹریفک بند تھی۔ اسی وجہ سے لوگ بے فکرے بازار میں گھوم پھر کر سیر کر رہے تھے۔ یورپی عورتیں نیم عریاں لباس میں چہک چہک کر مستیاں کرتیں اُچھل کود میں مصروف تھیں۔ کچھ سنجیدہ خراماں خراماں ہر چیز سے بے نیاز بازار کو گھوم پھر کر دیکھ رہے تھے۔ بازار زیادہ تر ہوٹلوں پر مشتمل تھے۔ دونوں طرف ہوٹل درمیان میں کھلی سڑک اور ہوٹلوں کے صحن کھلے۔ جن میں صوفے اور عربی طرز کے گاؤ تکیے زمین پر سجے ہوئے تھے۔ جب ہم یہاں سے پہلے گزرے تھے تب بازار کی رونق اور تھی اور اب اور ہے۔ شام ہوتے ہی سیاح ہوٹلوں میں آکر بیٹھنا شروع کر دیتے ہیں۔ یورپی سیاح تفریح طبع کے لئے فرش پر گاؤ تکیے لگائے شیشہ (حقہ) پینے میں مصروف تھے۔ پہلو میں بیٹھی میمیں بھی شیشے کے کش لگا کر دھواں بڑی نزاکت کے ساتھ مردوں کے منہ پر چھوڑ کر قہقے لگاتی تھیں۔

ہوٹل کے خدمت گار بھی بڑے متحرک تھے۔ وہ دوڑ دوڑ کر گاہکوں کی خدمت میں مصروف تھے۔ کچھ اکیلی دوشیزائیں ان سیاحتی مراکز میں چند دنوں یا زندگی بھر کے جیون ساتھیوں کی تلاش میں تھیں۔ ہوٹل کے خدمت گار اِن دوشیزاؤں کے دلوں کے راز دان ہوتے ہیں۔ یوں وہ ایسی ضرورت مند خواتین کی ہر طرح کی خدمت کے لئے تیار رہتے ہیں۔ ہم نے ایسے کئی نظارے دیکھے جہاں ہوٹل کے خدمت گار بڑی محنت سے لڑکیوں کے دل جیتنے کی کوشش

میں لگے ہوئے تھے۔ انہیں یہ آس تھی کہ اگر کسی لڑکی سے بات پکی ہو جائے تو پھر اُن کی وساطت سے وہ یورپی ممالک میں مستقل رہائش اختیار کر سکتے ہیں۔

ہم کافی عرصہ شرم الشیخ کے بازاروں میں گھومتے پھرتے رہے۔ لیکن خریداری نہیں کی۔ سیاحتی مراکز سے خریداری کرنی دانشمندانہ بات نہیں سمجھی جاتی۔ جہاں ہر چیز بہت ہی مہنگی فروخت ہوتی ہے۔ شام کے وقت انتہائی موافق ٹھنڈی ٹھنڈی دل فریب ہوائیں چل رہی تھیں۔ یہاں گھومتے ہوئے میں نے بیگم کو انگلستان فون کیا تو پتہ چلا انگلستان سخت سردی کی لپیٹ میں آیا ہوا ہے۔ برفباری جاری ہے۔ جب میں نے بیگم کو شرم الشیخ کے معتدل اور سہانے موسم کی بات سنائی تو اُس نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا کاش میں بھی وہاں ہوتی...... لیکن بقول غالب:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دل نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

شام بھر ہم یوں ہی گھومتے پھرتے لطف اٹھاتے، دنیا کے مختلف ممالک کے سیاحوں سے ملتے باتیں کرتے واپس ہوٹل آئے۔ اور کھانا کھانے سیدھے ڈائنگ ہال چلے گئے۔ جہاں حلال گوشت پر مشتمل لذیز کھانے کھا کر شکم کو بھی سیر کیا۔

یہودیت

ہوٹل میں کام کرنے والا تمام سٹاف یہودی تھا۔ کھانے کے دوران منیر حسین نے جائزہ لینے کے بعد کہا بادشاہو یہ ہوٹل تو یہودیوں کا ہے۔ ہمیں ہوٹل تبدیل کر دینا چاہئے۔ ہم نے اپنے ڈرائیور حمام سے بات کی تو اُس نے بتایا کہ اس شہر میں کسی مسلمان کا ہوٹل نہیں۔ چونکہ تمام کاروبار یہودیوں کے ہاتھ میں ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ کچھ مسلمان شرم الشیخ جیسے نئے سیاحتی مراکز کے خلاف ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ ہوا جب اس شہر میں بم دھماکے ہوئے۔ جس کی بناء پر سیاحوں کی آمد میں کمی ہوئی۔ سیاحوں کی کمی سے مراد شہر اور کاروباری لوگوں کی آمدن میں کمی ہے۔ اسی وجہ سے حکومت نے سیکورٹی کے انتظامات میں سختی کی ہے۔ بات سے بات چلی تو حمام نے پوچھا جس طرح مسلمان سنی، اہل حدیث اور اہل تشیع جیسے فرقوں میں تقسیم ہیں کیا یہودیوں کا شیرازہ بھی اسی طرح بکھرا ہوا ہے؟ موضوع دلچسپ تھا۔ جس میں منیر حسین، یعقوب آزاد

اور بکاری نے بھی دلچسپی لینی شروع کی۔ میں نے بتایا کہ مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا فضل خاص ہے کہ ان کا اسلام کے بنیادی ارکان پر کوئی اختلاف نہیں چند فروعی اختلافات موجود ہیں لیکن اس سے اسلام کی اصل روح متاثر نہیں ہوتی۔ لیکن یہودیوں کے فرقے تو یہودیت کے بنیادی اصولوں پر بھی اتفاق نہیں کرتے۔

یہودیت کا آغاز مصر سے ہوا۔ جہاں آل یعقوب کو حضرت یوسف علیہ السلام نے لا کر آباد کیا تھا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے۔ بارویں بیٹے کا نام یہودہ تھا۔ جن کی اولاد آج اپنے آپ کو یہودی کہلاتی ہے۔ قرآن پاک میں انہیں بنی اسرائیل کے نام سے پکارا گیا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہو سکتی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا دوسرا نام اسرائیل بھی تھا۔ اور یہودی اپنی نسبت حضرت یعقوب علیہ السلام سے جوڑتے ہیں۔ میں 1999ء میں فلسطین کے قصبہ حبرون گیا۔ جہاں آل ابراہیم کے مزارات ہیں۔ ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام کے مزاروں پر حاضری دی لیکن یہودیوں نے ہمیں حضرت یعقوب علیہ السلام کے مزار پر جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔

یہودیوں کے روز اول سے آپس میں اسقدر شدید اختلافات تھے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ پانی پینا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ صحرائے سینا میں حضرت موسیٰ نے یہودیوں کے بارہ گروہوں کیلئے بارہ چشمے جاری کروائے تا کہ یہ آپس میں جھگڑے نہ کریں۔

یہودی آج بھی متعدد فرقوں میں تقسیم ہیں۔ یہ تقسیم اُن کے عقائد، طریقہ عبادت اور نسل کی بنیاد پر ہیں۔ مثال کے طور پر وسطی یورپ میں بسنے والے یہودی اشکنازی یہودی (Ashkenazi Jews) اور سپین میں آباد (Sephardi Jews) سفارڈی یہودی کہلاتے ہیں۔ یہودیت کے بڑے بڑے فرقوں کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

آرتھوڈکس یہودیوں کا کہنا ہے کہ وہ اصل تعلیمات اور روایات اور عقائد پر عمل کرتے ہیں۔ وہ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ توریت اور تلمود (فقہ یہودی یا فقہ موسوی) براہ راست یہودیوں کیلئے نازل ہوئیں تھیں۔ اس لئے وہ ان الہامی کتابوں کو حقیقی کتابیں تسلیم کرتے ہوئے ان کا احترام کرتے ہیں۔ اور ان کی سب سے اعلیٰ و ارفع حیثیت ہے۔ ان

کتابوں کی بنیاد پر یہودی قوانین اور رسومات کا تعین کیا جاتا ہے۔امریکہ سے باہر متعدد ممالک میں اس فرقے کے ماننے والوں کی کثیر تعداد موجود ہے۔

آرتھوڈکس کے علاوہ دوسرا بڑا فرقہ الٹرا آرتھوڈکس کہلاتا ہے۔جس کے ماننے والے مذہبی قوانین پر بڑی سختی سے عمل کرتے ہیں۔یہ الگ کمیونٹی کی حیثیت سے رہتے ہیں اور اپنی رسومات پر عمل کرتے ہیں۔کسی حد تک یہ اپنے آپ کو دنیا سے ہی الگ رکھتے ہیں۔ یہودیوں کا یہ فرقہ ان دنوں سب سے زیادہ فروغ پا رہا ہے۔ یہ فرقہ اپنے آپ کو ہارىڈی Haredi کہلانا پسند کرتا ہے۔

ہارىڈی Haredi فرقہ کی مزید متعدد شاخیں ہیں۔ Hasidic ہیسیڈس یہودی بھی انکی ایک شاخ ہے۔ یہ لوگ خود سیکھنے کی بجائے تصوف پر زیادہ اعتقاد رکھتے اور اپنے روحانی پیشوا کا بہت زیادہ احترام کرتے ہیں۔ان کا آغاز اٹھارویں صدی میں پولینڈ سے ہوا۔ جرمن میں ہالوکوسٹ Holocaust کے مشہور واقعہ کے بعد یہ تقریباً تمام ختم ہو گئے تھے۔ کچھ یہودی اپنے آپ کو قدامت پسند تسلیم کرتے ہیں۔یہ ماسورٹی Masorti کہلاتے ہیں۔

ماڈریٹ یہودیت کا آغاز انیسویں صدی میں جرمنی میں ہوا۔ انہوں نے اپنی روایات اور عقائد کو جدیدیت کے رنگ میں رنگنے کا آغاز کیا تھا۔ یہ توریت اور تلمود کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کی گئی اصل کتاب تسلیم نہیں کرتے ہیں۔چونکہ ان کے خیال میں موجود کتابیں کسی نے حالات و واقعات کے مطابق تبدیل کر لی تھیں۔اس فرقہ سے تعلق رکھنے والوں کی اکثریت امریکہ میں آباد ہے۔برطانیہ میں بھی ان کا بڑا مضبوط گروپ موجود ہے۔ لیکن امریکہ میں بسنے والے یہودیوں کی نسبت زیادہ روایات پسند ہیں۔ اسی طرح اصلاح پسند Reconstructionist اور انسانی ہمدردی Humanistic کے علم بردار یہودیوں کی تحریکیں بھی ایک نئے فرقے کی شکل میں امریکہ میں فروغ پا رہی ہیں۔جس میں وہ تمام یہودی شامل ہو رہے ہیں جو دوسرے فرقوں کو پسند نہیں کرتے۔

شرم الشیخ کے ہوٹل کے ڈائنگ ہال میں یہودیوں کے فرقوں پر باتیں کرتے پتہ ہی نہ چلا کہ رات کے گیارہ بجنے والے ہیں۔ صبح جلدی اٹھنے کی نیت سے ہم اٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے اور جلد ہی لمبی تان کر سو گئے۔

جانب طور موسیٰ

آج کا دن بڑا متبرک تھا۔ آج مجھے اُن مقامات کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا تھا جن کا مذہبی حوالے سے بڑا محترم مقام ہے۔ جبل موسیٰ کو دیکھنے اور اُس مقام پر چل کر جانے کی حسرت ایک زمانے سے دل میں انگڑائیں لے رہی تھی۔ لیکن اس سفر کو عملی جامعہ پہنانے میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ حائل ہوتی رہی۔ لیکن آج اللہ تعالیٰ نے تمام رکاوٹیں دور کر دیں تھیں۔ آج میرے ساتھی بھی ان مقدس مقامات کو دیکھنے کیلئے بیتاب تھے۔

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ سینا کا علاقہ انگریزی کے لفظ **V** کی طرح ہے۔ اس **V** کے سب سے نیچے پینڈے میں شرم الشیخ ہے۔ آج ہمیں وہاں سے اوپر کی طرف سفر کرنا ہے۔ ہم نے ناشتہ کیا اور جب شرم الشیخ سے نکلے تو صبح کے آٹھ بج چکے تھے۔ ھمام نے گاڑی میں پیٹرول ڈلوا لیا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ راستے میں پٹرول ملنا مشکل ہے۔ جب ہم شہر سے گزر رہے تھے تب کچھ گاڑیاں سیکورٹی کے اہلکاروں کو سڑک کے کنارے وقفہ وقفہ پر اُتار رہیں تھیں۔ جوں ہی کسی کو اُتارا جاتا وہ سڑک کی طرف پشت کر کے پاق و چو بند تن کر کھڑا ہو جاتا۔ پھر ہم نے شرم الشیخ کے ہوائی اڈہ کی طرف رخ کیا لیکن تھوڑا آگے جا کر ہم بائیں مڑ کر ایک پہاڑی سلسلہ میں داخل ہو گئے۔ اب ہم شرم الشیخ کی حدود سے نکل آئے تھے۔ ہمارا سفر اونچے اونچے پہاڑوں کے درمیان طے ہونے لگا۔ سرخی مائل رنگت کے بلند و بالا پہاڑ جن پر ہریالی نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ ایک انتہائی پختہ سڑک بل کھاتی پہاڑوں کے درمیان میں سے گزر رہی تھی۔ وقفہ وقفہ پر خانہ بدوشوں کے خیمے نظر آتے رہے۔ کچھ نے خیمے برستانی نالوں کے عین درمیان میں لگائے ہوئے تھے۔ خیموں کے اردگرد بدو خواتین اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھیں۔ جن کے قریب بچے بھی کھیل رہے تھے۔

شرم الشیخ سے نکلے تو راستے میں پہلی بستی وادی مجیری کی تھی۔ جہاں چند مکان تھوڑے تھوڑے وقفے پر بنے ہوئے تھے۔ مکان ایک ایک کمرے پر مشتمل تھے۔ اور گھروں کے اردگرد اونٹ اور بھیڑ بکریاں چرتی نظر آ رہی تھیں۔ اس علاقہ میں زیادہ تر بدو رہتے ہیں جنہوں نے اپنا روایتی لباس پہن رکھا تھا۔ دور دور کوئی نہ کوئی درخت بھی نظر آ جاتا۔ یہ کیکر کی طرح کا کوئی

درخت تھا۔ جس کا نام مجھے معلوم نہیں ۔ لیکن بکاری نے بتایا کہ اس درخت کا نام ''شک'' ہے۔ جنہیں بھیڑ بکریاں کھا کر گزارہ کرتی ہیں۔

راستے میں اونٹوں کا ایک کاروان دیکھا جن پر سامان لدا ہوا تھا۔ سامان کے ساتھ عورتیں اور بچے بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے اس ریگستان میں جہاں نہ کوئی سائے دار درخت تھا اور نہ پانی۔ کو دیکھ کر سوچنے لگے کہ یہ بدو لوگ کھاتے پیتے کیا ہونگے۔ اس پر بکاری نے بتایا کہ:

''یہ لوگ بڑے خوشحال ہیں۔ ان کے اپنے اونٹ اور بھیڑ بکریاں ہوتی ہیں۔ کھانے کیلئے غلہ ساتھ رکھتے ہیں۔ جب جی چاہتا ہے تو بھیڑ یا بکری ذبح کر کے لذت دہن سے محظوظ ہوتے رہتے ہیں۔ بلکہ زیادہ تر کھاتے ہی گوشت ہیں۔ پانی کا بھی ایک معقول ذخیرہ ساتھ رکھتے ہیں اور پھر کوشش کرتے ہیں کہ جہاں یہ اپنا ڈیرہ ڈالیں وہاں قریب کوئی چشمہ یا برساتی پانی کا انتظام ہو۔ اللہ ہر فرد کا رزاق ہے۔ اور انہیں بھی کھلا رزق عطا کرتا ہے۔ یہ لوگ جفاکش اور محنتی ہیں۔ ان کے بچے کھلی فضاؤں میں قدرت کے قریب رہ کر جوان ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بدو خاندان فطرت کے قریب رہتے ہیں۔ ان کی زندگی حقیقت کی عکاسی کرتی ہے جس میں بناوٹ نام کی کوئی چیز شامل نہیں ہوتی۔''

ہم پہاڑوں کے درمیان قدرت کے مناظر دیکھتے کوہ طور کی طرف سفر کر رہے تھے۔ سب کی دلی خواہش تھی کہ جتنا جلدی ہو سکے وہاں پہنچیں۔ شرم الشیخ سے کوہ طور کا فاصلہ دو سو کلومیٹر ہے۔ اور پہاڑوں کے درمیان اگرچہ سڑک انتہائی نفیس تھی لیکن حد رفتار کو آپ بڑھا نہیں سکتے چونکہ سڑک سیدھی نہیں تھی۔ اگر تیز رفتاری میں گاڑی کسی موڑ سے نیچے اُتر جاتی تو کوہ طور پر پہنچنے سے قبل اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچنے کے زیادہ امکان تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہم آرام سے سفر کر رہے تھے۔ اس طرح سفر بھی محفوظ طے ہو رہا تھا اور ہم اردگرد کے ماحول سے پوری طرح لطف اندوز بھی ہو رہے تھے۔ لیکن کوہ طور کی کشش نے ہمیں کسی مقام پر رکنے نہیں دیا۔ ایسے میں

ہم سفر کرتے اور مرزا غالب کو یاد کرتے رہے:

کھنچے خود بخود جانب طور موسیٰ
کشش تیری اے شوق دیدار کیا تھی

سرخی مائل پہاڑوں کے بیچ میں سے سفر کرتے ہوئے 78 کلومیٹر کے بعد دھب پہنچے۔ جہاں سے ہم نے نویبا Nuweiba کا رخ کیا۔ سیدھی آ گئے جانے والی سڑک شہر میں جاتی تھی لیکن ہمیں شہر کی بجائے پہاڑوں کا رخ کرنا تھا۔

نویبا کی طرف سفر کرتے ہوئے پہاڑوں کا وہی غلبہ اور سلسلہ ہمارے ساتھ رہا۔ یوں ہی سفر کرتے ہوئے ہم نویبا کے قریب پہنچے۔ تو یہاں سے تین چار سڑکیں مختلف سمتوں کی طرف جاتی تھیں۔ چوک میں قائم چیکنگ آفس میں بیٹھے سرکاری احکام نے ہمارے پاسپورٹ اور گاڑی کے کاغذات دیکھنے کے بعد جانے کی اجازت دی۔ چند گز سفر کرنے کے بعد یعقوب آزاد نے فرمائش کی کہ گاڑی کھڑی کی جائے تا کہ قریب کے پہاڑوں پر بڑے بڑے حروف میں جو کلمہ طیبہ لکھا ہوا ہے اُس کی تصویریں بنائی جا سکیں۔ ھمام نے گاڑی کھڑی کی تو ہم نے تصویریں لینی شروع کر دیں۔ پہلے کسی اہلکار نے منع کیا پھر افسر مجاز نے تصویروں کی اجازت دے دی۔ تصویریں بنانے کے بعد ہم نے دوبارہ سرخی مائل بھورے پہاڑوں کے درمیان سفر جاری رکھا۔ اب کسی نہ کسی جگہ کھلے میدانوں کے درمیان میدان بھی آ جاتے۔ ایسے ہی ایک میدان میں سیدھی سڑک صحرا میں سے گزرتی ہوئی ہمیں بہت بھائی۔ جسے جی بھر کر دیکھنے کیلئے گاڑی کھڑی کی اور اس کے یادگاری فوٹو اُتارے۔

اب تک ہم کوئی ڈیڑھ سو کلومیٹر سفر طے کر چکے تھے لیکن کوہ طور کا نام ونشان نہیں تھا۔ مسلسل سوا تین گھنٹے سفر کرنے کے بعد سینٹ کیتھرائین کے سائین بورڈ دیکھے۔ تو ہم نے منیر حسین سے رابطہ کیا کہ سینا کا نقشہ کھول کر دیکھیں ہم صحیح سمت جا رہے ہیں یا منکرین حق کی طرح اصل راستے سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ منیر حسین نے غور سے نقشہ پڑھ کر ہمیں بتایا کہ ہم صحیح سمت جا رہے ہیں۔ گھبرایئے نہیں اس علاقہ کو حضرت موسیٰ کی بجائے سینٹ کیتھرائین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس پر یعقوب آزاد بولے: ”اس کا مطلب ہے ان لوگوں نے ایک سینٹ (سادھو) کو پیغمبروں پر فوقیت دے رکھی ہے۔“

بات تو آزاد صاحب کی سچ تھی۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ ''جس کی لاٹھی اُسی کی بھینس'' اس وقت دنیا کی حکمرانی کی لاٹھی جس شخص کے ہاتھ میں ہے وہ شیر کو گیدڑ اور گیدڑ کو شیر بنا سکتا ہے۔ مسلمان جو کسی زمانے میں شیر تھے آج گیدڑ بنے اپنے ثقافتی ورثہ سے دستبردار ہو رہے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پیغمبروں کی سرزمین کا وہ علاقہ جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے۔ جہاں حضرت صالح علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام آئے وہ آج کیتھرائین نام کی ایک سینٹ کے نام سے مشہور ہے۔ سینٹ کیتھرائین اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا موازنہ کرنا ناممکن ہے چونکہ ان کے مقام کا اتنا ہی فرق ہے جتنا زمین اور آسمان کے درمیان۔

ہم سینٹ کیتھرائین کی حدود میں داخل ہونے کیلئے ایک پہاڑی سے نیچے کی طرف اُترے اور نیچے قدرے میدانی جگہ پر چیک پوسٹ پر ہماری دوبارہ پڑتال ہوئی۔ پاسپورٹ دیکھے گئے۔ پولیس، ملٹری اور خفیہ اداروں کے اہلکاروں نے ہماری گاڑی کو گھیر لیا۔ مکمل تلاشی اور پاسپورٹ دیکھنے کے بعد ہمیں وادی الشیخ میں داخل ہونے کی اجازت ملی۔ ابھی چند فرلانگ ہی چلے تھے کہ ہمیں دوبارہ کھڑا کر کے اس علاقہ میں داخل ہونے کیلئے ٹکٹ خریدنے کا حکم دیا گیا۔ ھمام نے ٹکٹ بابو سے قیمت پوچھی تو معلوم ہوا ایک ٹکٹ ستر مصری پونڈ کا ہے اور یہی ٹکٹ عرب باشندوں کے لئے تین پونڈ کا تھا۔ ھمام نے ٹکٹ بابو کو ہمارے بارے میں بتایا کہ یہ میرے رشتہ دار ہیں۔ ٹکٹ بابو نے ہمیں مصری تسلیم کرتے ہوئے ستر پونڈ والا ٹکٹ تین پونڈ میں دیا۔ اگر ھمام سچ بتاتا کہ یہ ہمارے پاکستانی مسلمان بھائی ہیں تو ایسے میں ہم اس رعایت سے محروم رہتے۔ اگر چہ اسلام میں بھائی چارہ اور ہمہ گیری کا بڑا درس دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا اطلاق ہم برصغیر کے مسلمانوں پر ہوتا ہے۔ عرب ملکوں میں اسلام اور مسلمان ہونے سے زیادہ عرب اور عجم کا فرق زیادہ نمایاں ہے۔ عرب اگر غیر مذہب بھی ہو تب بھی اُسے عجمی پر فوقیت دی جاتی ہے۔ لیکن ہم برصغیر کے مسلمان تو ہمیشہ ہی علامہ اقبال کے شعر پڑھ کر سر دھنتے اور اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کیلئے جان قربان کرنے کیلئے ہر وقت تیار رہتے ہیں کہ:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر

حضرت صالح نبی اللہ

سینٹ کیتھرائین کے علاقہ میں داخل ہوئے تو وہاں قریب چند دکانیں، دفاتر اور ریڈ کراس کا ادارہ تھا۔ اس جگہ کا نام وادی صالح تھا۔ جہاں سے ایک سڑک وادی فاران، دوسری ہوائی اڈہ کی طرف اور تیسری سیدھی آگے کوہ طور کی طرف چلی جاتی ہے۔ اور چوتھی جدھر سے ہم ابھی آئے تھے۔ وادی صالح سے کھانے پینے کی اشیاء خریدی جاسکتی ہیں۔ واپس قاہرہ جانے کیلئے ہمیں وادی فاران کے راستے جانا ہے۔ لیکن واپسی سے قبل ہمیں کوہ طور جانا ہے۔ جس کیلئے ہم دو دن سے سفر کررہے ہیں۔ چنانچہ کوہ طور کیلئے ہم سیدھا آگے بڑھے تو بائیں طرف ایک چھوٹے سے ٹیلے پر ایک سفید رنگ کی کٹیا دیکھ کر گاڑی کھڑی کی۔ پاس گئے تو ایک بورڈ پر لکھا تھا۔ مقام نبی اللہ حضرت صالح۔ بورڈ پڑھ کر خوش ہوئے کہ ہم اللہ کے ایک محبوب پیغمبر کے مقام پر حاضری دیں گئے۔ ہم سب مقام نبی اللہ صالح علیہ السلام کے ہاں حاضر ہوئے۔ یہ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی نما کمرہ تھا۔ جس کی دیواریں اندر اور فرش بالکل کچا تھا۔ کمرے کے درمیان ایک قبر کے اوپر چادریں تھیں۔ یہ مقام اُس نبی اللہ کا تھا جن کا ذکر قرآن پاک میں متعدد بار آیا ہے۔ یہ اللہ کے بڑے برگزیدہ پیغمبر تھے۔ حضرت صالح کی اونٹنی کا ذکر بھی قرآن پاک سورہ ھود آیات 63 میں موجود ہے۔

اے میری قوم کے لوگو، دیکھو یہ اللہ کی اُونٹنی تمہارے لیے ایک نشانی ہے۔ اسے خدا کی زمین میں چرنے کے لیے چھوڑ دو۔ اس سے ذرا تعرض نہ کرنا ورنہ کچھ زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ تم پر خدا کا عذاب آجائے گا۔''

مگر انہوں نے اونٹنی کو مار ڈالا۔ اس پر صالح نے اُن کو خبردار کر دیا کہ ''بس اب تین دن اپنے گھروں میں اور رہ بس لو۔ یہ ایسی معیاد ہے جو جھوٹی نہ ثابت ہوگی۔''

آخر کار جب ہمارے فیصلے کا وقت آ گیا تو ہم نے اپنی رحمت سے صالح کو اور اُن لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان

لائے تھے بچالیا اور اُس دن کی رسوائی سے ان کو محفوظ رکھا۔

قوم ثمود جس کی طرف حضرت صالح علیہ السلام پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تھے نے جب احکام خداوندی کی خلاف ورزی کی اور اُن پر عذاب نازل ہوا جس کا ذکر اوپر کی آیات میں بیان ہوا ہے۔ عذاب سے جب حضرت صالح علیہ السلام بچ گئے تو وہ مدین کے علاقہ سے نکل کر جزیزہ نمائے سینا کی طرف ہجرت کر کے چلے گئے تھے۔ یوں کوہ طور کے علاقہ میں حضرت صالح علیہ السلام کا جو مزار ہے اس میں کافی حد تک صداقت ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام کے مزار کی خستہ حالی دیکھ کر افسوس ہوا۔ دیواروں پر سیاح حضرات نے کوئلہ سے اپنے نام اور پتے لکھے ہوئے تھے۔ قبر کے سرہانے کی طرف دیوار میں ایک چھوٹا سا طاق تھا۔ جس میں ایک دیا تھا۔ جسے غالباً کوئی اللہ کا بندہ کبھی کبھار روشن کر کے اپنا فرض پورا کرتا ہوگا۔ جب ہم ایک پیغمبر کے مزار کی یہ حالت دیکھ رہے تھے تب مجھے وطن عزیز میں ہزاروں ایسے مزار یاد آئے جہاں ہر روز ہزاروں بلکہ لاکھوں روپے کے نذرانے پیش کیے جاتے ہیں۔ اُن مزاروں پر قیمتی سے قیمتی قالین اور قبر پر چادریں بچھی ہوئی ہوتی ہیں۔ کچھ مزار سنگ مرمر سے مرصع ہیں۔ اور ملحق مساجد بھی خوبصورت ہیں۔ لیکن حضرت صالح کا مقام تو ایک ویرانے میں ایک چھوٹے سے ٹیلے پر تھا۔ جہاں نہ بندہ نہ بندے کی ذات دیکھی۔ مقام صالح کے ملحق ایک پرانا قبرستان بھی ہے۔ جس میں چند انتہائی پرانی قبریں ہیں جن کی حالت بھی کافی خستہ تھی۔ جب ہم گھوم پھر کر قبرستان دیکھ رہے تھے تب یعقوب آزاد اور بکاری وہاں نفل ادا کر رہے تھے۔

وادی مقدس طویٰ

حضرت صالح علیہ السلام کے مقام کو دیکھنے کے بعد دوبارہ کار میں بیٹھے اور کوئی دس میل کا فاصلہ طے کر کے میدان الراحہ پہنچے۔ اسی مقام پر بنی اسرائیل نے ہجرت کر کے پڑاؤ ڈالا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر سیکورٹی احکام نے ہمیں روک کر بتایا کہ اس سے آگے گاڑی کا جانا ممنوع ہے۔ ہم نے گاڑی کھڑی کی۔ سیکورٹی احکام نے ہمارے پاسپورٹ چیک کیے اور پیدل

جانے کی اجازت دیتے ہوئے خوشخبری سنائی کہ اب آپ سینٹ کیتھرائین کے بالکل قریب ہیں۔ ہم نے گیٹ پار کیا تو سامنے پہاڑوں کے دامن میں سینٹ کیتھرائین کی عمارت نظر آئی۔ اب دن کے پونے بارہ بجے تھے۔ یعنی تقریباً چار گھنٹے میں دو سو کلومیٹر سفر پہاڑوں کے درمیان طے کر کے یہاں پہنچے تھے۔

جہاں میں کھڑا تھا میرے سامنے سینٹ کیتھرائین کی خانقاہ تھی۔ دائیں طرف کچھ فاصلہ پر حضرت ہارون علیہ السلام کا مقام تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں حضرت موسیٰ نے کوہ طور سے واپسی پر حضرت ہارون کا مواخذہ کیا تھا۔ میرے بائیں طرف کوہ طور پہاڑ تھا۔ کوہ طور کے بارے میں بچپن سے پڑھتے اور سنتے آئے تھے۔ پڑھنے اور سننے سے ذہن میں کوہ طور کا جو نقشہ تھا وہ اس سے بالکل مختلف نکلا۔ اب کوہ طور میری نظروں کے سامنے تھا۔ بھورے پہاڑ جن میں پتھر ہی پتھر تھے۔ سبزہ نام کی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہ ایک تنگ گھاٹی تھی۔ جس کے دونوں طرف بلند و بالا پہاڑ تھے۔ اس گھاٹی اور ان پہاڑوں کے درمیان ہی اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ سے ہم کلام ہوئے تھے۔ اسی مقام پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو نبوت عطا کی تھی۔ یہی جگہ وادی مقدس طویٰ کہلاتی ہے۔

سینٹ کیتھرائین کی عمارت وادی طویٰ کے اُسی مقام پر تعمیر ہوئی جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک چنگاری دیکھی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک مصری باشندے کو قتل کرنے کے بعد مصر سے بھاگ کر مدین چلے گئے تھے۔ جہاں حضرت شعیب علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ جن کے ساتھ حضرت موسیٰ کا ایک معاہدہ طے ہوا تھا کہ اگر وہ اُن کے ہاں قیام کر کے حضرت شعیب کی دس سال بھیڑ بکریاں چرائیں تو پھر حضرت موسیٰ کی حضرت شعیب کی بیٹی سے شادی ہو سکتی ہے۔ حضرت موسیٰ کو پناہ کی ضرورت تھی۔ اور اللہ تعالیٰ کو بھی یہی منظور تھا کہ حضرت موسیٰ کی تربیت ایک پیغمبر کی زیرِ نگرانی کی جائے۔

دس سال نوکری کے بعد جب حضرت موسیٰ کی شادی حضرت صفورہ سے ہوئی تو اپنی بیوی کو لیکر واپس مصر جانے کا ارادہ کیا تا کہ وہاں اپنے عزیز و اقارب اور اپنی قوم کے حالات معلوم کر سکیں۔ سفر کے دوران حضرت موسیٰ راستہ بھٹک کر کوہ طور پہاڑ کی طرف آ نکلے۔ جب اس مقام پر پہنچے جہاں میں کھڑا تھا تو تب رات ہو چکی تھی۔ اندھیری رات، سردی اور بیابان۔ ایسے

میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رات بسر کرنے کیلئے کسی پناہ کی تلاش تھی کہ پہاڑ کے دامن میں انہیں ایک چنگاری نظر آئی۔ چنگاری دیکھ کر کچھ حوصلہ پیدا ہوا۔ اور بیوی سے کہا کہ تم یہاں میرا انتظار کرو میں وہاں سے تمہارے لئے آگ لے آؤں۔ حضرت موسیٰ چلتے ہوئے جب اس مقام پر پہنچے تو آواز آئی موسیٰ ٹھہر اور جوتے اُتار دے۔ چونکہ تو وادی طویٰ میں پہنچ چکا ہے۔ اس غیب کی آواز پر حضرت موسیٰ گھبرا گئے۔ اس واقعہ کا ذکر قرآن پاک سورہ طٰہ آیات 9 میں یوں آتا ہے۔

اور تمہیں کچھ موسیٰ کی خبر بھی پہنچی ہے؟ جب کہ اس نے ایک آگ دیکھی اور اپنے گھر والوں سے کہا کہ "ذرا ٹھہرو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے۔ شاید کہ تمہارے لیے ایک آدھ انگارا لے آؤں، یا اس آگ پر مجھے (راستے کے متعلق) کوئی رہنمائی مل جائے۔"

وہاں پہنچا تو پکارا گیا "اے موسیٰ! میں ہی تیرا رب ہوں، جوتیاں اُتار دے۔ تو وادی مقدس طویٰ میں ہے۔ اور میں نے تجھ کو چن لیا ہے، سن جو کچھ وحی کیا جاتا ہے، میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ پس تو میری بندگی کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔"

وادی مقدس میں پہنچ کر ہم بہت خوش تھے۔ یہ وہی مقام تھا جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے گفتگو کی تھی۔ قرآن پاک سورہ النساء میں آتا ہے:

وَ کَلَّمَ اللّٰہُ مُوسیٰ تَکْلِیماً

ہم نے موسیٰ سے اس طرح گفتگو کی جس طرح گفتگو کی جاتی ہے۔

ہم اپنے آپ کو خوش قسمت قرار دے رہے تھے۔ چونکہ ایسے مقام دیکھنے کیلئے اچھے نصیبوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں قریب ہی حضرت موسیٰ نے آگ کی چنگاری دیکھی تھی۔ جو برننگ بش Burning Bush یعنی روشن جھاڑی کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت موسیٰ کو اس مقام پر چنگاری نظر آنے اور اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کے ڈیڑھ ہزار سال بعد کیتھرائین نام کی

ایک سینٹ (سادھو) عورت جسے اُس زمانے کے بازطینی (بازنطینی) عہد کے بادشاہوں نے مذہبی حوالے سے تنگ کیا تو وہ اللہ والی خوف سے بھاگ کر اس مقام پر آ کر روپوش ہوگئی تھی۔

سینٹ کیتھرائین نے اپنی بقیہ زندگی اسی مقام پر کوہ طور کے پہلو میں گزاری۔ اسے دیکھتے دیکھتے مذہب کے نام پر ستائے جانے والے دوسرے لوگ بھی بھاگ کر اسی مقام پر آ کر پہاڑوں میں چھپ کر یاد الٰہی میں اپنا وقت گزارنے لگے۔ 527ء میں قسطنطین کے زمانے میں جیسٹنیانے چرچ کی عمارت اُسی جگہ تعمیر کی جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چنگاری نظر آئی تھی۔ چرچ پر یونانی آرتھوڈوکس کے پیروکاروں نے قبضہ کرلیا۔ جو آج تک اُن کے قبضہ میں ہے۔ اس عمارت کے اردگرد ایک اونچی دیوار ہے۔ جس میں ایک چرچ، ایک مسجد اور ایک یہودیوں کا دیر ہے۔ عیسائی علماء کے علاوہ بیس درویش یعنی مذہبی خدمتگار اس عمارت کا انتظام چلاتے ہیں۔ عمارت کے ساتھ ایک خوبصورت باغ اور اس مقام کی زیارت کرنے والوں کیلئے دوسو بستروں کی رہائش گاہ بھی ہے۔ کھانا تیار کرنے کیلئے باورچی خانہ ہے۔ یہ مقام پہاڑوں کے درمیان آبادی سے کافی دور ہونے کی بناء پر زائرین کو کھانے پینے کی اشیاء اپنے ساتھ لانی پڑتی ہیں۔ جسے پکانے میں چرچ کے ورکر مدد کرتے ہیں۔

اب ہم جس جگہ کھڑے تھے۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں جب حضرت موسیٰ پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا موسیٰ اب تو مقدس مقام پر پہنچ گیا۔ جوتے اُتار دے۔ حضرت موسیٰ جوتے اُتار کر جب روشنی کی طرف بڑھے تو اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی ہوئے۔ جس کا ذکر قرآن پاک کی سورہ طٰہٰ آیات 17 میں یوں آیا ہے۔

اور اے موسیٰ، یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟
موسیٰ نے جواب دیا ''یہ میری لاٹھی ہے، اس پر ٹیک لگا کر
چلتا ہوں، اس سے اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں
اور بھی بہت سے کام ہیں جو اس سے لیتا ہوں''
فرمایا ''پھینک دے اس کو موسیٰ''
اس نے پھینک دیا اور یکایک وہ ایک سانپ تھی جو دوڑ رہا
تھا۔

فرمایا'' پکڑ لے اس کو اور ڈرو نہیں، ہم اسے پھر ویسا ہی
کر دیں گے جیسی یہ تھی۔ اور ذرا اپنا ہاتھ اپنی بغل میں دبا،
چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے۔ یہ دوسری نشانی ہے۔
اس لیے کہ ہم تجھے اپنی بڑی نشانیاں دکھانے والے ہیں۔
اب تو فرعون کے پاس جا وہ سرکش ہو گیا ہے۔''

حضرت موسیٰ اور اللہ تعالیٰ کی پہلی گفتگو کا بغور جائزہ لینے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ بات چیت بے تکلفانہ انداز میں کچھ یوں ہوئی جیسے دو دوست آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ ملاقات کے وقت حضرت موسیٰ کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ چنانچہ گفتگو اُسی لاٹھی سے شروع کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ پوچھتے ہیں:

''اے موسیٰ، یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟

موسیٰ نے جواب دیا

''یہ میری لاٹھی ہے، اس پر ٹیک لگا کر چلتا ہوں، اس سے اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں اور بھی بہت سے کام ہیں جو اس سے لیتا ہوں''

ابتدائی بات چیت کے بعد جوں ہی حضرت موسیٰ کی گھبراہٹ ختم ہوئی تب اللہ تعالیٰ نے انہیں فرعون کے مقابلے کیلئے تیار کرنے کیلئے لاٹھی کا سانپ کی شکل اختیار کرنے کا معجزہ عطا کیا۔ دورِ جدید کے ماہر تعلیم بھی پڑھانے اور سکھانے کے یہی طریقے بتاتے ہیں کہ پہلے طالب علم کی گھبراہٹ دور کرو پھر پڑھاؤ۔ ممکن ہے ان مغربی ماہرین نے یہ باتیں قرآن حکیم سے سیکھی ہوں لیکن افسوس یہ ہے کہ بہت کم لوگ اس بات کا اقرار کرتے ہیں۔

سینٹ کیتھرائین کے سامنے ایک اونچی پہاڑی ہے۔ ہم اُس پر چڑھ کر دور دور تک دیکھنے لگے۔ منیر حسین نے ہم سب کی یادگاری تصویریں بنائیں۔ جس چھوٹی پہاڑی پر ہم کھڑے تھے وہاں سے دائیں طرف چند فرلانگ کے فاصلہ پر ایک پہاڑی ٹیلے پر حضرت ہارون علیہ السلام کا مزار اور اُس کے ساتھ پہاڑوں کے درمیان ہموار میدان جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو چھوڑ کر کوہ طور پر تشریف لے گئے تھے۔ ہمارے بائیں ہاتھ کوہ طور کا پہاڑ تھا۔ ساتھیوں نے فیصلہ کیا کہ پہلے کوہ طور اور پھر حضرت ہارون علیہ السلام کے مزار پر

حاضری دیں گئے۔

کوہ طور

چھوٹی پہاڑی سے اُتر کر ہم سینٹ کیتھرائین واپس آئے۔ تو یعقوب آزاد نے وہاں پر موجود پولیس والوں سے بات کی جنہوں نے کمال مہربانی سے ایک پولیس آفیسر ہماری رہنمائی کیلیئے ساتھ لگا دیا تا کہ کوہ طور کی سیر کے دوران ہم راستہ نہ بھول جائیں۔ ان پہاڑوں میں حضرت موسیٰ بھی راستہ بھول کر جب چنگاری دیکھ کر آگ لینے آئے تو پیغمبری مل گئی۔ اس واقعہ سے ہی ہمارے ہاں وہ محاورہ مشہور ہوا کہ ''آگ لینے گیا اور پیغمبری مل گئی''۔

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے

سینٹ کیتھرائین سے آگئے پہاڑی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جہاں پیدل یا پھر اونٹوں پر سفر کیا جاتا ہے۔ ہم نے کبھی اونٹ پر سواری نہیں کی تھی۔ اور پھر سارے ساتھی اُن راہوں پر پیدل چلنا چاہتے تھے جن پر موسیٰ کلیم اللہ چل کر اوپر گئے تھے۔ اسی جذبہ کے تحت ہم نے سفر شروع کیا۔ پیدل چلنے والا راستہ کشادہ تھا جس پر اونٹ آسانی سے چل سکتے تھے۔ اردگرد پتھر ہی پتھر تھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی زبردست دھماکہ یا کسی معجزہ کے رونما ہونے پر یہ پتھر پاش پاش ہوئے۔ ہم یہ سوچ رہے تھے تو ساتھ چلنے والے پولیس آفیسر نے بتایا کہ یہ سامنے جس پہاڑ کے پتھر ریزہ ریزہ ہو کر نیچے آئے وہی پہاڑ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے اصرار پر اپنی تجلی دکھائی تھی۔ حضرت موسیٰ کے مسلسل اصرار پر اللہ تعالیٰ نے اپنی تجلی اس پہاڑ پر ڈالی تو وہ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت موسیٰ بے ہوش ہو گئے تھے۔ قرآن پاک کی سورہ الاعراف آیات 143 میں یہ واقعہ یوں بیان ہوا ہے:

> جب وہ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر پہنچا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا تو اس نے التجا کی کہ: ''اے رب، مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں''۔ فرمایا تو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں ذرا سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھ

،اگر وہ اپنی جگہ قائم رہ جائے تو البتہ تو مجھے دیکھ سکے گا''
چنانچہ اس کے رب نے جب پہاڑ پر تجلی کی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑا۔ جب ہوش آیا تو بولا ''پاک ہے تیری ذات میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلا ایمان لانے والا میں ہوں۔'' فرمایا'' اے موسیٰ میں نے تمام لوگوں پر ترجیح دے کر تجھے منتخب کیا کہ میری پیغمبری کرے اور مجھ سے ہم کلام ہو۔ پس جو کچھ میں تجھے دوں اسے لے اور شکر بجالا۔''

اللہ تعالیٰ کی تجلی سے ریزہ ریزہ ہونے والے پہاڑ کی طرف ہم چلے جا رہے تھے۔ میں یعقوب آزاد اور منیر حسین آگے آگے اور کچھ فاصلے پر پیچھے بکاری، ہمام اور پولیس آفیسر آ رہے تھے۔ ہم سفر کرتے اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ میں نے ساتھیوں کو بتایا کہ: ''قرآن پاک کے مطالعہ اور اس مقام پر آنے کے بعد ہی انسان اس بات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ اللہ کے جلیل القدر پیغمبر تھے۔ جن سے اللہ تعالیٰ یوں ہم کلام ہوتے رہے جس طرح دو دوست باتیں کرتے ہیں۔ اسی مناسبت سے حضرت موسیٰ کلیم اللہ کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کی تربیت ان پہاڑوں میں ہوئی۔ ان پہاڑوں میں ہی حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ سے جلوہ دکھانے کی فرمائش اُسی طرح کی تھی جس طرح بچے ماں یا باپ سے ضد کرتے ہوئے کسی چیز کی فرمائش کرتے ہیں۔ اب ہمارے سامنے وہی کوہ طور پہاڑ تھا جس کا نام لے کر اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ہے:

وَالتِین وِ الزَیتُونِ وَ طُورِ سِینِینَ وھذَا البَلَدِ الاَمِینِ O

قسم ہے انجیر اور زیتون کی اور طور سینا اور اس پُرامن شہر (مکہ) کی۔

ہم سفر کرتے پیدل چلتے پسینے سے شرابور تھے۔ لیکن ہمارے حوصلے بلند تھے۔ دل میں ان تمام مقامات کو جی بھر کر دیکھنے کی تمنا تھی۔ اسی جذبہ کے تحت سفر کرتے ہوئے ہم اُس مقام پر پہنچے جہاں سے ہموار راستے ختم ہو جاتے ہیں۔ اب ہمیں ایک مشکل ترین ایسے راستے پر چلنا تھا جسے آپ راستہ نہیں کہہ سکتے بلکہ پاؤں کے نشان دیکھ کر ایک سیدھی پہاڑی کے اوپر چڑھنا تھا۔

حفاظتی اقدام کے طور پر ہم اپنے ساتھ پانی لائے ہوئے تھے۔ جو پہاڑی چڑھتے ہوئے کام آیا۔ جوں جوں ہم پہاڑی کی چوٹی کی طرف بڑھتے گئے تو پہاڑ کے دامن کی طرف نظر ڈالتے تو خوف آنے لگتا۔ لیکن ہم ان سب باتوں اور خطرات کو مول لیتے اوپر چڑھتے گئے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے پہاڑ کی چوٹی پر سب سے پہلے میں نے قدم رکھا۔ یہ دیکھ کر سب ساتھی بہت خوش ہوئے۔ منیر حسین کہنے لگے: نظامی صاحب ہمیں سب سے زیادہ آپ کی فکر تھی۔ گذشتہ ہفتے آپ جب گیزہ کے مقام پر اہرام یعنی فراعنہ کی قبر کے اندر کوئی چار سوفٹ چلے گئے تھے جس کی بناء پر آپ کیلئے چلنا مشکل ہو گیا تھا۔ آپ ہموار جگہ تو آسانی کے ساتھ چل سکتے تھے لیکن چند سیڑھیاں چڑھنی یا اُترنی ہوتیں تو آپ کو سخت تکلیف اٹھانی پڑتی تھی۔''

مجھے منیر حسین اور دوسرے ساتھیوں کی رائے سے اتفاق تھا۔ مجھے خود فکر تھی کہ ایسی حالت میں میں کوہ طور پر کیسے پہنچوں گا۔ ایک ایسی جگہ جہاں جانے کیلئے مجھے بچپن سے اشتیاق تھا۔ یہ سوچتے ہوئے ایک رات میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ:

''اے اللہ تعالیٰ میں حضرت موسیٰ کا طرفدار ہوں۔ فرعون کا نہیں۔ زندگی میں حضرت موسیٰ اور فرعون کا مقابلہ ہوتا رہا۔ آخری بازی حضرت موسیٰ نے جیتی تھی۔ میں فراعنہ کے مقبرے میں عبرت حاصل کرنے گیا تھا۔ اُس کی پیروی کرنے نہیں۔ اگر میں نے غلطی کی تو مجھے معاف کر اور مجھے وہ طاقت دے جس کے سہارے میں جبل موسیٰ پر پہنچ سکوں۔''

اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول فرمائی اور میری کھوئی ہوئی طاقت کچھ اس طرح بحال ہوئی کہ میں ہراول دستے کے طور پر کوہ طور پر پہنچا۔ آخر میں بکاری پہنچا۔ بکاری جسیم ہونے کے ساتھ ساتھ اب بوڑھا بھی ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن جذبہ دل کے تحت ہمت کر کے وہ جب پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا تو سب نے تالیاں بجا کر اسے خوش آمدید کہا۔

پہاڑ کی چوٹی پر ایک گرجا ہے۔ جو بند تھا۔ یہ گرجا ایک سفید کمرے پر مشتمل ہے۔ یہاں کھڑے ہو کر اگر نیچے دیکھیں تو دامن میں سینٹ کیتھرائین کی عمارت نظر آتی ہے۔ اس سے تھوڑا آگے دور حضرت ہارون علیہ السلام کا مزار اور آگے پہاڑوں کے درمیان ایک کھلا میدان۔

غالباً اسی مقام پر حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو چھوڑ کر کوہ طور پر آئے تھے۔ جہاں چالیس دن عبادت کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنا مقدس کلام جو پتھر کی سلوں پر لکھا ہوا تھا عطا کیا تھا۔

اس پہاڑ کی پشت کی طرف بھی ایک گھاٹی ہے۔ دور دور تک اونچے اونچے پہاڑ ہیں۔ ہم ایک گھنٹہ تک اس پہاڑی کے اوپر رہے۔ یعقوب آزاد نے نفل ادا کیے۔ اگرچہ گرمی اور سورج کی تپش تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم پر کمال مہربانی فرمائی اور آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں۔ جس سے موسم معتدل ہو گیا تھا۔

جب یعقوب آزاد نفل اور منیر حسین یہاں کے قدرتی مناظر کو کیمرے کی آنکھ میں بند کر رہے تھے۔ اُس وقت میں ایک اونچی چٹان پر بیٹھ کر سوچ رہا تھا کہ اس مقام پر حضرت موسیٰ تشریف لاتے رہے۔ یہاں عبادت کی۔ میں نے بھی اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کی کوشش کی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اللہ تعالیٰ مجھے کہہ رہے ہیں کہ میں تو ہر انسان کی ہر جگہ سنتا ہوں۔ مجھ سے ہم کلام ہونے کیلئے کوہ طور پر آنے کی ضرورت نہیں۔ اور پھر ہر کوئی موسیٰ بھی تو نہیں۔

جس راستے سے ہم اوپر گئے تھے اُسی راستے سے نیچے اُترے۔ پہاڑ سے اُترنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ لیکن ہم آہستہ آہستہ بڑی احتیاط کے ساتھ قدم جما جما کر چلتے ہوئے نیچے اُترے۔ پولیس آفیسر نے بکاری کو سہارے دے کر نیچے اُتارا۔ جب ہم نصف پہاڑی اُتر کر ہموار اُس راستے تک پہنچے جن پر اونٹ چل سکتے ہیں تو یہاں راستے کے ایک موڑ پر ایک کھوکھا نما دکان تھی۔ دکان کی حالت خستہ تھی۔ جس میں ٹھنڈے مشروبات، سویٹس اور چائے کا انتظام تھا۔ یہاں چائے پی تو لطف آ گیا۔

چائے پینے کے بعد تر و تازہ ہو کر دوبارہ سفر جاری رکھتے ہوئے سینٹ کیتھرائین پہنچے۔ عمارت کے پہلو میں ایک خوبصورت باغ ہے۔ جس میں انجیر، کیلے، خوبانی، انگور اور سیب کے درخت ایک محدود جگہ میں بڑی محنت سے پہاڑ کاٹنے کے بعد دور سے مٹی لا کر چٹیل پہاڑ پر باغ اُگایا گیا ہے۔ ساتھ وہ عمارت ہے جہاں سیاح قیام کرتے ہیں۔ اس بیابان میں بیت الخلا کا بہترین انتظام تھا۔ جہاں وضو کر کے ہم سب تر و تازہ ہوئے۔

احکام عشرہ

جب حضرت موسیٰ کوہ طور پر گئے تو چالیس شب و روز کی عبادت کے بعد اللہ تعالیٰ

نے بنی اسرائیل کیلئے اپنے دس احکامات پتھر کی سلوں پر لکھ کر بھیجے تھے۔ جو ''ٹن کمانڈ منٹ'' Ten commnadments یعنی احکام عشرہ کے نام سے مشہور ہیں۔ اسی مناسبت سے ہالی وڈ نے پچاس کی دہائی میں ''ٹن کمانڈ منٹ'' کے نام سے ایک فلم بھی بنائی تھی جو آج بھی لوگ دلچسپی سے دیکھتے ہیں۔ یہ دس احکام کیا تھے؟۔ اس بارے میں یہودیوں کی کتاب خروج 20:1-17 میں لکھا ہے کہ:

۱۔ میں آپ کا مالک خدا عظیم ہوں۔ مجھ سے پہلے آپ کا کوئی خدا نہیں تھا۔

۲۔ آپ اپنے لیے ایسی کوئی خیالی جنت نہیں بنائیں گے جو اوپر آسمان کی جنت سے ملتی جلتی ہو۔ یا زمین پر موجود کوئی چیز یا پھر زمین میں نیچے پانی۔ آپ انہیں اُڑائیں گے نہیں یا انہیں کسی کو پیش نہیں کریں گے۔ میرے لئے جو میں آپ کا مالک خدا عظیم ہوں، میں حسد کرنے والا رب ہوں۔ جو بچے مجھ سے نفرت کریں گے اُن کی تین و چار نسلوں کا گناہ اُن کے والد پر ہوگا۔ اور جو ہزاروں مجھ سے محبت کرتے ہیں اُن کیلئے ثابت قدم رہنا اور میرے احکام کو بجالانا۔

۳۔ آپ بغیر کسی مقصد کے خدا عظیم کا نام استعمال نہیں کر سکتے۔ خدا عظیم اُسے بے گناہ نہیں رہنے دے گا جو اسے صدق دل سے مانے گا۔

۴۔ یاد رکھیے سبت کے دن کو مقدس رہنے دیں۔ آپ چھ دن محنت مزدوری کریں لیکن ساتواں دن آپ کے خدا عظیم کیلئے سبت کا دن ہے۔ اس دن آپ کوئی کام نہیں کریں گے۔ آپ یا آپ کا بیٹا، یا آپ کی بیٹی یا آپ کا نوکر یا نوکرانی یا آپ کے مال مویشی، یا آپ کا مہمان۔ اللہ تعالیٰ نے چھ دنوں میں جنت، زمین، سمندر اور جو کچھ اس کائنات میں ہے بنائے۔ اور ساتویں دن آرام فرمایا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ سبت کو متبرک دن قرار دیتے ہوئے اسے مقدس تسلیم کرتے ہیں۔

۵۔ آپ کے ماں باپ کیلئے یہ اعزاز ہے کہ ممکن ہے اس دنیا میں خدا عظیم نے جو دن تمہیں عطا کیے ہیں وہ طویل ہوں۔

۶۔ آپ قتل نہیں کریں گے۔

۷۔ آپ زنا کا ارتکاب نہیں کریں گے۔

۸۔آپ چوری نہیں کریں گے۔

۹۔اپنے پڑوسی کے خلاف جھوٹی گواہی نہیں دیں گے۔

۱۰۔آپ اپنے پڑوسی کے مکان کی خواہش نہیں کریں گئے۔آپ اپنے پڑوسی کی بیوی کی خواہش نہیں کریں گئے۔یا اُس کے نوکر یا نوکرانی کی۔یا اُس کے بیل یا اُس کے گدھے کی۔یا اپنے پڑوسی کی کسی اور چیز کا لالچ نہیں کریں گئے۔

بنی اسرائیل اپنے آپ کو اللہ کی محبوب قوم سمجھتے تھے۔ چونکہ انہوں نے اُس وقت دین اسلام کی رسی کو پکڑا جب فرعون اپنے عروج پر تھے اور اُن کی اجازت کے بغیر مکھی بھی پر نہیں ہلا سکتی تھی۔لیکن بعد میں یہ قوم اپنا معیار برقرار نہ رکھ سکی تو اللہ تعالیٰ نے بھی انہیں سزا در سزا دی جس کا سلسلہ جاری ہے۔

پیار نفرت میں کیسے بدلا۔ یہ سمجھنے کیلئے اس مثال پر غور کیجئے۔اگر کوئی صاحب اپنے اکلوتے بیٹے سے بہت ہی پیار کرتے ہوں۔اور اُس کا بار بار اظہار بھی کریں کہ میرا بیٹا چاند اور آنکھوں کا نور نظر ہے۔لیکن جوانی میں پہنچ کر اگر وہ باپ کا نافرمان بن جائے اور دنیا کی ہر بُرائی میں مبتلا ہو جائے تو یقیناً باپ اپنے پیار میں کمی لاتے ہوئے پہلے اُس کی سرشت کرے گا اور اگر وہ نہ سنبھلا تو پھر اُسے عاق بھی کر سکتا ہے۔ایسا ہی معاملہ اللہ تعالیٰ اور بنی اسرائیل کے درمیان پیش آیا۔جب اللہ تعالیٰ نے انہیں فراعنہ کے عذاب سے نجات دلوائی تو سمندر کے دوسرے کنارے پہنچتے ہی انہوں نے اس قدر بے اتفاقی کا مظاہرہ شروع کر دیا کہ انہوں نے ایک جگہ پانی پینے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کی دُعا سے بارہ چشمے پھوٹے۔ جہاں سب نے الگ الگ گروہ میں پانی پیا۔ پھر انہیں من و سلویٰ ملا اور بہت عرصہ آسمان پر بادل چھائے رہے تا کہ یہ دھوپ کی شدت سے بچ جائیں لیکن پھر بھی موقع ملتے ہی یہ لوگ اللہ کی نافرمانی کرنے لگے۔اور بعض اللہ کی نعمتوں اور فراعنہ کے عذاب کو بھول کر بت پرستی پر اتر آئے۔

بت پرستی دنیا کا قدیم ترین مذہب ہے۔ بت پرست قوموں نے مختلف ادوار میں مختلف ناموں کے خدا بنا رکھے تھے جن سے حاجات کیلئے دعائیں کرتے اور چڑھاوے چڑھاتے تھے۔قبل از اسلام لات، مناۃ وعُزیٰ نام کے بڑے بت تھے۔جن سے لوگ مرادیں مانگتے اور چڑھاوے چڑھاتے تھے۔اُن لوگوں کا عقیدہ تھا کہ ان کی ناراضگی سے وہ تباہ و برباد

ہو جائیں گئے۔ لیکن جب اسلام آیا اور تمام بت ٹوٹ گرے تو کسی پر کوئی عتاب نازل نہیں ہوا۔

بنی اسرائیل طویل عرصہ مصر میں فراعنہ جیسی بت پرست قوم کے پڑوس میں رہے۔ جس سے کچھ مسلمانوں کے ایمان میں تذلزل آتا رہا۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی بجائے بت پرستی کی طرف مائل ہونے کی کوشش کرتے رہے۔ حتیٰ کہ جب حضرت موسیٰ انہیں مصر سے فراعنہ کے عذاب سے نکال کر صحرائے سینا لے گئے تو راستے میں ایک بت کدہ دیکھ کر موسیٰ سے فرمائش شروع کر دی کہ ہمارے لئے بھی ایک ایسا ہی خدا بنا۔ اور پھر جب حضرت موسیٰ کوہ طور پر گئے تو سامری کے بچھڑے کا واقعہ پیش آیا۔ جو ان کے ایمان کی کمزوری کی ایک واضح دلیل ہے۔

سامری کا بچھڑا

حضرت موسیٰ اپنی قوم بنی اسرائیل کو فرعون کے آہنی شکنجے سے چھڑا کر سینا کے اس علاقہ میں لے آئے تھے۔ سفر کے دوران جب یہ قافلہ کوہ طور کے دامن میں میدان الراحہ پہنچا تو حضرت موسیٰ نے قوم کو اس جگہ چھوڑ کر اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو اُن کی نگرانی پر مامور کر کے خود کوہ طور پر چالیس دن کیلئے چلے گئے تھے۔ جب حضرت موسیٰ کوہ طور پر گئے تو پیچھے سامری نامی ایک شخص نے سونے کا ایک بچھڑا بنایا۔ اور اُس میں کچھ اس قسم کی حکمت ڈال دی کہ آوازیں آنے لگیں۔ یہ دیکھ کر بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو بھول کر اُس بچھڑے کی پرستش شروع کر دی تھی۔ اس پر حضرت ہارون علیہ السلام نے انہیں منع کیا۔ لیکن کسی نے بھی اُن کی بات نہیں مانی۔ جب حضرت موسیٰ کلام الٰہی جو پتھر کی سیلوں پر لکھا ہوا تھا اٹھا کر کوہ طور سے اُترے تو یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ قوم تو دوبارہ بت پرستی میں مبتلا ہو گئی ہے۔

قوم کو بت پرستی میں مبتلا دیکھ کر حضرت موسیٰ سخت غصے میں آ گئے۔ اور اپنے بڑے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کی داڑھی اور سر کے بال نوچ ڈالے۔ اس بارے میں قرآن پاک کی سورہ طٰہٰ آیات 93 میں ارشاد خداوندی ہے:

> ہارون نے جواب دیا ”اے میری ماں کے بیٹے، میری
> ڈاڑھی نہ پکڑ، نہ میرے سر کے بال کھینچ، مجھے اس بات کا
> ڈر تھا کہ تو آ کر کہے گا تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال

دی اور میری بات کا پاس نہ کیا۔''

کوہ طور سے اُتر کر ہم بھی حضرت موسیٰ کے نقش پا پر میدان الراحہ پہنچے جہاں سامری نے بچھڑا بنایا تھا۔ جس میں سے بیل کی آواز نکلتی تھی۔ لوگ حضرت موسیٰ اور اُس کے خدا کو بھول کر اس بچھڑے کو ہی خدا ماننے لگے تھے۔ حضرت موسیٰ نے یہ دیکھا تو پہلے اپنی بھائی ہارون کا محاسبہ کیا جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ پھر سامری اور اپنی قوم سے باز پرس کرنے کے بعد غصہ میں اُس سونے کے بچھڑے کو پھینکا تو وہ قریب کی چٹان پر لگنے سے پاش پاش ہو گیا۔ ہم نے کوہ طور کے دامن میں ایک چٹان پر بچھڑے کے نقوش دیکھے جو بالکل نمایاں نظر آ رہے تھے۔ جو اس بات کے گواہ تھے کہ سامری کا معاملہ یہاں ہی پیش آیا تھا۔ اس کے قریب پشت کی طرف ایک اونچے ٹیلے پر حضرت ہارون علیہ السلام کا مقام ہے۔ سامری کے بچھڑے کے نقوش دیکھنے کے بعد ہم حضرت ہارون علیہ السلام کے مزار پر حاضر ہوئے۔

حضرت ہارون علیہ السلام

حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ کے بڑے بھائی تھے۔ سنا ہے حضرت موسیٰ لکنت کی بناء پر بات چیت کرنے میں دشواری محسوس کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ جب حضرت موسیٰ کی تربیت کر کے انہیں فرعون کے پاس بھیجنے لگے تب حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی جس کا ذکر بھی سورہ طہٰ آیات 25 میں یوں آتا ہے۔

> موسیٰ نے عرض کیا، پروردگار، میرا سینہ کھول دے اور میرے کام کو میرے لیے آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ سُلجھا دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔ اور میرے لیے میرے اپنے کنبے سے ایک وزیر مقرر کر دے۔ ہارون جو میرا بھائی ہے۔ اُس کے ذریعہ سے میرا ہاتھ مضبوط کر اور اس کو میرے کام میں شریک کر دے۔ تاکہ ہم خوب تیری پاکی بیان کریں اور خوب تیرا چرچا کریں۔ تو ہمیشہ ہمارے حال پر نگران رہا ہے''۔
>
> فرمایا'' دیا گیا جو تو نے مانگا اے موسیٰ ہم نے ایک مرتبہ پھر تجھ پر احسان

کیا۔

ہم حضرت ہارون علیہ السلام کے مزار پر حاضر ہوئے۔ یہ ایک چھوٹے سے کمرے پر مشتمل اونچے ٹیلے پر واقع تھا۔ مزار کا دروازہ بند تھا۔ یعقوب آزاد نے دروازہ کھولا اور ہم اندر چلے گئے۔ کمرے کے عین درمیان ایک قبر تھی۔ جو زمین سے تین فٹ اونچی تھی۔ جس پر سبز چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ فرش اور در و دیوار کچے تھے۔ کسی اللہ کے بندے نے سفید رنگ کر دیا تھا۔ ہمیں پیغمبروں کے مزار اس حالت میں دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ بلکہ یعقوب آزاد دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ ہم بوجھل دل کے ساتھ اس خطہ سے نکلے۔ بالکل حضرت موسیٰ کی طرح جنہیں اُن کی قوم میں سے سامری نامی ایک شخص نے سونے کا بچھڑا بنا کر دکھی کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ بنی اسرائیل کو لیکر اپنی اگلی منزل کی طرف چلے گئے تھے۔ بالکل اُسی حالت میں ہم بھی دکھی ہو کر اپنی منزل کی طرف یہ سوچتے ہوئے چل پڑے کہ آج کا مشرق وسطیٰ دنیا کے تمام ممالک سے امیر ترین ہے لیکن ان ملکوں کے حکمران سوئزلینڈ کے جوئے خانوں میں ایک رات میں کروڑوں ڈالر ہارتے ہیں لیکن اُن مسلمانوں کو اپنے ہی ملک میں پیغمبروں کے مزارات کی خستہ حالی نظر نہیں آتی۔ ممکن ہے ہمارے یہی کرتوت ہمیں دن بدن بلندی کی بجائے ذلت کی طرف دھکیل رہے ہوں۔

حضرت ہارون علیہ السلام کے مزار پر حاضری دیکر ہم واپس اُسے راستے پر چل پڑے جس راستے سے صبح سینٹ کیتھرائین کے اس علاقے میں آئے تھے۔ جب ہم حضرت صالح کے مزار کے قریب چوک میں پہنچے تو وہاں ایک مسجد میں نماز ادا کی۔ یعقوب آزاد تو نماز کوہ طور پر ادا کر کے آئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے نماز کی بجائے وہاں قریب ہی ایک مصری بھائی سے دوستی گانٹھ کر اُس کے ساتھ اُس کے گھر بلکہ باورچی خانے میں جا کر مرغ کے سالن سے لذت دہن فرمایا۔

نماز کے بعد ہم نے دوبارہ سفر کا آغاز کیا۔ ہم صبح جس راستے سے یہاں پہنچے تھے اُس کی مخالف سمت میں چل پڑے۔ تھوڑے فاصلے کے بعد ایک برستانی نالے پر پہنچے تو وہاں سڑک ٹوٹی ہوئی تھی۔ چند میل یوں ہی چلنے کے بعد دوبارہ ایک بہتر پختہ سڑک پر پہنچ گئے۔ اس تمام سفر کے دوران ہم نے دیکھا کہ سڑکوں کی حالت انتہائی اچھی تھی۔ سینا کے اس صحرا میں بھی

سڑک کے درمیان میں بڑے واضح سفید لکیریں کھینچ کر بین الاقوامی معیار کے مطابق سائین لگے ہوئے تھے۔ اس سڑک پر چلتے ہوئے تقریباً ستر کلومیٹر سفر کے بعد ہم نخلستان فاران پہنچے۔

نخلستان فاران

کوہ طور سے ستر کلومیٹر کے فاصلہ پر نخلستان فاران ہے۔ یہ نخلستان تقریباً تین میل لمبا ہوگا۔ چوڑائی تھوڑی ہے۔ چونکہ اردگرد اونچے اونچے پہاڑ ہیں۔ یہاں بجلی اور ضروریات زندگی کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ آبادی سڑک سے دائیں طرف تھوڑے فاصلے پر تھی۔ لیکن اس کے باوجود سڑک پر روشنی کیلئے بجلی کے بلب جل رہے تھے۔

نخلستان فاران میں کثرت سے پانی اور باغات دیکھے۔ کھجور، انگور اور زیتون کے درختوں نے صحرا میں نخلستان کو جنم دیکر لوگوں کو ایک نئی زندگی دے رکھی تھی۔ چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ تھے۔ اونٹ اور گدھے بھی دیکھے۔ ممکن ہے کچھ لوگ معمولی کھیتی باڑی بھی کرتے ہوئے لیکن محسوس ہوتا تھا کہ زیادہ تر لوگ بھیڑ بکریاں اور پھل فروخت کر کے گزارہ کرتے ہیں۔ عیسائی اس نخلستان کو رفیدیم کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

رفیدیم سے بحرہ احمر کی طرف سفر کرتے ہوئے تھوڑا دور ''حورب'' کے مقام پر پہنچے تو ڈرائیور رھام نے سڑک کے بائیں طرف اشارہ کر کے ایک چٹان کی نشاندہی کی جس پر حضرت موسیٰ نے عصا مارا اور بارہ چشمے پھوٹ نکلے تھے تاکہ بنی اسرائیل کے بارہ قبائل الگ الگ چشموں سے پانی لے سکیں۔ قرآن پاک سورہ بقرہ میں اس کا ذکر یوں آتا ہے:

> یاد کرو، جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی کی دُعا کی تو ہم نے کہا کہ فلاں چٹان پر اپنا عصا مارو۔ چنانچہ اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر قبیلے نے جان لیا کہ کونسی جگہ اس کے پانی لینے کی ہے۔ اُس وقت یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ اللہ کا دیا ہوا رزق کھاؤ پیو اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل اُس وقت آپس میں اس قدر بٹے ہوئے تھے کہ وہ ایک جگہ سے پانی پینا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ ممکن ہے اسی بے اتفاقی کی وجہ سے فراعنہ ان

سے غلاموں سے برتر سلوک کرتے رہے۔ بالکل اسی طرح جیسے آج کے مسلمان آپس کے اختلافات کی بناء پر عرب وعجم اور پھر شعیہ، سنی اور وہابی کے علاوہ اور بہت سے فروعی اختلافات میں بٹے ہوئے ہیں۔ جس کی بناء پر امریکہ، برطانیہ اور یورپ مسلمانوں کو اپنی منشا کے مطابق بالکل اُسی طرح نچار ہے ہیں جیسے برصغیر کے دیہاتوں میں کچھ فنکار ''بچہ جمہورا'' کا کھیل رچا کر ایک پالتو ریچھ کو وردی پہنا کر رسی سے باندھ کر نچا کر روزی کماتے ہیں۔ آج امریکہ بہادر نے مسلمان ممالک میں کئی ایسے بچے جمہورے پال رکھے ہیں۔ جو آقا کے اشاروں پر ریچھ کی مانند ناچتے بلکہ سر کے بل چلتے نظر آتے ہیں۔ اور اپنے ملک کا کھا کر گن امریکہ بہادر کے گاتے ہیں۔ ایسے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ۔

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

وادی فاران

وادی فاران نخلستان فاران سے بحرہ احمر تک پھیلی ہوئی ہے۔ بحرہ احمر سے دوسڑکیں الگ ہوتی ہیں ایک جبل موسیٰ کی طرف چلی جاتی ہے اور دوسری بحرہ احمر کے ساتھ ساتھ شرم الشیخ کی طرف جاتی ہے۔ اس مقام سے ہم شرم الشیخ چلے گئے تھے اور اب صحرائے سینا کا پورا چکر لگانے کے بعد دوبارہ اُسی مقام پر پہنچے تھے۔ وادی فاران پہنچتے ہی علامہ اقبال یاد آنے لگے:

پھر وادی فاراں کے ہر ذرے کو چمکا دے
پھر شوق تماشا دے، پھر ذوق تقاضا دے
محروم تماشا کو پھر دیدہ بینا دے
دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے
بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے

وادی فاران ریگستان اور صحرا پر مشتمل ایسا علاقہ ہے جہاں دور دور تک ہریالی نام کی کوئی چیز نہیں۔ بعض جگہوں پر بدووں کے خیمے دیکھے تو اس بات کا احساس ہوتا رہا کہ یہاں

لوگ رہتے بھی ہیں۔ لیکن بدو تو اپنی رہائش موسم اور ضرورت کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ ریت اور سرخی مائل پہاڑیوں میں بعض جگہ بھیڑ بکریوں کو بھی چرتے دیکھا۔ پتہ نہیں وہ کھاتی کیا تھیں مجھے تو کھانے کو کچھ نظر نہیں آیا۔

وادی فاران کے بیچوں بیچ سفر کرتے ہوئے جب ہم بحرہ احمر کے کنارے پہنچے تو وہاں سے دائیں مڑ کر دوبارہ اُسی شاہرہ پر پہنچ گئے جس پر کل سفر کرتے ہوئے شرم الشیخ گئے تھے۔ اب ہمیں تھوڑا سہارا ہوا چونکہ شام کے اندھیرے چھا رہے تھے ایسے میں اگر پہاڑوں کے درمیان گاڑی خراب ہو جاتی تو پھر رات وہاں بسر کرنی مشکل تھی۔ صبح شرم الشیخ میں جو بھرپور ناشتہ کیا تھا اُس کے بعد دن بھر کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ یہاں قریب ہی زینبیہ پہنچ کر کھانا کھائیں گئے۔ تقریباً بیس میل کے سفر کے بعد ہم زینبیہ پہنچے تو سڑک کے کنارے ہی ایک خوبصورت ہوٹل میں رات کا کھانا کھایا۔ میں نے چاول گوشت، منیر صاحب نے چکن روسٹ، یعقوب آزاد نے کباب اور بکاری نے بلا تفریق تمام اقسام کے کھانے کھائے۔ کیونکہ بیچارہ دن بھر کا بھوکا تھا۔

کھانے کے بعد ہم نے قاہرہ کا رخ کیا۔ لیکن تیز ہوائیں بلکہ آندھی نے آن گھیرا تو گاڑی کی رفتار کم بلکہ بہت ہی کم کرنی پڑی۔ آندھی کی وجہ سے اندھیرا چھا گیا تھا اور بالکل دھند کا منظر پیش ہو رہا تھا۔ اس طرح سینا کا سفر دھند اور اندھیرے میں طے کیا۔ نہر سویز کے نیچے سرنگ کے ذریعے گزر کر مصر پہنچے تو پھر عام رفتار کے مطابق سفر کرتے ہوئے رات بارہ بجے اپنی قیام گاہ پر پہنچے۔

یہودی، عیسائی اور مسلمان

بستر پر لیٹا تو نیند کی بجائے سوچوں نے آن گھیرا۔ میں سوچنے لگا کہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر خاص کرم ہے کہ میں پیغمبروں کی سرزمین کے تمام ممالک کی سیاحت کر چکا ہوں۔ جہاں میں کوہ طور پر گیا وہاں میں نے غار حرا اور بیت المقدس میں بھی حاضری دی۔ اِن تمام مقامات کی زیارت کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ تین بڑے الہامی مذاہب میں جہاں بہت سی باتیں مشترک ہیں وہاں ان مذاہب کے پیروکاروں کے جذبہ ایمان میں زمین و آسمان کا فرق بھی

ہے۔مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے یہودیوں پر بڑی نوازشات کیں۔ جہاں انہیں دین کی دولت سے مالا مال کیا وہاں انہیں فراعنہ کے ظلم سے نجات دلوائی۔ لیکن یہ اس قدر لاڈلے تھے کہ جب صحرائے سینا میں پہنچے تو حضرت موسیٰ سے کہا کہ ہمارے لئے پانی کا بندوبست کرو۔ حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ سے دُعا فرمائی اور پانی کا بندوبست کروایا، پانی ملا تو پھر کھانے کی فرمائش کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے من وسلویٰ اُتارا۔اسی طرح گرمی اور دھوپ کی شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے بادل چھادیئے۔اس دوران جب حضرت موسیٰ کوہ طور پر گئے تو اس قوم نے سب کچھ بھلا کر بچھڑے کی پرستش شروع کردی۔ پھر جب جنگ کرنے کا حکم آیا تو لڑنے سے انکار کردیا اور کہا: ''اے موسیٰ تو اور تیرا خدا ہی دشمن سے جنگ کریں ہم نہیں لڑیں گے۔''

اسی طرح حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے ساتھ ہی معجزات ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ مردوں کو زندہ کردیتے۔مادرزاد اندھے کی بصارت بحال ہو جاتی۔ کوڑھ کی موذی مرض میں مبتلا مریض کے جسم پر ہاتھ پھیرتے تو وہ ٹھیک ہو جاتا۔ان تمام کرامات کو حضرت عیسیٰ کے حواری اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔لیکن یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے اندر جذبہ ایمان زیادہ پختہ نہ ہوسکا۔جس کا واضح ثبوت محققین کی وہ رائے ہے۔جس کے مطابق حضرت عیسیٰ کی گرفتاری کیلئے مخبری کرنے والا یہودا نامی شخص حضرت عیسیٰ کا قریبی ساتھی اور حواری تھا۔جب رومی حکمرانوں نے حضرت عیسیٰ کو گرفتار کرکے صلیب پر چڑھانے کا حکم دیا تو حضرت عیسیٰ کے پیروکاروں نے بغیر رونے دھونے کے کچھ نہیں کیا۔ صدق ایمان کا تقاضا یہ تھا کہ حواری رومنوں کے خلاف تلواریں اٹھاتے ہوئے جاں نثاری کا مظاہرہ کرتے۔لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں کا کمال یہ ہے کہ جس نے بھی اسلام کا دامن پکڑا۔وہ صدق دل سے اسلام میں داخل ہوا۔حضور اکرم کے ہر حکم پر جان کے نذرانے پیش کیے۔ جنگ بدر، جنگ خندق، جنگ احد سے لیکر رومیوں کے خلاف جنگ کے تمام معرکوں میں اسلام کے جاں نثاروں نے ایک سے بڑھ کر ایک نے شجاعت کے مظاہرے کیے۔ جب حضور اکرم نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو حضرت علی کرم اللہ نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر رات حضور اکرم کے بستر پر گزاری۔ جنگ احد میں حضور اکرم کے دندان مبارک شہید

ہوئے تو کئی صحابہ نے اپنے دانت اکھاڑ دیئے۔اپنی قیمتی سے قیمتی چیز کو حضور پر قربان کیا۔

صحابہ اکرام نے کبھی بھی حضور اکرم سے معجزہ دکھانے کیلئے نہیں کہا۔کبھی کھانے پینے مال و دولت یا دنیاوی دکھاوے کے کاموں کی فرمائش نہیں ہوئی ۔مسلمانوں نے یہودیوں کی طرح کبھی بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ نہیں کہا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کا دیدار کروائیں یا ہم جنگ نہیں لڑیں گئے۔آپ اور آپ کا خدا جنگ لڑیں۔

جانثار محمد صلی اللہ علیہ وسلم دور نبوت سے آج تک ہر گستاخِ رسول کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ۔جہاں ضرورت محسوس ہوئی وہاں تلوار بھی اٹھائی۔ممکن ہے اسی وجہ سے مغربی مفکرین اپنے لوگوں سے کہہ گئے ہیں کہ دنیا میں ہر کسی کے خلاف بات کر و لیکن:

Be carefull with Mohammad (P.B.U.H)

(حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بات کرتے وقت انتہائی محتاط رہو۔)



انگلستان واپسی

سانڈے کا تیل اور سلاجیت
رخت سفر
خراٹے باز مسافر
اپنا گھر بریڈفورڈ

انگلستان واپسی

آج جمعہ کا دن تھا۔ ہم نے نماز جمعہ مسجد عمرو بن عاص میں ادا کی۔ یہ مسجد اُس عظیم صحابی کے نام منسوب ہے جو مصر فتح کرنے والی فوج کے سپہ سالار تھے۔ براعظم افریقہ میں تعمیر ہونے والی یہ پہلی مسجد تھی۔ ہم مسجد پہنچے تو باہر بھاری تعداد میں پولیس اور بکتر بند گاڑیاں کھڑیں تھی۔ اندر گئے تو مسجد کو انتہائی خوبصورت اور کشادہ پایا۔ جو نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ محراب کے قریب ایک کرسی نما چبوترے پر قاری صاحب چوکڑی مارے بیٹھے تلاوت قرآن پاک فرمارہے تھے۔ قاری صاحب بہت ہی خوش الحان تھے۔ جن کی آواز شیریں اور حلاوت سے بھری ہوئی تھی۔ قرات سنتے وقت یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اللہ تعالیٰ کا کلام ابھی ابھی نازل ہورہا ہے۔ ٹھیک بارہ بجے تلاوت ختم ہوئی اور امام صاحب جو کافی عمر رسیدہ تھے نے خطبہ جمعہ دیا۔ اِن کی ڈاڑھی واجبی سی تھی۔ اور سر پر سبز ٹوپی کے ارد گرد سفید عمامہ باندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے بڑے موثر انداز میں خطاب فرمایا۔ خطبہ کے بعد دُعا اور پھر نماز ادا کی گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ مصر میں دُعا خطبہ کے بعد اور نماز سے پہلے مانگی جاتی ہے۔ جبکہ برصغیر میں دُعا نماز کے بعد مانگی جاتی ہے۔

نماز ادا کر کے مسجد کے صحن میں آئے تو دیکھا کافی تعداد میں مسلمان مظاہرہ کرر ہے ہیں۔ مظاہرین نے پلے کارڈ اٹھائے ہوئے تھے جن پر لکھا ہوا تھا کہ:

''امریکہ اور مغرب مسلمانان عالم کو اپنا ہدف بنانا بند کریں''

احتجاج کے دوران ایک درمیانی عمر کے صاحب اُٹھے اور پُر جوش انداز میں مظاہرین سے یوں مخاطب ہوئے:

''مسلمان بہنو اور بھائیو:

آپ اس وقت مکار دشمن کے نرغے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہمارے مشترکہ دشمن امریکہ نے مسلم دنیا کے قدرتی وسائل پر زبردستی قبضہ کر رکھا ہے۔ تیل نکلتا تو عرب کے صحرا سے لیکن اُس سے سیراب امریکہ ہوتا ہے۔ مشرق وسطیٰ کی مثال اُس گائے کی مانند ہے جو ملکیت تو عربوں کی ہے۔ لیکن اُس کا دودھ اور مکھن امریکی کھاتے ہیں۔ جبکہ غلاظت مسلمانوں پر گرتی ہے۔

امریکہ اور برطانیہ نے عراق پر قبضہ کرتے وقت جو جھوٹ کا بہانہ تراشا تھا اُس کا بھانڈا اُس وقت سر بازار پھوٹا جب امریکہ اور برطانیہ کو عراق میں کوئی مہلک ہتھیار نہیں ملا۔ لیکن اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کی خاطر جارج ڈبلیو بش بڑی ڈھٹائی سے جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہا ہے۔ اور بعض مسلم حکمران امریکہ کے پیچھے یوں سر جھکائے کھڑے ہیں جیسے امام کے پیچھے مُقتدی کھڑے اطاعت کرتے ہیں۔

ظلم یہ ہے کہ امریکہ نے افغانستان میں جب مسلمانوں کو روس کے خلاف جنگ میں جھونکا۔ تو انہیں ''مجاہدین'' کے نام سے پکارا جانے لگا۔ مغربی میڈیا نے انہیں نمایاں اور مثبت انداز میں پیش کیا۔ اُس وقت یوں محسوس ہوتا تھا جیسے مغرب اور امریکہ نے اسلام کا فلسفہ جہاد کو دل سے تسلیم کر لیا ہے۔ مجاہدین نے جذبہ ایمانی اور امریکی اسلحہ کے بل بوتے پر روس کو افغانستان میں عبرت ناک شکست دی۔

اپنا مطلب نکل جانے پر امریکہ اور مغرب نے طوطا چشمی کا مظاہرہ کیا۔ حالات سے مجبور مجاہدین نے جب امریکی رویے کے خلاف آواز بلند کی تو مجاہدین کو ''دہشت گرد'' قرار دیا گیا۔ یہ امریکہ اور

مغرب کا دوغلہ پن ہے۔اسی کو منافقت کہتے ہیں۔''

دھواں دار تقریروں کے بعد سارا ماحول نعرہ تکبیر، اللہ اکبر اور امریکہ مردہ باد کے نعروں سے گھونج اٹھا۔منافق منافق کے نعرے بھی بلند ہونے لگے۔خواتین بھی مردوں کے شانہ بشانہ زور زور سے نعرے لگا رہی تھیں۔ احتجاج کے بعد مجمع پُر امن طور پر منتشر ہو گیا۔ اور یوں مسجد کے باہر کھڑی پولیس کی جان میں جان آئی۔

ہم مسجد سے باہر نکلے تو باہر بڑی رونق تھا۔یعقوب آزاد، بکاری اور ھمام لوگوں سے ملکر باتیں کرنے لگے۔منیر حسین نے مسجد کے مختلف زاویوں سے تصویریں اُتارنی شروع کر دیں۔ اور میں مسجد کو گھیرے میں لیے پولیس کی بھاری نفری کو دیکھ کر سوچنے لگا کہ مغرب اور امریکہ کی بدمعاشیاں اور ظلم وستم بجا لیکن کیا مسلمانوں نے بھی کبھی اپنی کوتائیوں اور کمزوریوں کا احتساب کیا؟

اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے۔جس کا بنیادی مقصد عالمی طاقتوں کا پٹھو بنا نہیں بلکہ دنیا میں عدل وانصاف قائم کرنا ہے۔ روشن خیال مسلمان حکمرانوں پر بات کرنے سے قبل آیئے ایک جھلک مغرب میں قانون کی بالادستی اور انصاف پر ڈالیں۔

برطانیہ کے وزیراعظم ٹونی بلیئر کا جواں سالہ بیٹا ایک شام گھر سے نکلا اور لندن پکاڈلی میں دوستوں کے ساتھ شراب پی کر شور وغل مچا رہا تھا کہ پولیس نے اُسے گرفتار کر لیا۔اس جرم میں ٹونی بلیئر اور شیری بلیئر کو تھانہ میں بلایا گیا۔ پولیس آفیسر نے وارنگ دی اور اُن کے بیٹے کو ضمانت پر رہا کیا۔اس واقعہ پر ٹونی بلیئر کو قوم سے معافی مانگنی پڑی۔ پھر ایک دن برطانوی میڈیا میں یہ خبر شائع ہوئی کہ برطانوی حکمران جماعت لیبر پارٹی نے آسودہ حال لوگوں سے رشوت لیکر انہیں سرکاری اعزازات سے نوازا۔اس خبر کے شائع ہوتے ہی پولیس حرکت میں آئی۔ ایک پولیس مین نے وزیراعظم ہاؤس کے دروازے پر دستک دی۔اندر گیا اور وزیراعظم ٹونی بلیئر سے پوچھ گچھ کی۔ پرنس چارلس سے لیکر دوسرے شہزادوں اور شہزادیوں کو تیز رفتاری کے جرم میں پولیس نے کئی بار موٹر وے پر کھڑا کیا اور جرمانے کیے۔

کیا ہمارے حکمران بھی کوئی ایسی مثال پیش کر سکتے ہیں۔جس پر ہم مسلمان فخر کریں؟ کیا ہمارے حکمرانوں میں بھی مغربی حکمرانوں کی طرح قوت برداشت ہے؟۔

مسلمان آج ذلت کی زندگی بسر کرنے پر کیوں مجبور ہیں؟ یہ سوال اکثر مسلمانوں کے ذہن میں اُبھرتا ہے۔ جس کا مختصر جواب یہی ہے کہ جب تک ہمارے حکمران اپنے اوصاف نہیں بدل لیتے اُس وقت تک مسلمانوں کے حالات کا بدلنا مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بھی یہی حکم ہے:

اِنَ اللّٰہَ لَا یُغَیرُ مَا بِقَومٍ حَتی یُغَیرُوا مَا بِاَنفُسِھِمO

یہ حقیقت ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی۔

(سورۃ الرعد پارہ ۱۳)

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

(مولانا ظفر علی خان)

میں ان ہی خیالات میں گم تھا کہ ساتھیوں نے آکر مجھے خیالوں کی دنیا سے نکال کر قاہرہ کی حقیقی زندگی میں چلنے کو کہا۔ میں اٹھا اور ساتھیوں کے ساتھ قاہرہ کے رونق میلہ میں دوبارہ شامل ہوگیا۔

نماز جمعہ کے بعد ہم قاہرہ کے علاقہ سٹی انجینیر نگ کے محلّہ دارالسلام جو دریا نیل کے اُس پار تھا کھانا کھانے گئے۔ آج ہم نے ملک یمن کا مشہور کھانا مہندی کھایا۔ کھانا چاول اور روسٹ گوشت پر مشتمل تھا۔ کھانے کیلئے ہمام نے کافی دنوں سے شور مچا رکھا تھا لیکن کھانا کھا کر ہمارے دوست یہی کہہ رہے تھے کہ:

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرہ خوں کا نہ نکلا

لیکن بکاری اور ہمام خوش تھے۔ چونکہ اس کھانے کی سب سے بڑی خوبی اس کی فراوانی تھی۔ ہر آدمی کو ایک ایک ٹرے چاول اور گوشت سے لبالب بھر کر دی گئی تھی۔ سلاد اور شوربا الگ تھا۔ ہم کھانے کے میدان کے شیر نہیں اس لئے یہ بازی بکاری اور ہمام نے جیتی۔ اور ہم تینوں حسرت اور اچنبے سے ان دونوں کو سر جھکائے دونوں ہاتھوں سے کھاتے دیکھ رہے تھے۔ کھانے کے بعد ہم نے امام شافعی کے مزار پر حاضری دی۔ پھر مصر کے قدیمی قبرستان کے بیچوں بیچ نکل کر ایران کے آخری بادشاہ رضا شاہ پہلوی کی قبر جو قلعہ صلاح الدین ایوبی کے پہلو میں

مسجد حسن کے صحن میں ہے۔ وہاں قریب سے گزر کر مقطم پہنچے۔

مقطم سٹی میں مصر کے سابق صدر جمال ناصر کی قبر ہے۔ یہ قبر ایک مسجد کی نچلی منزل میں ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے تب قبر کا کمرہ بند تھا۔ ہم نے کھڑکی کی جالیوں سے جھانک کر دیکھا تو سنگ مرمر کی سفید قبر ایشیائی طرز کے مطابق تیار کی گئی تھی۔ ناصر 1952ء میں کنگ فاروق کو معزول کرنے کے بعد برسر اقتدار آئے تھے۔ انہوں نے مصری قومیت کا نعرہ بلند کیا اور اہل مصر کو اپنے شاندار ماضی جس کی کڑیاں دور فراعنہ سے ملتی ہیں سے جا ملایا۔ ناصر بڑے فخر سے اپنے آپ کو فراعنہ کی اولاد سے منسوب کرتے تھے۔ انہوں نے 1956ء میں نہر سویز جس پر عملاً برطانیہ اور فرانس کا قبضہ تھا کو قومی ملکیت میں لیا۔ یہ بات برطانیہ، فرانس اور اسرائیل کو بالکل پسند نہ آئی۔ چنانچہ انہوں نے ملکر نہر سویز پر بمباری کی اور یوں دنیا کی ایک منفرد نہر کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ لیکن یہ بمباری ناصر کے رویے میں لچک پیدا نہ کر سکی۔ ناصر کا یہ بڑا اجرات مندانہ قدم تھا۔ چونکہ نہر سویز بہتی تو مصر میں تھی لیکن اُس کے مالی فائدے یورپ اٹھا رہا تھا۔ ناصر نے مصری قومیت کے ساتھ ساتھ عرب ممالک کو متحد کرنے کی بڑی کوشش کی تھی۔ بلکہ ایک وقت ایسا آیا تھا جب مصر اور شام نے ایک کنفیڈریشن بنالی تھی۔ اگر ناصر کی یہ کوشش کامیاب ہوتی تو ممکن ہے آج عرب دنیا بھی یورپ کی طرح متحد اور ایک ہوتی۔

جمال ناصر کے مزار کے بعد ہم نصر سٹی میں انور سادات کے مزار پر گئے۔ جمال ناصر کی وفات کے بعد انہوں نے ہی ملک کی بھاگ ڈور سنبھالی تھی۔ انور سادات کو بڑے کھٹن حالات میں اقتدار سنبھالنا پڑا۔ اُس وقت ملک کے بہت بڑا حصے پر اسرائیل نے قبضہ کیا ہوا تھا۔ صحرائے سینا کے علاوہ قاہرہ سے کوئی ساٹھ میل دور اسرائیل کی فوجیں کھڑی تھیں۔ یوں ملک کو اسرائیل سے آزاد کروانا اور معاشی حالات کو بہتر کر کے ملک کو دوبارہ پر وقار بنانے جیسے کام انہیں کرنے تھے۔ آزادی کیلئے انہوں نے 1973ء میں اسرائیل کے خلاف ایک اور جنگ لڑی لیکن زیادہ کامیابی نصیب نہ ہو سکی۔ آخر انہیں سفارتی رابطے اور بات چیت کے عمل سے آزادی لینی پڑی۔

1977ء میں انور سادات اسرائیل گئے اور وہاں اسرائیلی پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے امن کیلئے درخواست کی۔ اور پھر 1979ء میں امریکہ جا پہنچے جہاں کیمپ ڈیوڈ کے

مقام پر اسرائیلی وزیر اعظم کے ساتھ مذاکرات کر کے ایک معاہدے پر دستخط کیے جو معاہدہ کیمپ ڈیوڈ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس معاہدے کے تحت اسرائیل نے مصر کے جس علاقہ پر قبضہ کیا تھا وہاں سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں۔ کیمپ ڈیوڈ معاہدے کے رد عمل میں مسلمان ممالک خصوصاً عربوں نے مصر کے ساتھ تعلقات ختم کرتے ہوئے اسے 1979ء میں عرب لیگ سے نکال دیا تھا۔ لیبیا، شام، الجزائر، لبنان، یمن اور پی ایل او نے مصر کے ساتھ سفارتی تعلقات ختم کر دیئے تھے۔ جس سے مصر کو زبردست مالی نقصان پہنچا۔ لیکن امریکہ نے مصر کو سہارا دیکر پاؤں پر کھڑا کر دیا۔ ان سنگین حالات میں انور سادات اپنا مقبوضہ علاقہ آزاد کروانے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن یہ آزادی ان کی ذات کو مہنگی پڑی اور 1981ء میں ایک فوجی پریڈ کے دوران انہیں گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔ انور سادات کا مزار اُس مین شاہرہ کے کنارے ہے جہاں سٹیڈیم کے سامنے انہیں گولی مار کر قتل کیا گیا تھا۔

انور سادات کی شہادت کے بعد ملک کے اقتدار پر جنرل حسنی مبارک قابض ہوئے۔ اور نیشنل ڈیموکریٹ پارٹی کے سہارے حکومت کرنے لگے۔ حسنی مبارک بھی امریکی مفاد کیلئے ہر وقت لڑنے کیلئے تیار رہتے ہیں۔ 1990ء میں جب امریکہ نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر عراق پر حملہ کیا تو مصر نے بھی اپنی فوجیں عراق بھیجیں تھیں۔

مزارات کے بعد ہم قاہرہ کے ویو پوائنٹ مقطم گئے۔ شہر کی پشت پر یہ ایک اونچی پہاڑی ہے۔ جہاں آبادی ہے۔ لیکن یہ ویو پوائنٹ اسلام آباد دامن کوہ کی طرح خوبصورت اور خوشنما نہیں تھا۔ سچی بات یہی ہے کہ ہمیں وہاں جا کر مایوسی ہوئی۔ یہ اونچی جگہ ضرور تھی جہاں سے شہر کا طاہرانہ جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ لیکن فضاء صاف نہیں تھی جس کی وجہ سے قاہرہ کے درمیان سے بہتے دریا اور اُس کے پس منظر میں احرام اتنے خوبصورت نظر نہیں آ رہے تھے جتنے وہ خوبصورت ہیں۔ وہاں پر بھیک مانگنے والے اور سیاحوں کو چائے پلا کر لوٹنے والوں کی بھرمار تھی۔ ان سب نے ہم پر ہلہ بول دیا۔ ہم نے جان چھڑانے کی خاطر چائے پی۔ سچ یہ ہے کہ دو ہفتے کی سیاحت کے دوران قاہرہ شہر کا جو خوبصورت تصور ذہن میں اُبھرا تھا وہ مقطم کے ویو پوائنٹ پر آنے سے متاثر ہوا۔

سانڈے کا تیل اور سلاجیت

ہم مصرِ قدیم میں گھوم رہے تھے کہ ایک چوک کے قریب فٹ پاتھ پر ایک مصری مجمع باز کو دیکھا جو سانڈے کا تیل اور سلاجیت قسم کی کوئی چیز فروخت کر رہا تھا۔ اپنی ادویات کے کرشمے بیان کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ ان ادویات کا استعمال فراعنہ شام ڈھلے شروع کر دیتے تھے۔ یہ اِن ادویات کا کمال تھا کہ رعمیس دوئم کے ایک سو سے زائد بچے اور کئی بیویاں تھیں اور سب کی سب خوش باش رہتی تھیں۔ اس انکشاف پر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ صاحب فراعنہ کے ''خادم خاص'' رہے ہیں۔ اور دور فراعنہ کی ان ادویات کو تیار کرنے کے خفیہ راز ان کے خاندان میں سینہ بہ سینہ چلے آ رہے ہیں۔ ادویات فروخت کرنے والے کے ساتھ اُس کا معاون جادو کے کرشمے دکھا کر لوگوں کو متوجہ کر رہا تھا۔ یہ منظر دیکھا تو مجھے گوجرانوالہ میں سانڈے کا تیل فروخت کرنے والا وہ موٹا تازہ پہلوان یاد آنے لگا جو شہر کے گوندلاں والے اڈہ کے قریب مجمع لگا کر تیل فروخت کیا کرتا تھا۔ اُس سے تھوڑے فاصلے پر ایک خان صاحب سلاجیت کے کرشمے بیان کیا کرتے تھے۔ بچپن میں ہم بازار سے سودا سلف خریدنے جاتے تو سانڈے کا تیل بیچنے والے پہلوان یا پھر خان صاحب کے گرد کھڑے لوگوں میں شامل ہو کر اُن کی باتیں سنا کرتے تھے۔ لیکن کم عمری کی وجہ سے پہلوان جی اور نہ خان صاحب کی کوئی بات سمجھ آتی تھی۔ حالانکہ وہ سانڈے کے تیل اور سلاجیت کے ایک سو ایک فائدے بتایا کرتے تھے۔

آج مصر میں بھی وہی منظر تھا۔

مجھے اس مصری مجمع باز کی کوئی بات سمجھ نہیں آئی۔ لڑکپن کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ عربی زبان نہ آنے کی وجہ سے۔ بھلا ہو ھمام کا جس نے اس کی تقریر کا خلاصہ مجھے انگریزی میں بتایا۔ مصری شعبدہ باز نے سامنے زندہ سانڈے رکھے ہوئے تھے۔ اور بڑی بلاغت سے سانڈے کے تیل کے فضائل بیان کر رہا تھا۔ بالکل وطن عزیز کا منظر تھا۔ میں نے زندہ سانڈے دیکھے تو خیال پیدا ہوا اگر فراعنہ ہوتے تو ان کی عبادت شروع کر دیتے۔ فراعنہ نے سانڈے کو دیوتا کا درجہ دے رکھا تھا۔ فیوم کے علاقہ میں ان کا بہت بڑا مندر تھا۔ جھیل فیوم میں یہ سانڈے پرورش پاتے تھے۔ اُس زمانے کے غریب لوگ خون پسینے کی کمائی سے سرسوں کا تیل خرید کر سانڈے

کے مندر میں شمع جلاتے تھے۔ تاکہ دلی مرادیں پوری ہوسکیں۔ اب زمانہ بدلا تو لوگوں نے سانڈے کے حضور تیل کے نذرانے پیش کرنے کی بجائے الٹا اُس کا تیل نکالنا شروع کر دیا۔ کچھ کمزور اور ناتواں سانڈے کے تیل کی خفیہ طاقت کے بل بوتے اپنی کھوئی ہوئی طاقت کو بحال کر کے اپنے مرجھائے ہوئے باغ میں خوشیوں کے پھول بکھیر کر دلی مرادیں پا رہے ہیں۔ وقت وقت کی بات ہے پیارے!

رخصتِ سفر

گھومتے پھرتے، خریداری کرتے شام ڈھلے رہائش گاہ پر پہنچے۔ سامان باندھا اور بکاری کے لگژری فلیٹ کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر یادرفتہ پر باتیں ہونے لگیں۔

منیر حسین نے کہا کہ: ''مصر میں دو ہفتے قیام کے بعد آج یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں اپنے وطن عزیز پاکستان سے رخصت ہو رہا ہوں۔ پاکستان کے بعد مجھے اگر کسی ملک سے پیار ہوا تو وہ مصر ہے۔ مصر کے لوگ بہت اچھے ہیں۔ ملنسار اور امن پسند ہیں۔ لوگوں میں مذہبی رجحان بہت زیادہ ہے۔ سب کچھ ہونے کے باوجود ان کی مساجد آباد ہیں۔ جمعہ کے دن تو ہر طرف تلاوت قرآن پاک کی آوازوں سے سارا ماحول ہی منور ہو جاتا ہے۔ صرف یہاں کے ٹریفک نظام کو بہتر کرنے کی ضرورت ہے۔''

یعقوب آزاد کی رائے میں: ''برطانیہ اور یورپ میں مصر کی غربت کے جو قصے سنائے جاتے ہیں۔ یہاں ہر چیز اُس کے برعکس ہے۔ سڑکیں صاف، نفیس اور پختہ ہیں۔ پورے ملک میں سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ لوگ پرامن ہیں۔ جس کا ثبوت کھلے عام سڑکوں پر کیبن میں نصب کیش مشینیں ہیں۔ اگر ایسا یورپ یا امریکہ میں ہوتا تو لوگ یہ مشین ہی ٹرک میں رکھ کر لے جاتے۔ یورپ والے غیر ملکوں میں ڈاکے اور چوریوں کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن ابھی گذشتہ ہفتہ کی بات ہے جب برطانیہ میں لندن کے قریب ایک کیش ڈپو میں ڈاکہ پڑا جس میں منیجر اور دوسرے عملہ کو باندھ کر ڈاکو پچاس ملین پونڈ کی رقم لے

اڑے۔ مصر کے نوجوان شریف ہیں۔ جبکہ ہمارے نوجوان برطانیہ میں رہتے ہوئے بھی سڑکوں پر بے کار پھرتے آوارہ گردی کرتے نظر آتے ہیں۔ بعض پیسا کمانے کے چکر میں ڈرگ مافیا میں مبتلا ہیں۔''

میری رائے تھی کہ:''مصر پر آج بھی فراعنہ کی حکومت ہے۔ مصر کی آمدن کا سب سے بڑا ذریعہ سیاحت ہے۔ یورپ، امریکہ اور دنیا بھر کے لوگ فراعنہ کے آثار دیکھنے آتے ہیں تو ملک کو کروڑوں کی آمدن ہوتی ہے۔ مصر کے کرنسی نوٹوں، ڈاک کے ٹکٹوں اور بہت سی دوسری قومی دستاویزات پر فراعنہ کی تصویریں ہیں۔ مصر کی سڑکوں اور بڑی بڑی شاہراہوں کے نام فراعنہ کے نام پر رکھے ہوئے ہیں۔ قاہرہ کے ریلوے سٹیشن کے باہر رعمیس کا بہت بڑا مجسمہ نصب ہے۔ مصری عوام فراعنہ سے اپنا تعلق پیدا کر کے خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی بدولت ملک کی آمدن میں بہت اضافہ ہو رہا ہے۔ پورے ملک پر فراعنہ کی چھاپ اتنی واضح ہے کہ اُس سے عام آدمی کا نکلنا مشکل نظر آتا ہے۔ بلکہ صدر ناصر نے تو ایک بار اپنے آپ کو فراعنہ کی اولاد قرار دیا تھا۔

میں نے ایک بار اہرام مصر کے ڈائریکٹر ڈاکٹر ضیائی حواس کا ایک انٹرویو پڑھا تھا جس سے ہالی وڈ کے نامور مصری اداکار عمر شریف نے پوچھا کہ اگر تمہیں دوبارہ فراعنہ کے دور میں پیدا کیا جائے اور کسی فرعون کا روپ دھارنا پڑے تو تم کون سا فرعون بننا پسند کرو گے۔ اس سوال پر ڈاکٹر ضیائی نے جواب دیا میں فراعنہ کا مشہور بادشاہ خوفو بننا پسند کروں گا۔

دنیا میں فراعنہ کا اب بھی اس قدر دبدبہ ہے کہ فرعون رعمیس ثانی کی میت کو علاج کی غرض سے جب 26 ستمبر 1976ء میں فرانس لایا گیا تو فرانس میں میت کو اُسی اعزات کے ساتھ وصول کیا گیا جس

طرح کسی زندہ بادشاہ کو اعزاز دیا جاتا ہے۔ گارڈ آف آنر کے ساتھ توپوں کی سلامی پیش کی گئی تھی۔ یوں فراعنہ مر کر بھی دنیا میں حکومت کر رہے ہیں۔''

شام کا کھانا کھا کر ہوائی اڈہ پر جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ھمام نے ہمیں رات ایک بجے ہوائی اڈہ پر پہنچایا۔ تو ہم سے رخصت ہوتے وقت ھمام کے آنسو نکل آئے۔ کہنے لگا: '' میں اکثر سیاحوں کے ساتھ سفر کرتا ہوں لیکن جتنا لطف آپ کے ساتھ آیا ایسا پہلے کبھی نہیں آیا۔ اور پھر آپ وہ سیاح ہیں جو فراعنہ سے لیکر پیغمبروں کے علاقے سینا تک گئے۔ ورنہ بہت سے سیاح مصر تو آتے ہیں لیکن سینا کا نام نہیں لیتے۔ آپ کے ساتھ گھوم پھر کر میرے علم میں بھی اضافہ ہوا ہے۔''

ہم ساتھیوں کو بھی ھمام کی جدائی کا دکھ ہوا۔ اس نے بڑی ہمدردی کے ساتھ ہماری مدد کی۔ جہاں اور جس وقت چاہا اس نے ہمیں وہاں پہنچایا۔ ہم نے اسے منہ مانگا معاوضہ ادا کرنے کے بعد ایک اچھی بھلی رقم بخشش کے طور پر دی۔ اور جب ہمارا سامان چیک ہو گیا اور ہمیں بورڈنگ گارڈ مل گئے تب منیر حسین اور یعقوب آزاد جو ہمارے وزیر خزانہ بھی تھے نے تمام مصری کرنسی جو خرچ ہونے سے بچ گئی تھی ھمام کو دے دی۔ یوں ھمام اور ہم خوشی خوشی ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔

خراٹے باز مسافر

جہاز قاہرہ کے ہوائی اڈہ سے صبح چار بجے اُڑا۔ تو مسافر لمبی تان کر سو گئے۔ میرے ساتھ منیر حسین اور اُن کے ساتھ ایک شیخ صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ شیخ صاحب کے سامنے والی سیٹوں پر ایک مصری مولوی صاحب اپنے پانچ بچے اور بیگم کے ساتھ آ بیٹھے۔ مولوی صاحب کی بیگم اور بچے تو جلد ہی سو گئے لیکن موصوف بار بار ادھر اُدھر دیکھتے اور بے چین نظر آ رہے تھے۔ جب فضائی میز بان نے کھانے کی ٹرالی لائی تو مولوی صاحب کی بیتابی کم اور چہرے پر لالی کے آثار نظر آنے لگے۔ حقیقت میں مولوی صاحب کو کھانے کی تاڑ تھی۔ جوں ہی کھانا آیا انہوں نے اپنے سوئے ہوئے تمام بچوں اور بیگم کا کھانا لیا اور بڑے آرام سے چھ آدمیوں کا کھانا چٹ کر کے

زور کا ڈکار مار کر الحمدللہ کہا اور سو گئے۔

کھانے کے بعد منیر حسین کے ساتھ بیٹھے ہوئے شیخ صاحب بھی سو گئے۔ سونے پر معلوم ہوا ہمارے شیخ صاحب سوتے ہوئے بڑے دھڑلے سے خراٹے بھرتے ہیں۔ جنکی شدت **7.5** ریکٹر سے ہرگز کم نہیں ہوتی۔ خراٹوں کی آواز سے منیر حسین اور دوسرے مسافر بڑے تاؤ کھا رہے تھے۔ لیکن مسافروں کو اُس وقت مزید حیرت ہوئی جب مولوی صاحب جنہوں نے ابھی ابھی چھ آدمیوں کا کھانا ہڑپ کیا تھا۔ کھانا کھاتے ہی سو گئے اور ہمارے شیخ صاحب کے مقابلے پر کچھ اس طرح اُتر آئے کہ شیخ صاحب کے خراٹے کی آواز ابھی فضا میں گردش ہی کرتی ہوتی تھی کہ مولوی صاحب جوابی حملہ کر دیتے تھے۔ یہ منظر دیکھتے ہوئے مسافروں کو پرانے زمانے کے لوہار کی اُس بھٹی کی یادیں آنے لگیں۔ جس میں آگ جلانے کیلئے بکرے کی کھال سے ہوا پھونکی جاتی تھی۔ لیکن آج جہاز کے اندر کی فضا میں مسلسل خراٹوں کی خوفناک آوازیں بکرے کی کھال سے نہیں بلکہ دو انسانوں کے پھیپھڑوں سے نکل رہی تھیں۔ جنہیں مسلسل سنتے سنتے مجھ پر فرعون خوفو کے اہرام والا خوف طاری ہونے لگا تھا۔

جب شیخ اور ملاں کے درمیان خراٹوں کا مقابلہ جاری تھا تب فضائی میزبان لڑکیاں اِدھر اُدھر بھاگتی دیکھی گئیں۔ معلوم ہوتا تھا جیسے جہاز میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہے۔ عملہ پریشانی میں دوڑتا بھاگتا جب ہماری سیٹوں کے پاس آیا تو انہیں معلوم ہوا یہ آوازیں جہاز کے انجن سے نہیں بلکہ دو مسافروں کے مقابلہ خراٹا بازی کا نتیجہ تھیں۔ یہ راز پاتے ہی عملہ نے زور کے قہقے لگا کر خوشی کا اظہار کیا۔ لیکن مسافروں کیلئے یہ فیصلہ مشکل تھا کہ دونوں خراٹے بازوں میں سے کس کا پلا بھاری رہا۔

یوں ہی سفر کرتے ہوئے جب جہاز اٹلی کے شہر میلان پہنچا تو کپتان نے اعلان کیا کہ ''خواتین وحضرات حفاظتی بیلٹ باندھ لیجئے۔ ہم مقررہ وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے اپنی منزل پر پہنچ رہے ہیں''۔ اعلان سن کر منیر حسین بولے: ''جلدی پہنچنے کی وجہ غالباً یہی ہوگی کہ جب جہا کے عملہ کو احساس ہوا کہ جہاز کے انجن میں نقص ہے تو پائلٹ نے جہاز کی رفتار تیز کر دی ہوگی تاکہ منزل پر جلد پہنچ سکیں۔''

میلان سے بریڈفورڈ

قاہرہ سے جہاز اُڑا تو چار گھنٹے کے بعد میلان کے ہوائی اڈہ پر اُتر گیا۔ جہاں ہمیں اگلی فلائیٹ کیلئے سات گھنٹے انتظار کرنا تھا۔ ہم ہوائی اڈہ کی انتظار گاہ میں بیٹھے تو ہماری دیکھا دیکھی دوسرے مسافروں نے بھی آہستہ آہستہ آ کر بیٹھنا شروع کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد منیر حسین نے ہمیں بتایا کہ: ''بادشاہو! میرے خیال میں یہ گورا جو ہماری پشت کی طرف بیٹھا ہوا ہے کسی جاسوس ادارے کا ملازم ہے۔ جو ہماری باتیں اور حرکات نوٹ کر رہا ہے۔'' مجھے تو نیند نے گھیرا ہوا تھا۔ یعقوب آزاد بھی اونگھ رہے تھے۔ لیکن منیر حسین نے اُس گورے پر نظریں رکھیں اور بجائے وہ گورا ہماری نگرانی کرتا منیر حسین نے اُس کی نگرانی شروع کر دی۔ منیر حسین کیلئے یہ ایک مشکل اور تکلیف دہ کام تھا۔ جنہوں نے خود کو دکھی رکھ کر بھی ہماری حفاظت اور خوشیوں کیلئے کام کیا۔ منیر حسین کی ایک خاص خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ساتھیوں کی خوشیوں کیلئے خود دکھی اور اُداس ہو جاتے ہیں۔ جب میں انہیں ایسی حالت میں دیکھتا ہوں تو اکثر مجھے منیر نیازی بڑی شدت سے یاد آنے لگتے ہیں۔

عادت ہی بنا لی ہے تم نے تو منیر اپنی
جس شہر میں بھی رہنا اُکتائے ہوئے رہنا

میلان کے ہوائی اڈہ پر ہمیں ایک مشکل پیش آئی کہ ہمارے پاس اطالوی کرنسی نہیں تھی۔ ہمارے وزیر خزانہ یعقوب آزاد نے اپنی آخری پونجی بخشیش کے طور پر مصر میں حمام کو دے دی تھی۔ چند گھنٹے پہلے ہم عیاشی کر رہے تھے اب بغیر پیسے کے حالات کچھ یوں ہو گئے تھے کہ بس فاقے ہی فاقے۔ بخشیش دینے والے اب خود بخشیش لینے والوں کی قطاروں میں کھڑے ہونے کیلئے سوچ رہے تھے۔ اٹلی میں سات گھنٹے بغیر کچھ کھائے پیئے سوکھی عیاشی کے سہارے گزارے۔

اٹلی کے شہر میلان سے لندن کا سفر ڈیڑھ گھنٹے کا ہے۔ جہاز میں بیٹھے تو میں نے ساتھیوں کا شکریہ ادا کیا جن کی رفاقت میں دو ہفتے بہت اچھی طرح گزارے اور پھر مصر کا تفصیلی سیاحت کا موقع ملا۔ اگر یہ ساتھی نہ ہوتے تو ممکن ہے میں اس قدر اس سفر سے لطف اندوز نہ

ہو پاتا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے منیر حسین اور یعقوب آزاد جیسے دوست ملے جن کی صحبت میں بقول میر:

عالم کی سیر میر کی صحبت میں ہوگئی
طالع سے میرے ہاتھ یہ بے دست و پا لگا

منیر حسین نے بھی ملے جلے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ: ''ہم تو دوست ہیں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اگر بکاری اور ھمام ہمیں نہ ملتے تو ہم اس طرح تفصیل کے ساتھ سیاحت نہ کر پاتے۔ اگرچہ ہم نے اُن کے سفری اخراجات برداشت کیے اور پھر ھمام کو اضافی پیسے بھی دیتے رہے۔ لیکن ھمام نے بھی ذاتی دلچسپی سے ہماری ہر طرح سے مدد اور خدمت کی ہے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہمارا سفر پروگرام کے مطابق طے ہوا۔ ہم نے مصر کا چپہ چپہ چھان مارا اور وہ بھی بڑے وقار کے ساتھ۔ اپنی ذاتی گاڑی میں سفر اور اچھے سے اچھے ہوٹل میں کھانے کھاتے رہے۔ اس دوران ہم نہ صرف فراعنہ کی دنیا کو دیکھتے رہے بلکہ ہم کوہ طور تک پہنچے۔ جہاں پہنچنے کی خواہشات بچپن سے دل میں انگڑائیاں لے رہی تھیں۔ اس دوران سرسبز میدان، صحرا، پہاڑ، دریا اور سمندروں کی سیر جی بھر کر کی۔ مصر کی دو ہفتے کی سیاحت کے دوران مجھے یہی محسوس ہوتا رہا کہ میں اپنے وطن پاکستان میں گھوم پھر رہا ہوں۔ اُسی طرح کا ماحول اور اُسی طرح کے لوگ۔ صرف ایک فرق مصر کی مساجد پاکستان کی مساجد سے زیادہ آباد ہیں۔ اور پھر خاص کر جمعہ کے روز ہم جدھر بھی گئے جس ٹیکسی میں بیٹھے اُس میں تلاوت قرآن پاک ہی سنتے رہے۔ جمعہ کو یوں محسوس ہوتا رہا جیسے ملک کے کونے کونے میں اللہ کا نور برس رہا ہے۔

مصر جانے سے پہلے گائیڈ بک اور دوسرے ذرائع سے مجھے جو معلومات ملتی رہی تھیں اُن کی رو سے مصر کی سیاحت ایک خطرناک کام ہے۔ چوریاں، ڈاکے، قتل و غارت لیکن خود مصر آ کر یوں محسوس ہوا جیسے یہ تمام قصے کہانیاں تھیں۔ حقیقت میں مصر اور مصری لوگ ان تمام برائیوں سے پاک ہیں۔ لوگ شائستہ اور معزز ہیں۔''

یعقوب آزاد بولے: ''نظامی صاحب ہم یورپ سمیت متعدد ممالک کی سیاحت کر چکے ہیں۔ لیکن یہ سفروں کا شہنشاہ سفر تھا۔ اس میں سفری سہولیات، کھانے پینے کیلئے وافر

چیزیں، موافق موسم، نفیس اور خوبصورت مصری لوگ۔ اور ہاں مصر کی خوبصورتی کے حوالے سے یاد آیا ہمیں منیر حسین کا خصوصی شکریہ ادا کرنا چاہئے جو اس سفر کے دوران خود تو کئی بار راستے سے بھٹکے لیکن ہمیں صراط مستقیم پر چلائے رکھا۔ میں الرحاب سٹی میں صبح کی سیر کیلئے نکلتا تو منیر حسین کے ڈر سے کبھی کسی خاتون سے بات نہیں کی۔ حالانکہ بہت سی مصری خواتین صبح سیر کو نکلتی تھیں۔ وہ مجھے سعودی شیخ سمجھ کر ہیلو ہیلو بھی کہتی لیکن مجھے منیر حسین کا ڈر تھا کہ ممکن ہے وہ کسی موڑ پر چھپے میری حرکات پر آنکھیں رکھے کھڑے ہوں اور مجھے کسی ''زلیخا'' سے محو گفتگو دیکھ کر پکار اٹھیں:

فقط اُس شیخ سے محبت ہے
وگرنہ ہر شیخ سے خدا کی پناہ

اب اپنے سفر کی یادوں کے دریچے بند کرتا ہوں۔ اگرچہ عملی لحاظ سے تو میں مصر کی سیاحت سے واپس آ گیا ہوں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اس کتاب کے خاتمہ تک میں اُس حیرت انگیز دنیا کے سحر سے باہر نہ نکل سکا۔ اور اب تو یہ یادیں اس کتاب کی شکل میں زندگی کے ساتھ ساتھ ہمیشہ تازہ دم رہیں گئیں۔ مصر کے بعد اب کسی دوسرے ملک کی سیاحت کو جی نہیں چاہتا۔ ڈر ہے کہ جو لطف اٹھایا اور اچھی یادیں ذہن میں محفوظ ہیں وہ کہیں بکھر کر پاش پاش نہ ہو جائیں۔

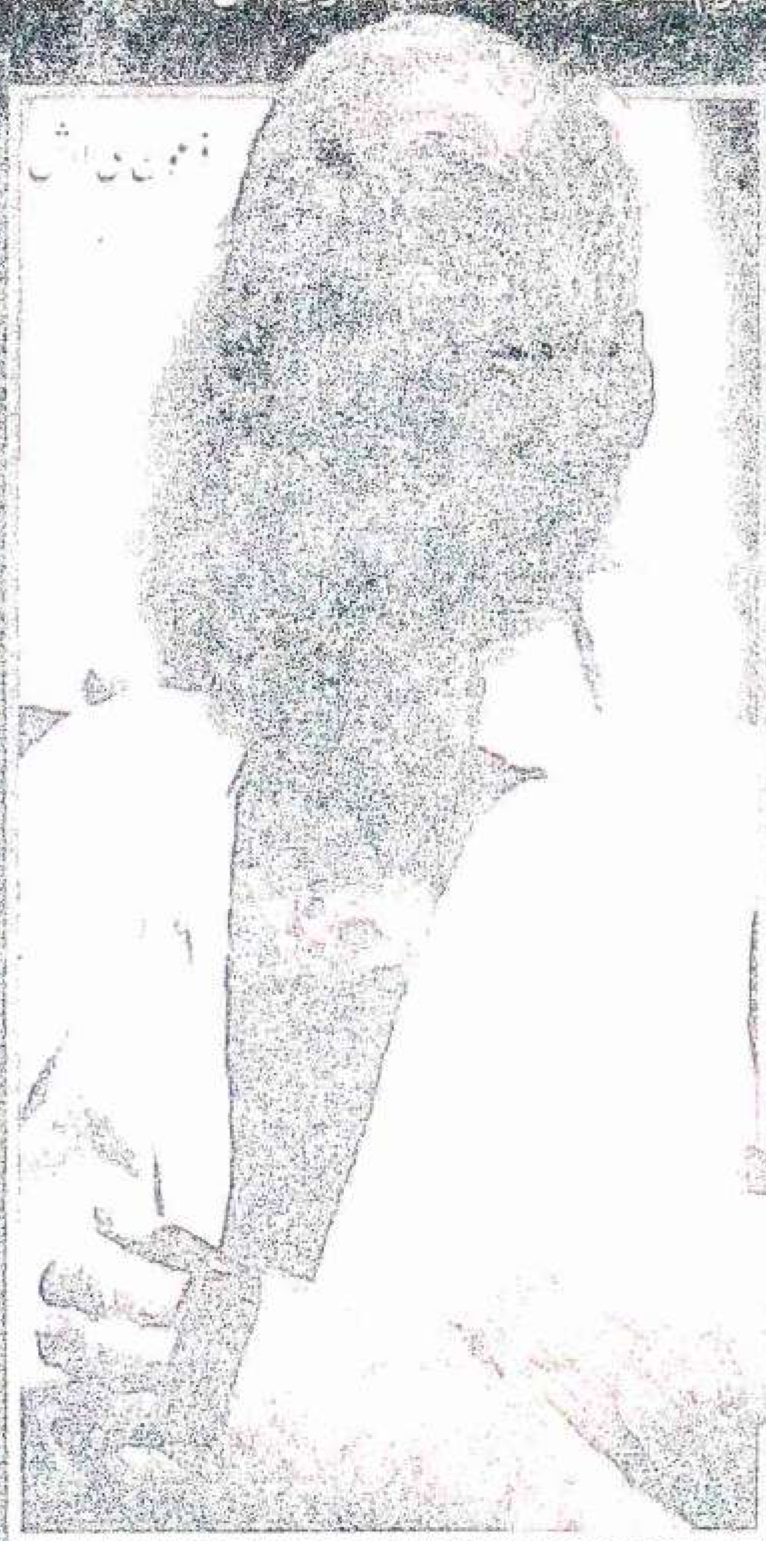
آخر میں ایک بات کا اقرار۔

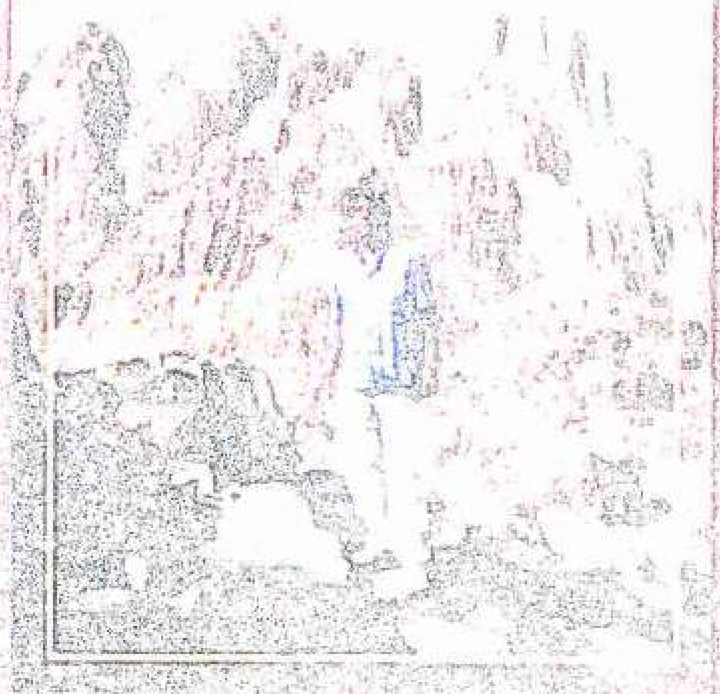
سفر کی یادوں میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جنہیں میں لکھ نہ سکا۔ جس کی وجہ بقول آزاد انصاری یہی ہے کہ:

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

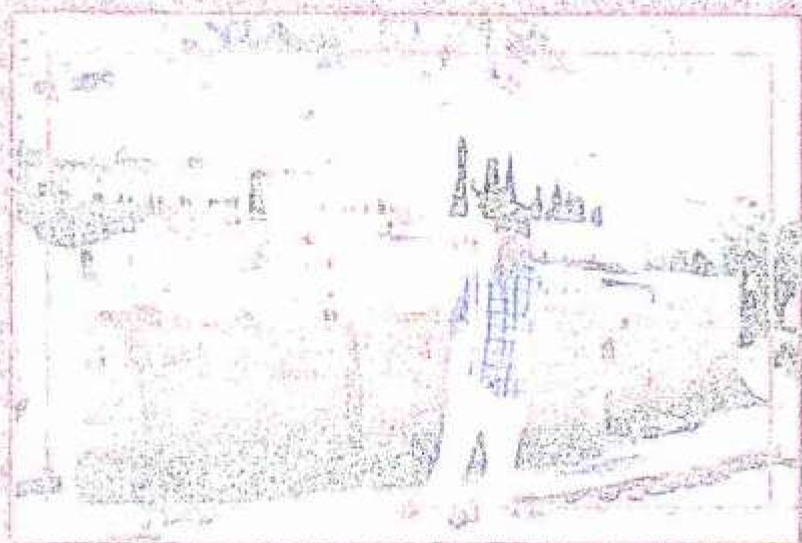


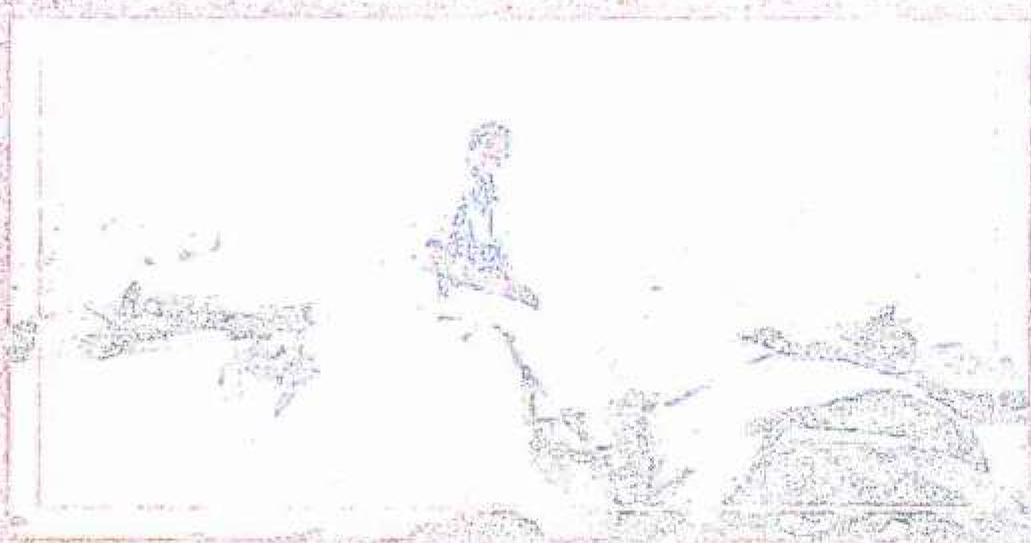
[redacted]













نگارشات پبلشرز

www.nigarshatpublishers.com

E-mail: nigarshat@yahoo.com

